۶۷۵

جامعہ

۲۷۶۷۹

چندہ سالانہ — قیمت فی پرچہ
چھ روپے — پچاس نئے پیسے

جلد (۵۰) | بابت ماہ جنوری ۱۹۶۴ء | شمارہ (۱)

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ "جامعہ"، جامعہ نگر، نئی دہلی

ایک اور ستارہ ٹوٹا ـــــ حامد صاحب کی وفات

عبداللطیف اعظمی

جامعہ کے آسمانِ تعلیم و ادب کا ایک اور ستارہ ٹوٹ گیا یعنی جناب حامد علی خاں صاحب کا ۵ دسمبر کو پیرس میں انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

موصوف جامعہ کے ابتدائی دور کے گریجویٹ اور اس کے حیاتی رکن تھے تعلیم کے بعد شروع سے جامعہ سے وابستہ رہے اور اپنی غیر معمولی صلاحیت، ان تھک محنت اور بے لوث خدمت کے ذریعہ اردو کی تصنیفی اور اشاعتی دنیا میں انقلاب پیدا کیا، مکتبہ جامعہ غالباً اردو کا واحد اشاعتی ادارہ ہے جس نے محض اپنی کتابوں کی آمدنی پر اتنی ترقی کی کہ اردو کے ممتاز ترین اداروں میں سمجھا جانے لگا اور پہلا ادارہ ہے جس نے ہر لحاظ سے ـــــ خواہ کتابوں کی ظاہری شکل و صورت ہو یا زبان، اسلوب بیان اور معیار کا معاملہ ہو ـــــ اردو ادب کو جدید طرز اور نئے انداز سے آشنا کیا اور بچوں کے ادب کو، جس کی طرف نئے تقاضوں کے مطابق بالکل توجہ نہیں کی گئی تھی، قابلِ لحاظ ترقی دی۔ مکتبہ جامعہ کے یہ کارنامے تمام تر رہین منت ہیں جناب حامد علی خاں صاحب کی مساعی اور صلاحیتوں کے۔

حامد صاحب نے ۱۹۲۶ء میں جامعہ کی اعلیٰ تعلیم سے فراغت حاصل کی اور مئی ۱۹۲۷ء میں جامعہ میں کام شروع کیا اور ۱۹۲۸ء میں تاحیات یا کم سے کم بیس سال تک جامعہ کی خدمت کا عہد کیا۔ مکتبہ جامعہ کی ترقی کا سہرا حامد صاحب کے سر ہے۔ آزادیٔ وطن سے قبل جامعہ کے تمام شعبوں میں انتہائی تنگی ترشی سے زندگی گزرتی تھی، مکتبہ کی زندگی بھی نامساعد حالات اور کٹھن مشکلات سے بھری ہوئی تھی مگر حامد صاحب کبھی دل شکستہ نہیں ہوئے اور اپنے ساتھیوں کے سہارے اردو زبان و ادب کی خدمت میں برابر لگے رہے۔

حامد صاحب کی رہنمائی اور نگرانی میں مکتبہ نے اردو کے معیاری ادب میں بھی اور عام پسند کتابوں میں بھی بیش از بیش اضافے کئے اور جب ملک کی کشتی ساحل آزادی سے قریب پہنچی اور ۱۹۳۸ء میں مختلف صوبوں میں قوم پرستوں کی حکومت قائم ہوئی، تو بعض صوبوں نے اسکولوں کے لئے ملکی ضروریات اور قومی مفاد کے پیش نظر نئی ریڈریں تیار کرانے اور ان کو شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس اہم اور ضروری کام کو انجام دینے کے لئے مکتبہ نے اپنی خدمات پیش کیں اور حامد صاحب کے تدبر اور ان کی سوجھ بوجھ کی وجہ سے مکتبہ کو کامیابی اور شہرت نصیب ہوئی۔

۱۹۴۷ء کے فساد میں مکتبہ جامعہ کی چوتھائی صدی کا سرمایہ جب جل کر تباہ و برباد ہو گیا تو حامد صاحب نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، ڈاکٹر عابد حسین صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے مشورے اور مدد سے از سر نو مکتبہ کو قائم کیا تو بعض مصلحتوں کے پیش نظر اس مرتبہ لمیٹڈ کمپنی کی شکل دی گئی۔ حامد صاحب کے لئے یہ تجربہ بالکل نیا تھا مگر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے اس مرحلے سے بھی کامیابی کے ساتھ گزر گئے۔

۱۹۵۷ء میں حامد صاحب کو زیادہ وسیع میدان عمل ملا۔ اب تک انھوں نے صرف اردو زبان و ادب کی خدمت کی تھی اور ان کی جولانگاہ صرف اپنے ملک تک محدود تھا، مگر یونسکو نے ان کو دوسری زبانوں اور دوسرے ملکوں کی خدمت کا بھی موقع دیا۔ پہلی مرتبہ صرف تین سال کے لئے تقرر عمل میں آیا تھا مگر ان کے وسیع تجربے، ان کی غیر معمولی صلاحیت اور ان کے حسن خدمات اور احساس ذمہ داری کی وجہ سے یہ تقرر مستقل کر دیا گیا۔ موصوف نے سات سال کی اس مختصر مدت میں اپنے ملک اور اپنی مادر علمی کے نام کو بڑا روشن کیا، مگر افسوس کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے انھیں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا، جس کی وجہ سے اردو ایک صاحب ذوق اور حوصلہ مند ناشر سے، جامعہ ایک قدیم خیالی رکن سے اور یونسکو ایک مخلص اور آزمودہ کار ہندوستانی ماہر نشر و اشاعت سے محروم ہو گئی۔ حامد صاحب اب ہم میں نہیں ہیں، مگر جامعہ کے در و دیوار پر اور اردو کتابوں کی نشر و اشاعت کے جدید طرز اور گیٹ اپ پر اپنا گہرا اور پائدار نقش چھوڑ گئے ہیں، ان کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائے گی حامد صاحب کا ذکر ضرور آئے گا۔

ہمارے آئین کی روح

ڈاکٹر سید عابد حسین

آئین یا سم ودھان یا کانسٹی ٹیوشن ان بنیادی اصولوں اور ضابطوں کا نام ہے جن کے مطابق کسی ملک پر حکومت کی جاتی ہے۔ جمہوری ملک میں عام طور پر آئین عوام کے چنے ہوئے نمائندے ملکر بناتے ہیں۔ یہی ان کی آزادی اور ان کی جمہوریت کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔

ہماری تحریک آزادی کے سب سے بڑے رہنما گاندھی جی نے ۱۹۲۲ء میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندوستانی عوام کو ایک آئین ساز اسمبلی کے منتخب کرنے کا حق دیا جائے اور اس کا بنایا ہوا آئین برطانوی پارلیمنٹ کی منظوری سے ملک میں نافذ کیا جائے۔ اس وقت تک بہت سے لوگ اسے محض ایک خواب شیریں سمجھتے تھے جسے حقیقت سے کوئی تعلق نہیں مگر ابھی ۲۴ سال ہی گذرے تھے کہ بابائے قوم کا یہ خواب جس میں پوری قوم کی آرزوؤں اور تمناؤں کی حلاوت گھلی ہوئی تھی حقیقت بن گیا اور ۱۹۴۶ء میں برطانوی کیبنٹ مشن کی تجویز کے مطابق ایک آئین ساز اسمبلی منتخب کی گئی کہ ہندوستان کے لئے ایک آزاد جمہوری حکومت کا خاکہ بنا کر برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے منظوری کے لئے پیش کرے۔ لیکن ابھی آئین سازی کا کام اچھی طرح شروع بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہو گیا۔ اب آئین ساز اسمبلی برطانوی پارلیمنٹ کے ماتحت نہیں رہی بلکہ خود ہی اقتدار اعلیٰ کی حامل بن گئی یعنی یہ بات مان لی گئی کہ اپنے ملک میں اسی کا بول بالا ہے۔ جو آئین وہ بنائے گی اس کو کسی باہر کی طاقت سے منظور کرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی ان اختیارات کی رو سے جو ہندوستانی عوام نے اسے عطا کئے ہیں اپنے بنائے ہوئے آئین پر غور کر کے اس کی آخری اور قطعی منظوری دے سکتی ہے۔ ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو آزاد ہندوستان کا آئین باضابطہ طور پر منظور ہو گیا اور

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے ملک میں نافذ ہو گیا۔

جن ملکوں میں سچی جمہوریت کا راج ہے، یعنی کل بالغ شہری آزادی سے اپنی پسند کے نمائندے منتخب کر سکتے ہیں اور یہ نمائندے مل جل کر جیسی اور جتنی سیاسی پارٹیاں چاہیں بنا سکتے ہیں ان سب کے آئین بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ ان سب میں انصاف، آزادی، برادری اور برابری کے بنیادی تصور پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ مگر پھر بھی ان میں کسی نہ کسی حد تک اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ قدرتی بات ہے اس لئے کہ جب یہ بنیادی تصور تفصیل کے ساتھ آئین کی دفعات میں ظاہر کئے گئے تو ہر ملک کو اپنے اپنے مخصوص خیالات اور روایات کا لحاظ رکھنا پڑا اور اس کی وجہ سے ایک ملک اور دوسرے ملک کے آئین میں تھوڑا بہت فرق پیدا ہو گیا۔ ہم پہلے آئین کے اس عام ڈھانچے کا ذکر کریں گے جو ہمارے دیس میں بھی قریب قریب ویسا ہی جیسا اور جمہوری ملکوں میں۔ پھر اپنے آئین کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کریں گے جس نے اس پرانے ڈھانچے میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور اس طرح زمانے کے متضاد رجحانوں میں مصالحت، زندگی کے ان مل سُروں میں میل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہمارے آئین نے بھی ہر جمہوری ملک کے آئین کی طرح اپنے شہریوں کے لئے بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جتنے لوگ اس بھارت دیس میں بستے ہیں چاہے وہ کسی مذہب کسی نسل، کسی خطے کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ قانون کی نظر میں برابر سمجھے جائیں گے ان میں سے کسی کے ساتھ اچھوت کا سا برتاؤ کرنا قابل سزا جرم ہوگا۔ ہر شخص کو آزادی سے اپنے خیالات تحریر اور تقریر کے ذریعہ ظاہر کرنے، اپنی پسند کا پیشہ اختیار کرنے، ملک میں ہر جگہ آنے جانے رہنے سہنے ملنے جلنے کا حق حاصل ہوگا۔ اس کی جان کی اور شخصی آزادی کی حفاظت کی جائے گی۔ کسی کو اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ہر فرد اور ہر جماعت کو پوری آزادی ہوگی کہ اپنے مذہب یا عقیدہ رکھے، اس پر عمل کرے اور اس کی تبلیغ کرے۔ اپنی تہذیب کو قائم رکھے اور فروغ دے، اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے مدرسے کھولے اور ان میں اپنا بنایا ہوا یا اپنی پسند کا نصاب پڑھائے۔

ہر ایک شخص کو اپنی جائز ملک پر قابض رہنے کا حق ہوگا اور اگر کوئی شخص اسے اس سے محروم کرے یا اور کسی طریقے سے اس کی حق تلفی یا اس کے ساتھ بدسلوکی کرے تو وہ قانونی چارہ جوئی کر سکے گا۔

ملک میں اس طرح کا نظم و نسق قائم کرنے کے لیے جس سے امن و امان خوش دلی اور خوش حالی کا دور دورہ ہو اور لوگ اپنے بنیادی حقوق سے فائدہ اٹھا سکیں ہمارے آئین نے حکومت کو تین شعبوں میں بانٹا ہے۔ قانون ساز، انتظامی اور عدالتی اور اس کا خیال رکھا ہے کہ تینوں کے کام میں تال میل رہے۔ آئین نے کہا کہ مرکزی پارلیمنٹ اور ریاستوں کی قانون ساز مجلس میں وہ لوگ منتخب ہو کر آئیں جنھیں اپنے اپنے حلقے میں زیادہ تر لوگوں کا اعتماد حاصل ہو۔ ان ہی لوگوں کی غالب رائے سے قانون بنائے جائیں جو قانون کے مطابق ملک کا انتظام کریں یہ وزیر اُس وقت تک اپنے عہدوں پر رہیں جب تک انھیں قانون ساز مجلسوں کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو۔ جب وہ یہ اعتماد کھو دیں تو انھیں ہٹا کر دوسرے وزیر بنائے جائیں۔ اس طرح انتظامی شعبہ جو عام طور پر گورنمنٹ یا سرکار کہلاتا ہے آئین ساز شعبے یعنی لوگوں کے چنے ہوئے نمائندوں کے ماتحت رکھا گیا ہے اور اسے ان کی مرضی کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔ تیسرے شعبے یعنی عدالت کو ہمارے آئین نے اپنے فرائض کے ادا کرنے کی پوری آزادی دے رکھی ہے۔ وزیروں کو یا قانون ساز مجلسوں کو ان کی کارروائیوں یا فیصلوں میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ عام طور پر عدالتوں کا کام قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دینا ہے اور حق داروں کو ان کا حق دلانا ہے لیکن ریاستوں کے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ دیوانی اور فوجداری کے مقدموں کا اپیل سننے کے علاوہ آئین کی حفاظت کے بھی ذمہ دار ہیں۔ وہ اس کی نگرانی کرتے ہیں کہ متعلقہ حکومت کسی شخص کے حقوق کو جو آئین نے اسے دیئے ہیں پامال نہ کرنے پائیں اور قانون ساز مجلس کوئی ایسا قانون نہ بنانے پائے جو آئین کے خلاف ہو۔ ہندوستان کے سپریم کورٹ کو تو آئین کی حفاظت کے سلسلے میں اتنے اختیارات حاصل ہیں جو دنیا کے کسی ملک میں بڑی سے بڑی عدالت کو نہیں ہیں۔ اس آئین کی تعبیر اور تفسیر کے سلسلے میں اس کا فیصلہ آخری اور قطعی ہے اور وہ ان سب جھگڑوں کو چکاتا ہے جو مرکزی حکومت اور کسی ریاست کے درمیان یا ریاستوں میں آپس میں اختیارات کے

بارے میں ہوتے ہیں۔

غرض ہمارے آئین میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ حکومت کے تینوں شعبے ایک دوسرے کے کام کی تکمیل کریں، اور ان کے اختیارات میں توازن قائم رہے تاکہ ان بدعنوانیوں کی روک تھام ہو سکے جو انسانی فطرت کی کمزوری سے سیاست اور حکومت میں پیدا ہو سکتی ہیں اور ہو جاتی ہیں۔ یہ تو وہ چیزیں ہوئیں جو تھوڑے بہت فرق سے ہر جمہوری ملک کے آئین میں موجود ہیں۔ اب ہم ہندوستان کے آئین کی اس خصوصیت کی طرف آتے ہیں جسے ہم نے اس کی روح کہا ہے۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ جس نے عام انسانیت کو دو مخالف فریقوں میں بانٹ کر دنیا کے امن کو خطرے میں ڈال رکھا ہے یہ ہے کہ جب جمہوریت کے تین بنیادی اصولوں، انصاف، برابری اور آزادی میں ٹکر ہو تو ان میں ہم آہنگی کیسے پیدا کی جائے مغربی ملکوں کی سو سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جن ملکوں میں فرد کی آزادی پر زیادہ توجہ ہوئی ان میں انصاف اور برابری قائم رکھنا خصوصاً معاشی زندگی میں مشکل گیا۔ صنعتی انقلاب کے بعد فرد کی آزادی کے سائے میں سرمایہ داری روک ٹوک دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی اور شروع شروع میں اس نے زیادہ سے زیادہ نفع کی ہوس میں محنت کش طبقے کو خوب دبایا کھسوٹا اور چوسا، اس کے ردعمل کے طور پر کچھ ملکوں میں اشتراکی انقلاب ہوا اور محنت کشوں کے ساتھ انصاف کرنے غریب امیر کے فرق کو مٹانے یا کم کرنے کی دھن میں صنعت اور تجارت کے شعبوں میں فرد کی آزادی کو اس طرح کچلا گیا کہ وہ زندگی کے سبھی شعبوں میں دب کر اور سمٹ کر رہ گئی۔ آزاد ہندوستان کے آئین میں سماجی اور معاشی زندگی کے ایسے نظام کا تصور ہے کہ فرد کی آزادی کی اپج اور حوصلہ مندی قائم رہے لیکن اسے اس کی چھوٹ نہ ہو کہ اپنے فائدے کی خاطر سماج کو نقصان پہنچائے اور اپنے سرمائے کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے لئے محنت کش طبقے کو کم سے کم اجرت اور حقوق دے ہمارا آئین ایسی سماج بنانا چاہتا ہے جس میں دولت طاقت تعلیم تہذیب سمٹ کر چند آدمیوں کے ہاتھ میں نہ چلی جائے بلکہ دیس کی پوری آبادی میں ہر ایک شخص کو اپنی ضرورت اور صلاحیت کے مطابق ان کی زندگی کی ان نعمتوں میں حصہ ملے۔ یہی اس کی خصوصیت ہے اور یہی اس کی روح ہے۔

ہمارے آئین کی سیکولر نوعیت

پروفیسر غلام السیدین

جب ہندوستان نے آزادی حاصل کی تو ایک مشکل حل ہو گئی لیکن بہت سی اور مشکلوں اور مسئلوں کے دروازے کھل گئے۔ آزادی آتی ہے تو وہ ہمیشہ بہت سے کٹھن مسئلے لے کر آتی ہے۔ وہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے بلکہ ایک لحاظ سے کانٹوں کا تاج ہے! ان میں ایک بہت اہم اور مقدم مسئلہ یہ تھا کہ ملک کا آئین یا دستور کس قسم کا بنایا جائے۔ مثلاً وہ جمہوری ہو یا کسی اور نمونے کا؟ آئین میں مرکز کے کیا اختیارات ہوں اور صوبوں یا ریاستوں کے کیا؟ جن اختیارات کی تفصیل صراحت کے ساتھ آئین میں نہ ہو، مرکز کے ماتحت سمجھے جائیں یا صوبوں کے؟ صوبوں کی تقسیم زبان کے اعتبار سے ہو یا دوسرے جغرافیائی اور انتظامی امور کے لحاظ سے؟ قانون ساز جماعتوں کی نوعیت کیا ہو گی اور ان کا انتظامی حکومت سے کیا رشتہ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے علاوہ ایک بنیادی مسئلہ اور تھا جس کو دستور سازی کی پہلی ہی منزل میں طے کرنا تھا یعنی آئین کو مذہبی بنیاد پر بنایا جائے یا سیکولر یعنی غیر مذہبی بنیاد پر۔ دنیا کی تاریخ میں دونوں قسم کے دستور بنائے گئے ہیں اور گو موجودہ زمانے کا عام رجحان سیکولر ہی ہے لیکن ہر ملک کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے حالات ضرورتوں اور تقاضوں کا جائزہ لے کر اس کا فیصلہ کرے۔ آزادی سے پہلے بھی یہ مسئلہ زیر بحث تھا اور ملک کے دور بین حضرات اور مختلف جماعتوں نے اس پر کافی غور کیا تھا اور اپنی رائے ظاہر کی تھی اور جب دستور ساز اسمبلی کے سامنے یہ سوال پیش ہوا تو کثرت رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہمارا آئین جمہوری ہو، غیر مذہبی ہو، اس میں سماجی انصاف کے اصولوں کی کارفرمائی ہو اور اس کا نمایاں رجحان سوشلزم کی طرف ہو۔ یہ تو کہنا غلط ہو گا کہ سب لوگوں نے بہ رضا و رغبت ان اصولوں کو قبول کر لیا یا وہ سب جان کے موافق تھے انھوں نے ان کو

پوری طرح سمجھا بھی لیکن یہ کہنا ٹھیک ہے کہ ہمارے بہترین سیاسی مفکر اور مدبر اور عوام بھی جہاں وہ سمجھ سکتے تھے ایک ایسا آئین چاہتے تھے جس میں ذات پات، نسل، رنگ، مذہب، دولت کے اعتبار سے کوئی لگاؤ اور بیر، مزہ بھید بھاؤ نہ ہو۔ اور ہندوستان کے سب باشندوں کو امن اور آزادی کے ساتھ دیس کے ترنگے جھنڈے کے نیچے ایک شریف اور معقول زندگی بسر کرنے اور ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہوں۔ اور اس کی جو مخالفت تھی وہ زیادہ تر مفاد مخصوص کی طرف سے تھی یعنی بعض ایسی جماعتوں اور گروہوں کی طرف سے جو چاہتے تھے کہ نئے دور میں بھی اپنے مخصوص اور ناجائز حقوق اور رعایتوں کو برقرار رکھیں اور ان میں دوسروں کو شریک نہ کریں بلکہ ہو سکے تو نئے آئین کی تشکیل اس طرح کریں کہ اس کے اندر وہ اپنے لئے خاص مراعات حاصل کر سکیں۔ خود غرضی اور سماجی فلاح، بے انصافی اور انصاف پسندی بے جا امتیاز اور مساوات کی یہ جنگ مدتوں سے جاری ہے اور جاری رہے گی لیکن یہ بات کسی قدر اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے آئین نے بحیثیت مجموعی انصاف اور مساوات کا ساتھ دیا ہے اور ان کا علم بلند رکھا ہے۔ یہ پوری جیت نہیں۔ کیونکہ افراد اور جماعتوں کا عمل اور روزمرہ کی زندگی آئین اور دستور کو حرفِ غلط بنا سکتی ہے لیکن جیت کی پہلی منزل ضرور ہے۔

اس وقت مجھے اس آئین کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرنا نہیں ہے۔ صرف ایک پہلو کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں اور وہ ہے اس کی سیکولر نوعیت یعنی اس اصول کا احترام کہ اس میں کسی خاص گروہ یا فرقے کو مذہب کی بنا پر کوئی ترجیح یا فوقیت یا مخصوص حقوق حاصل نہ ہوں گے سوائے ان کے جو آئین کی رو سے ہر شہری کو مساوی طور پر حاصل ہوں۔ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو آزادی حاصل ہو گی کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں، اپنے طریقے سے عبادت اور پوجا پاٹ کریں، اپنے خیالات دوسرے کے سامنے معقولیت اور رواداری کے ساتھ پیش کریں بشرطیکہ اس حق کے استعمال سے دوسروں کی کوئی واقعی دل آزاری نہ ہو اور ان کی آزادی پر چھاپا نہ مارا جائے۔ اس نکتے کی پوری طرح وضاحت کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس لفظ سیکولر یا غیر مذہبی سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں بلکہ ہوتی ہیں اور اس کے حامیوں اور مخالفوں نے بعض دفعہ اس کی غلط تعبیر کی ہے اور

نظریے کے طور پر اس کے موافق اور مخالف جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں وہ بھی غلط ہیں۔ آیئے ان میں سے ایک دو پر نظر ڈالیں، تفریحاً یا ایک دماغی مشغلہ کے طور پر نہیں بلکہ اس لئے کہ اگر ہم نے اپنے آئین کے اس بنیادی ستون کی اہمیت کو نہیں پہچانا اور اسے مستحکم نہیں کیا تو ہماری قومی زندگی کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔ بعض لوگ غیر مذہبی آئین کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک بے دین یا خلاف مذہب آئین ہے جو مذہب یا مذہبی تعلیم یا مذہبی تقاضوں کو ملک میں جگہ دینے کے لئے تیار نہیں، یہ ایک فاش غلطی ہے۔ علاوہ اور وجہوں کے یہ کیسے ممکن تھا کہ ہمارے دیس کا آئین، جس کے نمایاں معماروں میں ایسے مذہبی لوگ شامل تھے جیسے مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن، مذہب کے خلاف ہو۔ ان لوگوں کے اندر تو مذہب کی روح رچی ہوئی تھی۔ ان کا عقیدہ تو قرآن شریف کے الفاظ میں گویا یہ تھا کہ ہمارا مرنا اور جینا، ہماری عبادت اور پوجا پاٹ سب اس ایشور یا اللہ کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا بنانے والا ہے۔ وہ دل سے ایک بات کو مانتے تھے کہ ایک اچھی زندگی اور ایک نیک انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ مذہب کی سچی روح اور ان قدروں سے وابستگی پیدا کرے جو اس نے دنیا کو سکھائی ہیں۔ ٹیگور کی وشو بھارتی یونیورسٹی کا ایکٹ پارلیمنٹ میں پیش تھا اس کی ایک ایک دفعہ پر قانونی نقطۂ نظر سے یہ اعتراض کیا گیا کہ اس میں ایشور کا لفظ نہیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس موقع کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا آزاد نے اپنی ایک تقریر میں زور دے کر کہا تھا کہ ممکن ہے قانون کی مدوں میں ایشور کا نام آئے لیکن مجھے اس بات میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ اس یونیورسٹی کی زندگی میں اس کا ایک مقام ہے اور بہت بلند مقام ہے میں پورے زور اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ گرودیو نے جس طرح اس یونیورسٹی کے مقاصد کی تعریف کی ہے جس میں یہ جملہ بھی شامل ہے، وہ ہمیشہ اس یونیورسٹی کے طلباء اور استادوں کے لئے شمعِ ہدایت ثابت ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ گرودیو نے شانتم، شِوَم، ادوائیتم کی جو تین اصطلاحیں استعمال کی ہیں ان میں خدا کا ایک ایسا تصور مضمر ہے جو نسل مذہب اور عقیدے کی تنگ بندشوں سے بلند ہے، لہٰذا ایک غیر مذہبی ریاست کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا کہ اس میں مذہب کی کوئی جگہ نہیں۔ پھر اس کا کیا مقصد ہے؟

مثلاً اس کا مقصد یہ ہے کہ کسی جماعت یا گروہ کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہ رکھا جائے نہ بیجا بندشیں اور پابندیاں ہوں، نہ بیجا مراعات اور پاسداری۔ اس بات کے لئے ہندوستان کے آئین ساز تیار نہ تھے۔ اگر ہندوستان کا آئین مذہبی بنیاد پر بنایا جاتا تو اس ملک میں ہندو راج قائم ہو جانا چاہئے تھا کیونکہ یہاں انھیں کی بڑی اکثریت ہے، لیکن اس قسم کے آئین میں ایک بڑا اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں دوسرے مذہبوں کے لوگ ایک طرح سے دوسرے یا تیسرے درجے کے شہری ہو کر رہ جاتیں لیکن ملک کی رواداری کی قدیم روایت اور جمہوریت کے نئے تقاضوں نے اس خیال کا سواگت نہیں کیا۔ گاندھی جی جب ہندوستان میں 'رام راج' کا خواب دیکھتے یا اس کا پرچار کرتے تھے تو وہ کسی خاص مذہبی جماعت یا مذہبی تصور کا راج نہ تھا بلکہ ملک میں انصاف و شرافت کا راج تھا۔ لہٰذا ایک لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ایسے ملک میں جہاں کئی مذہبوں کے ماننے والے ساتھ ساتھ رہتے ہوں اور ان کے ساتھ یکساں سلوک کرنا لازم ہو، ایک غیر مذہبی ریاست کا تصور بھی سچی مذہبیت کا اظہار ہے! مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن شریف میں لکھا ہے کہ اگر تم کسی قوم سے دشمنی کے سبب بھی بے انصافی کرو گے تو تم خدا کی نگاہ میں مجرم ہو۔ لہٰذا دشمن کے ساتھ بھی انصاف کرو۔ جب ایک سیاسی دشمن کے ساتھ بھی بے انصافی کرنا گناہ ہے جس سے ممکن ہے تمہاری جنگ ہو رہی ہو۔ تو یہ کیسے مناسب ہو سکتا ہے کہ ایک ہی قوم کے بعض افراد کے ساتھ جن کا اٹھنا بیٹھنا، جینا مرنا سب مشترک ہے، انصاف اور مساوات کا سلوک کیا جائے اور جمہوری سوسائٹی کے دستور کی بنیاد کسی مذہبی تصور پر رکھی جائے۔

آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ایکتا کی بڑی ضرورت ہے اور میں جانتا ہوں کہ میں نے یہ کوئی نئی بات نہیں کہی۔ نئی نہ سہی لیکن یہ بات کہنے کی ہے، اس وقت تک جب اس کا دہرانا غیر ضروری ہو جائے۔ اس ایکتا میں سچائی اور مضبوطی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس میں لوگوں کے جائز اختلافات کے لئے گنجائش ہو اور رواداری کی فضا میں ان کا احترام کیا جائے، جب مختلف رنگ، نسل اور مذہب کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ امن و آشتی اور محبت کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس سماج کے لئے ایک غیر مذہبی ریاست کا تصور ایک بہتری کا کام دے سکتا ہے بشرطیکہ سب اسے خلوص کے ساتھ قبول کریں اور اس کی پابندی کریں اور اس ذہنیت کو اجاگر کرنے کے لئے ایک سچا سیکولر نظام مفید ہو سکتا ہے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

چند منتخب شعر

حضرت روش صدیقی

(حضرت روش صدیقی پروفیسر محمد مجیب صاحب سے ملنے جامعہ تشریف لائے تھے جہاں روش صاحب موجود ہوں وہاں یہ ناممکن ہے کہ شعروشاعری کی محفل گرم نہ ہو۔ موصوف نے مختلف غزلوں کے متفرق شعر سنائے، چند شعر جامعہ کے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش ہیں)

دردِ دل اگر نہ کھلتا تو سکون کہیں نہ ملتا
کوئی ہم زباں نہ ہوتا کوئی ہم نشیں نہ ملتا
تو حرم میں اس کا دامن جو نہ بڑھ کے تھام لیتا
تو روشؔ وہ شوخ تنہا تجھے پھر کہیں نہ ملتا

ہنس بول لیا کوئی تو ہیں بندۂ بے دام
آزاد ہیں ہم لوگ گرفتار ہیں ہم لوگ
اس انجمن ناز میں کیا کام ہمارا
تہمت زدۂ شوخی گفتار ہیں ہم لوگ
ہے چیں بہ جبیں وقت کہ ہم کوہ گراں ہیں
سمجھا تھا کہ گرتی ہوئی دیوار ہیں ہم لوگ

غزل

حضرت تسکین قریشی

جب تری رہگذر سے گذرے ہیں
ہم تو کچھ بے خبر سے گذرے ہیں

کیا یونہی مل گیا ہے منصب عشق؟
اُن کی اِک اِک نظر سے گذرے ہیں

مے چھٹی اور میکدہ نہ چھُٹا،
جب بھی گذرے اُدھر سے گذرے ہیں

کتنے چہروں سے اُٹھ گئی ہے نقاب
ہم جنوں میں جدھر سے گذرے ہیں

خود انھیں بھی خبر نہیں جن کی
وہ بھی جلوے نظر سے گذرے ہیں

ٹھوکریں کھائی ہیں وہیں تسکین
ہم سنبھل کر جدھر سے گذرے ہیں

۱۸۵۷ء کے قبل کی چند مطبوعہ منظوم داستانیں

کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر میں

جناب نصیر الدین ہاشمی

کتب خانہ سالار جنگ نوادرات کا ایک خزانہ ہے جہاں نہ صرف قلمی بلکہ مطبوعہ کتابیں بھی نایاب اور کمیاب موجود ہیں منظوم قلمی داستانوں سے قطع نظر مطبوعہ منظوم داستانوں کی تعداد ۱۶۹ ہے۔ ان میں سے انیس[۱۹] داستانوں کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے[۱]

(۱) قصۂ بادشاہ روم:۔ اس کے مصنف کا نہ کوئی نام درج ہے اور نہ مثنوی میں شاعر نے اپنا تخلص ظاہر کیا ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد) میں جو قلمی داستانیں ہیں ان میں کوئی قلمی داستان اس مضمون کی نہیں ہے۔ ایک قلمی داستان اس نام کی ضرور ملتی ہے مگر اس کا قصہ بالکل جداگانہ ہے اس لئے یہ مطبوعہ داستان خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس داستان کی تصنیف کس سنہ میں ہوئی اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ البتہ یہ داستان سنہ ۱۲۷۱ھ (سنہ ۱۸۵۵ء) میں مطبع حیدری میں نور الدین بن جیوا خاں کی کمپنی نے بمبئی میں طبع کیا ہے۔ مثنوی میں اولاً بیس اشعار ہیں۔ حمد و نعت ہے اور داستان ۳۲۸ شعر کی ہے۔ مثنوی کے آغاز اور داستان کے آغاز کے اشعار حسب ذیل ہیں:۔

ہو کس سے حمد یا رو اس خدا کی — کہ جس نے عرش اور کرسی بنا کی
کیا ہے کو یوں قدرت سے قایم — رکھا ہے بے ستون افلاک دائم

---

[۱] میرا ایک مضمون بمبئی کے ہفتہ وار اخبار "دور حیات" مورخہ ۲۰ اگست ۶۲ء میں شائع ہو چکا ہے، جس میں ۱۸۵۷ء کی مطبوعہ نثری داستانوں سے بحث کی گئی ہے۔ (ہاشمی)

خودی کے کام سے بندو ڈرو تم یہ شاہ روم کا قصہ سنو تم
عجب اس شاہ کا یہ تذکرہ ہے خودی سے اپنے کیا کیا دکھ سہا ہے
اسے سن کر جو ہووے مرد عاقل خدا کے خوف سے ہووے نہ غافل

اگر داستان کا خلاصہ بھی پیش کیا جائے تو مضمون طویل سے طویل تر ہو جائے گا اس لئے صرف لب لباب درج ہے۔

ملک روم کا ایک بادشاہ تھا اس نے قرآن خوانی میں جب یہ آیت پڑھی کہ خدا جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک وسواس پیدا ہو گیا اور اپنی خودی پر غرور و تکبر کرنے لگا۔ خدا نے اس کو زندگی میں ہی ایک سبق دینا چاہا، چنانچہ اس کو شکار کے موقع پر اپنے لشکر اور متعلقین سے علیحدہ کر کے چین کے ملک میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں اس کی زندگی کے بارہ سال گزرے۔ اس عرصہ میں غلطی سے چوری کے الزام میں ہاتھ کاٹے گئے پھر شہزادی چین کو تعلیم دیتا رہا۔ قدرت نے ہاتھ جوڑ دئے اور اس کے بعد اسی شہزادی سے شادی ہوئی۔ بارہ سال کے بعد پھر خدا نے اس کو اپنے ملک میں پہنچا دیا اور یہاں صرف چند گھنٹے ہوئے تھے اور شاہی لشکر بادشاہ کے انتظار میں بدستور موجود تھا۔ شاہ روم اپنے غرور و تکبر کے بعد نادم ہوا خدائی کرشمہ دیکھ کر حیران ہو کر توبہ کی۔

قصہ ختم ہونے کے بعد تکبر اور غرور کی مذمت میں چند شعر لکھے گئے ہیں۔

خودی سے جو کوئی بھولا خدا کو وہ پہنچا پا گیا اپنی سزا کو
خودی سے نوح کا طوفان آیا خدا نے جس کی امت کو ڈبویا
کہاں رہزن کہاں اس شاہ کی ذات دکھایا حق نے قدرت کا طلسمات
کسی سے حال آدم اپنا مت کہہ خدا کی یاد میں مشغول ہو رہ

غرض اس مثنوی / قصہ میں اخلاقی سبق دیا گیا ہے۔

(۲) ہشت گلزار:- اس مثنوی (داستان) کے مصنف شاہ حسن المتخلص بہ حقیقت ہیں۔[۱]

اس داستان میں بہرام گور کی داستان کو نظم کیا گیا ہے۔ اس داستان کو ۱۲۹۷ھ (۱۸۵۰ء) میں محمد مصطفیٰ خاں فرزند حاجی محمد روشن خاں نے لکھنؤ میں طبع کیا ہے۔ کسی شاعر اشرف نے طباعت کی حسب ذیل تاریخ بھی نکالی ہے:

کیا چھپی مثنوی حقیقت کی　　کھل گیا جس سے لالہ زار طبع
لکھا اشرف نے مصرع تاریخ　　ہشت گلزار ہے بہار طبع

اس مثنوی میں حمد، نعت، مناجات وغیرہ کے بعد عبدالقادر خاں بہادر ثابت جنگ ابن نواب والا جاہ مرحوم رئیس ارکاٹ کی مدح بھی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ "حقیقت" نے اس مثنوی کو اپنے تا کہ قیام ارکاٹ میں تصنیف کیا تھا۔ اس کے بعد یہ مثنوی لکھنؤ میں طبع ہوئی۔

میں نے "مدراس میں اردو" میں اس مثنوی ہشت گلزار کا تذکرہ کیا ہے اور اس کو محمود بلگرامی کی تصنیف قرار دی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ "حقیقت" شاہ محمود کے نام سے ہی ملقب ہو۔ دونوں مثنویوں کے اشعار دیکھنے سے واضح ہوتا ہے ایک ہی مثنوی ہے۔ چونکہ اس وقت محمود بلگرامی کی قلمی مثنوی دسترس سے باہر ہے اس لئے اس کے متعلق مزید صراحت سر دست نہیں کی جا سکتی۔

مثنوی (داستان) کا آغاز حمد سے ہے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

اے فرازندۂ لوائے وجود　　پختگی بخش خامی زرجود
روز و شب سروران با تمکین　　بلکہ سب بادشاہ روئے زمین
جبہ سائیدہ یاں ہیں شام و سحر　　لاکھ دارا ہزار اسکندر
دے تو شاہی کا جس کو چاہے سریر　　چاہے جب شاہوں کو بنا دے فقیر
یاں جو گردن کشی کرے اور زور　　شکل بہرام گور جائے بہ گور

عبدالقادر خان ثابت جنگ کی مدح کے چند شعر پیش ہیں:-

ہے یہاں ایک وہ امیر کبیر　　جس کے محتاج ہیں جہاں کے امیر
جود و ہمت میں اور سخاوت میں　　زور و قوت میں اور شجاعت میں

صاحب جود و ہمت و بخشش — والی ملک و نعمت و بخشش

طویل مدح ہے مدح کے بعد ہی داستان شروع کر دی گئی ہے۔ دو شعر یہ ہیں۔

کیا بیان کیجیے اس کی شان و شکوہ — شاہوں کا جس کے در پہ ہوا نبوہ

نام بہرام گور تھا اس کا — کیا کہوں کیسا زور تھا اوس کا

یہ مثنوی (۱۳ × ۸ ½) سائز کے ۱۰۸ صفحے پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں دو کالم ہیں اس طرح ۴۵ شعر ہر صفحہ پر لکھے گئے ہیں یعنی پانچ ہزار شعر سے زیادہ کی مثنوی ہے۔ داستان با تصویر ہے ۲۰ تصاویر ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ کتاب میں تصاویر کو طبع کرنا کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

(۳) **تحفہ جعفر**:۔ یہ مثنوی سنہ ۱۲۶۱ھ (سنہ ۱۸۴۶ء) میں لکھنؤ میں طبع ہوئی ہے۔ سائز (۱۲ × ۶) ہے اور ۱۰۴ صفحے پر مشتمل ہے۔ دراصل یہ ایک داستان نہیں بلکہ چند قصوں کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے اور اس میں گناہوں کے متعلق عذاب الٰہی کی صراحت ہے۔

قصوں کے طرز پر چند حکایتیں منظوم کی گئی ہیں۔ مثنوی میں اولاً حمد و نعت ہے اس کے بعد چودہ آئمہ معصومین کا ذکر ہے، پھر حضرت علی کا ایک معجزہ مردہ کو زندہ کرنے کا لکھا گیا ہے اس کے بعد چند دوسری حکایتیں ہیں۔ آغاز یوں ہے:۔

دلا کر تو حمد خدائے ودود — کہ ہے جسم و جاں کا اسی سے وجود

وہی کل عالم کا معبود ہے — وہی جن و انساں کا مسجود ہے

اس مثنوی کے مصنف مرزا حسن علی المتخلص بہ جعفر ہیں اور مرزا جعفر علی نے اپنے مطبع حیدری میں طبع کرایا ہے، چنانچہ اختتام کی عبارت حسب ذیل ہے۔

" ایں مثنوی مسمّی بہ تحفہ جعفر من تصنیف والا جناب تقدس مآب مرزا حسن علی صاحب دام ظلہٗ المتخلص بہ جعفر در سنہ ۱۲۶۲ھ مرزا جعفر علی صاحب دار الطبع حیدری ارسطو زمان جالینوس دوراں حکیم سید محمد الزماں صاحب نے رکاب گنج جدید طبع کیا۔

(۴) **یوسف زلیخا**:۔ اس داستان کے دو مطبوعہ نسخے اس کتب خانہ میں ہیں ایک نسخہ ۱۲۴۷

کا مطبوعہ ہے اور دوسرا نسخہ سنہ ۱۲۷۲ھ کا مطبوعہ ہے۔ دونوں نسخے بمبئی میں طبع ہوئے ہیں اول الذکر کی طباعت کا تذکرہ اس طرح ہوا ہے۔

"حقیر فقیر علی بھائی بن لقمان جی کی کمپنی نے اپنے مطبع حیدری میں سنہ ۱۲۶۴ھ میں چھپایا۔"

دوسرے نسخہ میں طباعت کے متعلق جو صراحت ہے وہ حسب ذیل ہے۔

"شہر بمبئی میں حقیر نور الدین بن جیوا خاں نے بشراکت قاضی ابراہیم کے اپنے مطبع حیدری میں چھپایا سنہ ۱۲۷۲ھ مقدس۔"

یوسف زلیخا کی یہ داستان کسی شاعر نگاری کی مصنفہ ہے خاتمہ پر تخلص کی جو صراحت ہوئی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

نگار اب خامشی ہے تجھکو بہتر — بھلا ہے اب یہ قصہ مختصر کر
گئی آنکھوں سے نیند اب ناگہانی — زباں کر بند بس کر یہ کہانی

مثنوی کے آغاز کے اشعار یہ ہیں۔

الٰہی عشق سے اپنے تو کر شاد — مرا دل کر تو اپنا عشق آباد
عناصر کی یہ میری ہے جو ہستی — بسا تو عشق کی اس بیچ بستی
نکال اب راہ اس میں جیا کے دل سے — بنا دو کان دو راس آب و گل سے

داستان کے خاتمے پر تاریخ تصنیف اور تعداد ابیات کی صراحت خود مصنف نے ظاہر کر دی ہے۔

خطا میراث ہر انسان کا ہے — جو اہلِ دل ہیں ان کے بھی خطا ہے
ہزار اور دو سو اور دس اور تھے دو — کیا انجام جب یہ داستان کو
گنے ابیات جو ہیں اس کے اک بار — ہوئے تب تین ہزار اور بست اشعار
لکھا تھا عشق سے جو اس کو خامہ — رکھا تب نام اس کا عشق نامہ

ان اشعار سے واضح ہے کہ مثنوی کا نام عشق نامہ ہے اور اس کی تصنیف سنہ ۱۲۱۳ھ میں ہوئی۔ اور اشعار کی تعداد (۳۰۲۰) ہے۔

یوسف علیہ السلام کا قصہ ایک مشہور قصہ ہے اس لئے کسی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ بمبئی میں دو مرتبہ اس کی طباعت ہونے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گزشتہ صدی میں اس داستان کی خاص مانگ تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ نگار نے اس کو فارسی سے ترجمہ کیا ہے یا خود ان کی اپنی مثنوی ہے۔ اس مثنوی کا املا خاص طرز کا ہے۔ مثلاً خاموشی کو "خامشی" لکھا گیا ہے۔

(۵) **مثنوی گلزار نسیم** :- پنڈت دیا شنکر شاگرد خواجہ حیدر علی آتش کی یہ مثنوی ہے۔ اس کتب خانہ میں سنہ ۱۲۶۰ھ کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے اس میں تاریخ طباعت کے بھی دو قطعہ شامل ہیں۔ ایک قطعہ خود مصنف کا طبع زاد ہے اس کے دو آخری شعر یہ ہیں۔

چوں زیور طبع نیک پوشید   بر تاریخ طبع کوشید
گلزار نسیم شد چو مسموع   گل گفت کہ تازہ گشت مطبوع
۱۲۶۰ھ

دوسرا قطعہ تاریخ مولوی کرامت علی المتخلص اطہر کا ہے جو حسب ذیل ہے۔

بہر فشا قان حسن ایں قصہ را فرمود طبع   ہشت چوں از لبسکہ با خلق عمیم آراستہ
طرز طبعش دید اطہر بہر تاریخش نوشت   باکمال طبع گلزار نسیم آراستہ
۱۲۶۰ھ

آخری صفحہ ۸۰ پر یہ قطعات درج ہیں اس کے بعد فارسی میں طباعت کے متعلق وضاحت کی گئی ہے، جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیا شنکر آتش کے شاگرد تھے۔ میر حسن کے مطبع حسینی جو محمود نگر متصل اکبری دروازہ لکھنؤ میں تھا۔ یہ مثنوی طبع ہوئی۔ اور مزید یہ کہ مثنوی گلزار نسیم دراصل نثری قصے "قصہ تاج الملوک دبکاولی" کا منظوم قالب ہے یعنی یہ داستان نسیم کی طبع زاد نہیں بلکہ نثری داستان بکاولی کو انھوں نے صرف نظم کا جامہ پہنا دیا ہے۔

(۶) **مثنوی گل وصنوبر** :- اس کے بھی دو نسخے اس کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ مطبع مصطفائی بمبئی سنہ ۱۲۶۱ھ میں طبع ہوا ہے۔ چنانچہ خاتمہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے:

"تمام شد مثنوی گل شہزادہ وصنوبر پری بتاریخ پانزدہم شہر رجب سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں در مطبع مصطفائی واقع محلہ محمود نگر بیت السلطنت لکھنؤ باہتمام محمد مصطفےٰ خاں ابن حاجی محمد روشن خاں مرحوم بہ طبع رسید۔"

مصنف نے اپنا تخلص درج نہیں کیا۔ آغاز میں حمد و نعت کے بعد بادشاہ کی مدح ہے لیکن بادشاہ کا نام نہیں ہے چونکہ اس زمانہ میں لکھنؤ کی مسند حکومت پر امجد علی شاہ جلوہ گر تھے۔ بادشاہ کی مدح کا عنوان حسب ذیل ہے۔

در مدح حضرت سلطان زمان خلد اللہ ملکہ

اس کے چار شعر ہیں۔ اس کے بعد مدح صاحب عالم کیوان جاہ کا عنوان ہے۔ اس کے سات شعر ہیں اس کے بعد ہی اصل داستان شروع ہوتی ہے۔

گل وصنوبر کا دوسرا نسخہ بمبئی کے مطبع محمدی میں سنہ ۱۲۶۸ھ سنہ ۱۸۵۲ء میں طبع ہوا ہے۔ چنانچہ خاتمہ میں حسب ذیل صراحت ہے۔

"تمام شد مثنوی گل شہزادی وصنوبر پری بتاریخ بست و ہفتم شہر ربیع الاول ۱۲۶۸ھ مقدسہ معلی در معمورہ بمبئی باہتمام محمد حسین صاحب بن منشی محمد سلیم صاحب در مطبع محمدی حلیہ انطباع پوشید۔"

آغاز

الٰہی مجھے کردے رنگیں رقم کہ گل ریز معنی ہو شاخ قلم
کروں حمد کی بوستاں پر نثار گلستان حکومت کی تازہ بہار

مثنوی میں حمد و نعت منقبت حضرت علی کے بعد صاحب عالم کیوان جاہ مرزا محمد حسن خاں بہادر کی مدح ہے اور اس کے بعد اصل داستان شروع ہوتی ہے۔

مثنوی کا اختتام

ہوئے شادماں واں کے سب مرد و زن لگے کہنے کہ تاباں ہوا پھر سہیل یمن

سگے بیٹھنے پھر وصل کی مِل کے مُل — بجام طرب با صنوبر اور گل
لگا رہنے شہر میں سب کا سبب — بہ عیش و عشرت نیاز و طرب
لکھو اب دعائے شہ داد و دین — کہ سرگرم آمیں سے روح الامین
الٰہی رہے جب تلک یہ جہان — سلامت رہے شاہ کشورستان
بر آویں سبھی شاہ کے مدعا — طفیل علی یا مجیب الدعا

داستان کا آغاز

ہوئی نغمہ زن عندلیب قلم — کروں داستان ایک رنگین رقم
یمن میں تھا اک شاہ عالی مقام — فریدوں حشم شاہ رعنا بنام
عجب نوجوان اس کے تھا اک پسر — سہی قد پری چہرہ رشک قمر

مثنوی ۱۸ صفحے کی ہے متن میں پندرہ شعر اور حاشیہ پر ۱۴ شعر درج ہیں۔ اس طرح تقریباً (۵۰۰) شعر کی مثنوی ہے۔ مثنوی میں شہزادہ گل اور صنوبر پری کی داستان عشق منظوم کی گئی ہے۔ بہت سی مصیبتوں کے بعد شہزادہ گل اپنی مراد کو پہنچتا ہے اور صنوبر سے شادی ہوتی ہے۔

(۷) بہار دانش :۔ یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ پیش نظر نسخے کے اختتام پر جو عبارت درج ہے چونکہ اس سے کئی باتیں واضح ہوتی ہیں اس لئے اس کو نقل کیا جاتا ہے۔

"پوشیدہ نہ رہے کہ قصہ دل چسپ جہاندار شاہ اور بہرور بانو کا منشی عنایت اللہ نے اگلے زمانے میں الفاظ شیریں اور عبارت رنگیں سے زبان فارسی میں تصنیف کر کے بہار دانش نام رکھا۔ اکثر آدمی ہر دیار کے سبب فارسی کے نہ سمجھنے ہیں اس قصے کے محروم رہتے تھے۔ اس واسطے افصح الفصحا ابلغ البلغا مرزا جان طپش مرحوم نے بموجب فرمائش صاحبان کونسل وغیرہ کے سنہ بارہ سو سترہ ہجری (۱۲۱۷ھ) میں خاص و عام کے سمجھنے کے لئے زبان اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ مگر باعث عدم

چھاپا ہونے کے سبب شوق مند فائدے سے اس قصے کے محروم رہتے تھے عالی مرزا شیر علی بنگالی اور محمد فیض اللہ نے اس کتاب کو بہت سعی و کوشش سے بہم پہنچا صحیح کر کے محمدی چھاپ خانے میں ٹیپ کے چھاپے سے سن بارہ سے پچپن ۱۲۵۵ سنہ ہجری میں چھپایا تاکہ ہر چھوٹے بڑے اس قصے سے واقف ہو کر خاکساروں کو دعائے دلی سے یاد کریں۔ ثانیاً بہ سبب نایاب ہونے اس قصے دل چسپ کے معمورہ بمبئی میں چھپا تھا اور اب دوبارہ حسب الخواہش سا تھیوں کے بسترا کت محمد حسین صاحب منشی محمد سلیم صاحب کے مطبع محمدی میں سنہ ۱۲۶۸ ہجری میں زیور طبع کا پہنا۔"

اس اقتباس سے واضح ہے کہ فارسی میں عنایت اللہ نے اس کی تصنیف کی تھی اور اردو میں مرزا جان طپش نے ترجمہ کیا اور پہلی مرتبہ سنہ ۱۲۵۵ ھ اور دوسری مرتبہ سنہ ۱۲۶۸ ھ یہ کتاب بمبئی میں طبع ہوئی ہے۔ مثنوی (۱۴۹) صفحات پر مشتمل ہے ہر صفحہ کے متن میں (۱۵) شعر اور حاشیہ میں (۱۴) شعر ہیں (۶۶) عنوان قائم کیے گئے ہیں۔ آخر پر عنوان کی فہرست بھی درج ہے۔

حمد و نعت منقبت حضرت علی کے بعد سبب تالیف کتاب اور اس کے بعد تعریف عہد صاحبان عالی شان کا عنوان ہے اور پھر گورنر جنرل کی تعریف' اس کے بعد صاحبان کونسل و صدر مارنگٹن صاحب کی تعریف کے بعد داستان شروع ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں گورنر جنرل لارڈ منٹو تھے۔ شروع کے چند شعر یوں ہیں :-

بیاں کیا کروں حمد پروردگار | کہ عجز بیاں سے ہوں بس شرمسار
کہ طاقت کہاں اس قدر نطق کو | جو تمہید اس کی سرانجام ہو
زباں کو تکلم کا یارا نہیں | تعقل کا بہا کچھ گزارا نہیں

گورنر کی تعریف

گورنر بہادر معلی جناب | کہ جس کا ہوا لارڈ منٹو خطاب
افادات جس کے ہیں شام و سحر | معنی ادھر اور ادھر

اس اقلیم کا نت ہو فرماں روا — تسلط رہے اس کا یونہیں سدا

آغاز داستان

سلف میں کہیں کوئی تھا بادشاہ — برآرندہ تخت و تاج و کلاہ

شہ عادل و خسرو داد گر — معین ستم دیدگان ہر سحر

سدا قیصر روم خاقان چیں — رہا کرتے اس کے اطاعت گزیں

جواہر دانش (۱۹۲۷) بارہ قصوں کا مجموعہ ہے جو حسن کردار کے لئے بطور نصیحت لکھی گئی ہیں اس کے دو نسخے اس کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ سنہ ۱۲۷۲ھ (سنہ ۱۸۵۶ء) کا مطبوعہ ہے اور دوسرا نسخہ سنہ ۱۳۱۵ھ (سنہ ۱۸۹۸ء) کا ہے دونوں نسخے بمبئی میں طبع ہوئے ہیں۔ دونوں طباعت میں قصے تو وہی ہیں مگر ترتیب بدل دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا فرق یہ ہے کہ سنہ ۱۳۱۵ھ میں متن اور حاشیہ میں ایک ہی قصہ ہے اور اس کے اختتام پر دوسرا قصہ شروع کیا گیا ہے اور سنہ ۱۲۷۲ کے نسخہ میں آغاز ہی سے متن میں ایک قصہ اور حاشیہ میں دوسرا قصہ لکھا گیا ہے۔ سنہ ۱۲۷۲ھ میں جو نسخہ طبع ہوا ہے اس کے ٹائیٹل پر حسب ذیل عبارت طباعت کے متعلق درج ہوئی ہے۔

"الحمد للہ والمنۃ کہ یہ نسخہ مرغوب ہر دلاں خوشتر سامان افسر یہ مسمی بارہ قصہ ان دونوں بالکل نایاب تھا۔ اس واسطے بندہ رب الکریم ابراہیم بن قاضی نور محمد پکندری نے جزیرہ معمورہ بندر بمبئی کے مطبع حیدری میں بتاریخ ۲۸ ذی حجہ سنہ ۱۲۷۲ھ میں زیور طبع پہنایا۔"

یکے بعد دیگرے ان بارہ قصوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔

(۱) لال و گوہر اس کا مصنف عارف الدین خاں عاجز تخلص ہے اس مثنوی کی تصنیف سنہ ۱۱۵۰ کے بعد ہوتی ہے صحیح سنہ معلوم نہیں ہوا اس کے قلمی متعدد نسخے حیدرآباد کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ آغاز یہ ہے۔

* الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی — عطا کر مجھ کو یا قوت معانی

یہ ایک عشقیہ داستان ہے ہیرو لال شاہ اور ہیروئن گوہر پری ہے۔ پری عاشق ہوتی اور کامیاب ہوتی ہے۔ اختتام اس شعر پر ہوا ہے :۔

الٰہی عاشقوں کی آبرو رکھ — انھوں کو دو جہاں میں سرخ رو رکھ

(۲) قصہ زیتون و محمد حنیف :۔ اس داستان کا مصنف وقتی ہے مگر اس کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس مثنوی کا قلمی نسخہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ داستان میں محمد حنیفہ اور زیتون شہزادی ہیرو ن ہیں، محمد حنیفہ کا زیتون شاہ سے جنگ کرنا، بعد فتح اسلام کی تبلیغ کرنا پھر کامیاب ہوکر مدینہ کو واپس آنے کی صراحت ہے۔ مثنوی کے اختتام میں اس کی طباعت وغیرہ کے متعلق بھی اشعار لکھے گئے ہیں۔ آغاز یوں ہے :

الٰہی دو عالم کا کرتار تو — دونوں جگ کا پیدا کرنہار تو
کیا اپنی قدرت سے خلقت ظہور — زمین آسمان اور ملائک و حور

اختتام میں طباعت کے متعلق کئی امور کی وضاحت ہوتی ہے۔

الٰہی مصنف رہے خوش خرام — بحرمت نبی اور آل کرام
بزان حاجی صاحب کو ذوالکریم — علی بھائی پر کر تو دو اور نعیم
جو از نور احمد ہوا نام ور — اوسے دین و دنیا میں کر بہرہ ور
وہ فیاض فیروز ہے کامیاب — چھپائی ہے اوس نے سنو یہ کتاب
جو بارہ قصے تھے اونے اب لکھائے — دیا چھاپ خانہ میں اپنا چھپائے
اصل ہے وطن ان کا سورت بندر — مگر ہیں مدت سے بمبئی کے اندر

اس کے بعد پانچ شعر ہیں۔ محمد حنیفہ کے متعلق دکھنی زبان میں کئی داستانیں لکھی گئی ہیں جو [illegible] علاوہ مضمون پر مشتمل ہیں۔ اس خصوص میں [illegible] ایک تفصیلی مضمون [illegible] ہوا ہے۔

(۳) قصہ لیلیٰ مجنوں :- اس مثنوی کا مصنف عبداللہ واعظ ہے اور اس کی تصنیف ۱۰۹۶ھ میں ہوئی ہے چنانچہ آغاز یعنی مدح و نعت منقبت کے بعد مصنف نے اپنے متعلق اور تاریخ تصنیف کے متعلق صراحت کر دی ہے۔ آغاز اس طرح ہوا ہے :

الٰہی بخش مجھ کو نور وحدت — کہ جاوے دل سے میری سب کدورت
الٰہی بخش تو عرفان مجھ کو — نبی کی لے مدد کہتا ہوں تجھ کو
یہ عبداللہ غلاموں بیچ کمتر — الٰہی کر دے دو جگ میں بہتر
زبان دکھنی میں اک قصہ سناؤں — سنہ ہجری میں سو لکھ کر سناؤں
گیارہ سو اوپر تھے پر چھنوں — لکھا ماہ صفر میں لیلیٰ مجنوں
وقت تھا ظہر کا تاریخ دسویں — رکھی ہیں نے پیر کے دن بات دل میں

اختتام یہ ہے

ہوئی قصہ کی اب یہاں سے تمامی — کرو تم عاشقوں کی سب غلامی
ہیں عبداللہ واعظ ابن اسحاق — خدایا بھیج میرے غم کا تریاق
شروع قصہ کیا دسویں صفر کو — وہ دن تھا پیر کا وقت ظہر کا
مہینے ایک میں قصہ لکھا تھا — سنو سورت میں یہ قصہ بنا تھا

اس سے واضح ہے کہ داستان سورت یعنی گجرات میں تصنیف ہوئی ہے اور عبداللہ اس کا مصنف ہے۔ لیلیٰ مجنوں کی داستان مشہور ہے، اس لئے اس کی صراحت غیر ضروری ہے۔

(۴) قصہ بیر الالم :- اس مثنوی کا مصنف عظیم الدین ہے اور اس نے اختتام پر اپنے نام کی صراحت بھی کر دی ہے۔ آغاز یہ ہے :

کہوں میں حمد رب العالمین کا — جو قاوند ہے دنیا و دین کا
کیا اظہار قدرت خوب اپنا — بنایا نور سے محبوب اپنا

داستان کا سنہ تصنیف واضح نہیں ہوتا۔ اس مثنوی کے قلمی نسخے کتب خانہ سالار جنگ

اور کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔ مگر کتب خانہ سالار جنگ کے نسخہ میں مضمون میں کسی قدر تبدیلی ہے اور مصنف کا نام بھی بدلا ہوا ہے عظیم الدین کے نام کی صراحت ملاحظہ ہو۔

عظیم الدین اب خاموش کر تو ۔۔۔ ذکر اتمام کر صلواۃ پڑھ تو

ہوئی ہے جنگ کی اتمام بات ۔۔۔ محمد پر کہو سب مل کے صلوات

کتب خانہ سالار جنگ کے نسخہ میں مصنف کا نام میر باقی ہے چنانچہ ملاحظہ ہو۔

تو کر میر باقی سے مشکل کو حل ۔۔۔ ہر ایک آن میں کر تو اوسپر فضل

کتاب کے نام میں کس قدر فرق ہے ممکن ہے یہ کتابت کی سہو ہو۔ یہاں کتاب کا نام پیر العلم لکھا گیا ہے۔

داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آں حضرت صلعم کسی جنگ پر تشریف لے گئے، ایک مقام پر پانی نہیں تھا پانی لانے کے لئے حضرت علی کو روانہ کیا گیا۔ آپ ایک بت پرست بوڑھے کو ہمراہ لے آئے جس کو پانی کا مقام معلوم تھا، اس نے کہا اس جنگل میں ایک بھوت رہتا ہے، اگر اس کو قتل کر دیا جائے تو وہ پانی فراہم کر دے گا۔ آں حضرت نے ایک صحابی سعد کو بھوت سے لڑنے کے لئے روانہ کیا مگر بھوت نے ان کو ہلاک کر دیا اور آں حضرت پر وحی آئی کہ اس بھوت کو بجز حضرت علی کے کوئی قتل نہیں کر سکتا، اس کے بعد آں حضرت صلعم نے حضرت علی کو روانہ کیا۔ آپ نے بھوت کو قتل کر دیا اور سعد کی کٹی ہوئی گردن جسم سے لگا دی اور سعد فوراً زندہ ہو گئے۔ اس معجزہ کو دیکھ کر وہ بوڑھا اور اس کی بی بی اسلام سے مشرف ہوئے۔

(۵) قصہ وفات نامہ بی بی فاطمہ :- اس کا مصنف طالب ہے جو گجرات کا باشندہ تھا۔ کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ میں اس مثنوی کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، حضرت بی بی فاطمہ کے انتقال کا حال لکھا گیا ہے۔

آغاز

کروں ابتدا میں بنام خدا ۔۔۔ کہ مارے جلا وے و پالے سدا

محمد نبی سید المرسلین حبیب خدا رحمت العالمین

اختتام یہ ہے

قیامت میں طالب شفاعت کے دن شفاعت سے بخشے تجھے زبانِ تن

ہوا آخر آکے قصہ تمام نبی پر درود ان اچھو اور سلام

سالار جنگ کے مخطوطہ سے اس کا مصنف "امین" ظاہر ہوتا ہے۔ مطبوعہ اور قلمی مثنوی اشعار کی کمی وبیشی ہوئی ہے۔

(۶) قصہ تمیم انصاری:۔ اس نام کی کئی منظوم اور نثری داستان کا پتہ چلتا ہے جن میں سے بعض کے مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں مگر تمام داستانوں کا قصہ ایک ہی ہے جس میں ایک صحابی تمیم انصاری کے زبانی عجائبات دنیا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آغاز یہ ہے۔

ثنا اور حمد مومن کی سنو تم جواہر اور سچے موتی چنو تم

دیکھو کیا کہیں ہے اوس پاک رب کا تماشا دیکھتا ہے آپ سب کا

اس منظوم داستان کا مصنف غلام رسول غلامی گجراتی ہے۔ چنانچہ خاتمہ میں اس کا تفصیل سے ذکر موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

غلامی اس سوا مت مانگ کچھ غیر رہے ایمان سلامت عاقبت خیر

غلام رسول نام ہے گا مرشدوں میں تخلص مطلب ہے سب بیتوں میں

مناقب مدح میں انور مدامی ہے قصوں میں لقب میرا غلامی

میرا مولود ہے در شہر سورت کیا کھمیات میں چندمدت سکونت

یہ قصہ فارسی تھا نثر منقول کیا میں اس کو ہندی نظم بے مول

تبھی فرمائیں جو کہتا ہوں یوں کہ تم ہندی کرو اس فارسی کون

جدا لاکر دیا ان کی اصل کو تتبع میں کیا ہندی نقل کو

بہت تاکید سعید الدین کی تھی میاں جعفر نے بھی کچھ کم نہیں کی
سنہ بارہ سو اٹھارہ کے درمیان تھی تاریخ چودھویں اور ماہ شعبان
میں کھمبایت میں اس کو کہا تھا ہنداروں کی مسجد میں لکھا تھا
جمعہ کی صبح ٹھنڈیں کی سرسری تھی وہ مسجد دوست داران سے بھری تھی

- - - - - - - - - - -

بتیاں نو سو اوپر چالیس پر دو ہوئی اس قصہ کے فی الجملہ گن لو
ابھی قصہ یہاں بس کر غلامی درود ان پڑھ محمد پر مدامی

(۷) قصہ قاضی و چور :۔ اس مثنوی کے مصنف کا نام نوراللہ ہے اس میں ایک داستان قاضی اور چور کی لکھی گئی ہے چور نے اپنے علم کی جدت سے قاضی کو مجبور کر دیا اور بازی جیت لی ہے۔ ابتدا یوں ہے:

کروں حمد اول خدا پاک کا کرن ہار صاحب جو افلاک کا
نہیں غیر کوئی اس کے کوئی کردگار کیا جس نے دو جہاں آشکار

مثنوی کے اختتام پر مصنف کے نام وغیرہ کی صراحت موجود ہے اور سنہ تصنیف بھی واضح کیا گیا ہے فارسی سے ترجمہ کرنے کی بھی صراحت کی ہے۔

اول فارسی تھی سو دکھنی کہا بنا کر حوالے خدا کے کیا
بنایا نوراللہ نے قصہ لکھا علی خان بہادر چھپایہ کیا
وہ تاریخ چھٹی تھی رمضان کی نشانی تھی مومن کی ایمان کی
رجب کی دھم اب ہوا یہ ختم اٹھارہ برس بارہ سو تھے کم
قصہ چور و قاضی کا کہنا تمام درود ان محمد پہ اور سلام
قلم سے محمد کے لکھا گیا، حمایت سے جامی کے چھاپا گیا

اس سے واضح ہے سنہ ۱۱۸۲ھ میں فارسی سے دکھنی نظم میں منتقل

(۸) قصہ تنبولی کی عورت کا :- ایک تنبولی کا قصہ اس مثنوی میں نظم کیا گیا ہے۔ آغاز مثنوی کی ابتداء میں ایک مختصر نثر ہے جو حسب ذیل ہے۔

یہ قصہ تنبولی اور تنبولن کا جس نے اپنے مرد سے فریب کیا اور غیر مرد پر فریفتہ ہو کر اپنا گھر برباد کیا......"

نحوست کا قصہ ہوا اب شروع　　کسی مسخرے نے کیا جو رجوع
کیا اس طرح کا ادی چرتر ایک　　نہیں مانتے بات اس کی جو نیک

قصہ کے اختتام پر چند اشعار ہیں۔ پند و نصیحت کے ہیں۔

سنو اے عزیزو تمہیں کان دھر　　کہ عورت میں ہیں کئی فن مکر
زنوں کے مکر کا نہ حد و حساب　　لکھوں گر تو ہوئے یہاں صد کتاب
کہ ایک پل میں وہ لاکھ حکمت کرے　　سچی بات ناری و جھوٹی کرے
نہیں بات عورت کی سنتا ہے جو　　کہ راحت سے دن رات جیتا ہے او

تنبولی کا گھر بار کر دے تباہ　　خدا ان کو مکروں سے دیوے پناہ
میں بندہ ہوں تیرا ضعیف اے الہٰ　　میں عاصی ہوں تیرا تو بخشے گناہ

ممکن ہے عاصی اس کا مصنف ہو مگر یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔

(۹) قصہ جمجمہ :- اس نام کی ایک مثنوی کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے اور کتب خانہ سالار جنگ میں دو نسخے ہیں۔ مگر اشعار میں کمی و بیشی ہے۔ اس داستان میں عیسیٰ علیہ السلام سے ایک انسانی کھوپڑی جو کسی بادشاہ کی تھی گفتگو کرتی ہے۔ کھوپڑی اپنے گزشتہ عظمت اور شوکت کا حال اور اپنا انجام بتاتی ہے۔ ابتدا ذیل کے شعر سے ہوتی ہے :-

ناگہاں قدرت خدا سے یوں ہوا　　جن زمین و آسماں پیدا کیا

آخر کے چند شعروں میں مصنف نے اپنا نام بھی ظاہر کیا ہے۔

کہتا ہے عبداللہ مجھ پر کر کرم   باطفیل حضرت خیر الامم
یعنی آن ذات مبارک دستگیر   ہیں محی الدین جو پیران پیر
معجزہ عیسیٰ کا اب کر تمام   حضرت احمد نبی پر کہوں سلام

ایک قلمی نسخہ میں "کمترین" تخلص آیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کمترین سخن تو کر بیان سے تمام   بھیجو پیغمبر پر صلوات و سلام

ممکن ہے مثنوی لیلیٰ مجنوں جس کا تذکرہ نمبر (۴) پر کیا گیا ہے وہی اس مثنوی کا بھی مصنف ہو۔

(۱۰) قصہ چوہا اور بلی :- مطبوعہ نسخوں کے علاوہ اس مثنوی کے دو قلمی نسخے بھی کتب خانہ سالار جنگ میں ہیں مگر دونوں میں آغاز کے اشعار نہیں ہیں اگرچہ بسم اللہ کے ساتھ مثنوی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس مطبوعہ داستان کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں :-

خدا ہیگا خالق خلق کا تمام   کیا جسنے پیدا سب ہی خاص و عام
جنے انس و حیواں و وحش و طیور   سبھی روح والے سو اوس کا ظہور

اختتام میں مصنف کا نام بھی درج ہے۔

پھیلائی ہے کیسا مکر یہ بلی   چوہے سات سو کھا کے حج کو چلی
ہوا اب یہ قصہ یہاں سے تمام   شرف دین اس کو کیا اختتام

آخری میں اشعار بھی کسی قدر تبدیل ہو گئے ہیں۔ ایک نسخہ میں شرف الدین کا تخلص مدن ظاہر ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو :

دیکھو کیا او مکر کرے یو بلی   چوہے سات سو کھا کے حج کو چلی
یان سوں سالا یو قصہ تمام   ہمیں یوں کتے ہیں مدن نیک نام

اس سے واضح ہے کہ شرف الدین اس کا مصنف ہے اور اس کا تخلص "مدن" ہے۔

(۱۱) قصہ نازنین و پٹھان :- اس داستان کا آغاز یہ ہے۔

ثنا حمد کو ہے دائم مدام   کئے جس نے پیدا سبھی خاص و عام

وہ ستار و غفار ایزد تعالیٰ　　　جو رازق خالق وہ ہے ذوالجلال

اس میں ایک پٹھان اور ایک نازنین کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ نازنین کئی سوالات پٹھان سے کرتی ہے اور پٹھان جواب دے کر نازنین کو قایل کر دیتا ہے اور نازنین مسلمان ہوتی ہے اس مثنوی کا مصنف کوئی شاعر حامد ہے۔ یہ تخلص متعدد شعروں میں آیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

شرف ہے مسلمان کا سب پر اتم　　　لے حامد تو قصہ کو کر دے ختم
قصہ ناگری کا سنا تھا اصل　　　کیا اسکے اوپر سے میں نے نقل
لکھا اس کو میں نے سوانجار میں　　　مہینے مبارک ہو رمضان میں
جو تاریخ رمضان کی تھی بیسویں　　　وہ تھی نیک ساعت سنو ایک دیں
لے حامد بس اب تو تو کیرا نہ کر　　　پورا کر تو قصہ ابھی زود تر
نہ کر اس کے آگے فدا کچھ کلام　　　نبی پر تو بھیج اب درود و سلام
وہ حامد کی کچھ بنی سنو زاہد یوم　　　اسی کی تھی انجار میں سکہ دھوم

(۱۲) قصہ کالی و گوری کا:- یہ ایک مختصر مثنوی ہے ایک شخص کی دو عورتیں تھیں، ان میں ایک کالی اور دوسری گوری تھی ان کی سیرت کو داستان میں دہرا گیا ہے شروع کے دو شعر یہ ہیں۔

شخص اک شہر سورت میں دیکھی جو دو اں تھے دو　　　کہلے گوری دوجی سانولی دونوں پردہ رہا تھا جو
کمائیکو سودہ نکلا گیا پردیس میں چل کر　　　روپیے کتنے کما لایا پھر آیا اپنے گھر دل کر

قصے کے اختتام پر تاریخ تصنیف کی صراحت بھی ہو گئی ہے

کہ سنہ یکہزار دو سو پر سولہ ہوئے تھے جب　　　قصہ یہی میں نے لکھا ماہ شعبان میں تب

"جناب قاضی عبدالکریم صاحب نے اپنے مطبع نامی کریمی واقع بمبئی میں زیور طبع سے آراستہ و پیراستہ کیا۔" اس تفصیل سے سنہ ۱۸۵۰ء کے قبل کی بعض مطبوعہ منظوم داستانوں کے متعلق معلومات حاصل ہو جاتے ہیں اور کچھ مفید باتیں ظاہر ہوتی ہیں جو ریسرچ کرنے والوں کے لئے کارآمد ہو سکتی ہیں۔

فلاح کی راہ

جناب محمد ذاکر

(۱)

آج ہم جس بے کسی اور نا داری کی حالت میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ کسی معرب اخلاق جگہ یا فعل کا ذکر آتے ہی ہمارا ذہن اپنی ہی طرف پلٹ آتا ہے۔ قوموں کی تاریخ میں اجتماعی بے مقصدی اور ذہنی کجروی کی مثال ہمارے موجودہ خستہ اعمال کے علاوہ شاید اور کوئی نہ ہو۔ ان گنت لوگ اس ملک سے بغیر کسی خاص مقصد کے دوسرے ملک تک جاتے ہیں۔ اپنا بیش بہا وقت اور خونِ جگر سے پیدا کی ہوئی اپنی ہیچ مایہ معیشت بے مقصد لٹا کے مفلس قلانچ ہو کر پھر مادر وطن کی گود میں آپڑتے ہیں۔ اقتصادی اور معاشی حالت جس پر کسی قوم کی سماجی، سیاسی اور تمدنی بقا اور ترقی کا دارو مدار ہے، اس کا مرقع کھینچنے کے لئے کسی شاعرانہ مبالغہ کی ضرورت نہیں۔ صنعت و حرفت اور تجارت کے شعبوں میں برائے نام ہمارا ذکر آجاتا ہے۔ اونچی سطح کے معدودے چند افراد کو چھوڑ کر جن کی زندگی کو مشعلِ راہ بنا کر ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے، وہ نوجوان طبقہ جس سے قوم کا مستقبل بنتا یا بگڑتا ہے بے حسی اور قنوطیت کے کسی نامعلوم اندھیرے تیرہ و تار غار میں سر منہ اوندھائے پڑا ہے جس کو زندگی کا کوئی پتہ نہیں۔ کبھی کوئی ہوش میں آتا بھی ہے تو کسی بے نشان آسمانی فرشتہ کی بشارت کا منتظر رہتا ہے۔ اور بس پھر وہی خوابِ گراں، پھر وہی اذیت کوش بے حسی۔ کوئی اور آگے بڑھتا ہے تو ملکی حکومت کا ادنیٰ غلام بننے کی آرزو میں گھلا جاتا ہے اور اس تیز رفتار صنعتی ہنگاموں کے پروردہ پر آشوب زمانہ میں اپنی کوشش میں ناکام رہنے کے بعد شعر و ادب کی نظر فریب بھول بھلیوں میں اپنے آپ کو اسیر کر لیتا ہے۔ رنگین عبارت آرائی یا پھر مدفن اسلاف کی سجادہ نشینی پر قناعت کرنا باعثِ فخر سمجھتا ہے۔ پھر یہ لوگ خود کو تو کسی مقصدِ عظیم سے کبھی وابستہ نہیں کرتے مگر دوسروں کی ذرا سی

آغوش پر چین بچھیں ہو جاتے ہیں۔ دوسرے کی آنکھ کے تنکے کو شہتیر بنا بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں۔

نئے تعلیم یافتہ کچھ "روشن خیال" ایسے بھی ہیں جن کو محرومی اور بے نادی نے احساسِ کمتری کے اس انتہائی پُر خطر کنارے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں "کسی نوید کا امکان ہی نہیں" ان کے نزدیک قوم کا ایک ایک فرد گردن زدنی ہے۔ بہترین حل یہ ہے کہ آسمان ٹوٹ پڑے، قہر و غضب کی بجلیاں ہر نشیمن کو جلا کر راکھ ڈالیں، ہر ایک طائر کو چن چن کر پھونک دیں۔ جلد از جلد غرقاب ہو جائے یہ کشتی جس کے ملاح تند و تیز طوفان کے پیہم جانکاہ ہچکولوں سے بھی ہوش میں نہ آتے ہوں۔ خاک ہو جائے یہ جہان، آتش فشاں پہاڑ اپنے دہانے کھول دیں، زمین پھٹ پڑے اور زندگی کا کوئی ذرہ کوئی نام و نشان نہ رہے۔ ماضی سے نالاں، حال سے بیزار، مستقبل سے بے پروا، یہ ہے ہمارے نوجوانوں کی ذہنی جودت اور بلندیٔ فکر!

قوم کے وہ لوگ جن کو ناسمجھ اور جاہل عوام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جن کے متعلق بے بنیاد یقین ہے کہ مذہب کے نام پر وہ کسی وقت بھی یک جا ہو کر قومی زندگی کی تشکیل میں حصہ لے سکتے ہیں ان کی حالت اور زیادہ نازک ہے۔ مذہب کی اسپرٹ تک تو ان کی پہنچ کے متعلق پہلے بھی کبھی خیال نہیں کیا جا سکتا تھا محض جذبات کی بنیاد پر ان کو اکسا اکسا کر ہمیشہ کام نکالا گیا ہے اور اس کا نتیجہ آج سب پر روشن ہے۔ ان میں اب نام نہاد قومی غیرت اور حمیت کا بھی پتہ نہیں۔ اسلام کے بنیادی ارکان کی پابندی کجا خود مساجد اور قومی درسگاہوں کی وہ ظاہری رسمی تعظیم بھی نہیں رہی۔ آدھی آدھی رات تک مسجد کے زیر سایہ مسلم ہوٹلوں میں سستے بے ہودہ گانوں پر سر دھننے والوں کا موجود ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔

ہر طرف پُر ہول تاریکی ہے۔ کم ہمتی، بزدلی، نامرادی اور بربادی کے پست اور تاریک غاروں کے ہیبت ناک دہن کھلے ہوئے ہیں۔ ایسی بے خبری اور بے حسی کی نیند پڑے ہے بھی مبہوت بے حرکت پڑے ہیں۔

(۲)

قوم کی کشتی کو ضلالت اور جہالت کے اس خوفناک جانکاہ بھنور سے نکالنے کے لئے منفرد

اس بات کی ہے کہ ہر فرد کے دل میں ایک امنگ پیدا ہو، اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ پیدا ہو نذہن صاف ہو۔ کوئی آئیڈیل، کوئی لائحہ عمل ہمارے سامنے موجود ہو اس کی اہمیت سے ہم پوری طرح واقف ہوں اور اس کو حاصل کرنے کی دھن میں ہم کسی مشکل کو مشکل نہ سمجھیں۔ آسمان اتنا سخت نہیں ہے اور نہ ملک کی گردش ہی اتنی تنگ ہو سکتی ہے۔ جمہوری نظام کے لیے (خاص طور سے وہ جو نیا نیا قائم ہوا ہو) اس سے بڑا خطرہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ملک کی آبادی کا ایک حصہ پسماندہ اور بے حس ہو جائے ہمیں سب سے پہلے اپنی اقتصادی تنظیم پر زور دینا ہوگا۔ یہ کام شروع میں جتنا کٹھن معلوم ہوتا ہے اتنا ہی ضروری بھی ہے۔ تمام ملک کے لیے منظور شدہ کسی ہمہ گیر اقتصادی پلان کے تحت جمہوری نظام میں کسی ایک جماعت کی اقتصادی تنظیم کوئی غیر قانونی بات نہیں ہے۔ جمہوریت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہر فرد، ہر فرقہ و جماعت یک رنگ ہو جائے۔ اس کا مقصد تو قوس قزح کے سے مختلف رنگوں کا حسین امتزاج ہے۔ اتنے بڑے ملک میں میرے خیال میں جمہوریت کے معنی دراصل یہ ہیں کہ چھوٹے بڑے مختلف گروہوں کی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ان کو ایک دوسرے سے قریب لایا جائے۔ اکثریت کے غالب آجانے کا خوف بھی نہ رہے اور اقلیتی فرقے بھی احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔ قومی منصوبوں اور مجوزہ سماجی نظام کے تحت سب اپنی اپنی جگہ مطمئن بھی رہیں اور منظم بھی اور ملک کی ترقی میں بھی سب شریک رہیں۔

اقتصادی تنظیم کے سلسلے میں اس وقت باریک فنی باتیں نہیں اٹھاؤں گا مگر سرسری طور سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ انفرادی حیثیت سے بڑے پیمانہ پر کوئی صنعت کھولی جائے۔ کیونکہ اول تو بڑی بڑی صنعتیں کھولنے کا کام زیادہ تر حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور (Private Sector) کا میدان محدود کر دیا ہے۔ ویسے بھی یہ انفرادی نفع اندوزیوں کا زمانہ نہیں ہے۔ دوسری بڑی اور زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ بڑی صنعتیں قائم کرنے کے لئے سرمائے اور تجربے کا ہونا اولین شرط ہے جو ہماری قوم میں قریب قریب مفقود ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اسکے اسباب و علل میں جانے کا یہاں کوئی موقع نہیں

ہے۔ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں بھی کم و بیش مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر نہیں قائم کی جا سکیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اقتصادی تنظیم اور معاشی بحالی کے نتائج جلد دیکھنے کے لئے بڑی بڑی صنعتوں کے مقابلہ میں چھوٹی گھریلو قسم کی صنعتیں زیادہ مفید ہیں۔ درحقیقت اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر عزت کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہمیں امداد باہمی کے مرکز کھولنے ہوں گے۔ دونوں قسم کے پیداوار کے لئے بھی اور بکری سپلائی کے لئے بھی۔ یہ دراصل گھریلو صنعتیں اور اس طرح بنائے ہوئے مال کے نکاس کے مرکز ہوں گے گھریلو دستکاریاں جن کو چلانے کے لئے نہ تو اتنے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ برسوں کے تجربہ ہی کی۔ لوہاری، تجاری، جفت سازی دھات کا کام، پارچہ بافی اور سوزن دوزی وغیرہ ایسے کام ہیں جو ہماری قوم میں ہوتے بھی آئے ہیں اور اول الذکر دو تین کاموں کو چھوڑ کر ان کو ہماری پردہ نشین عورتیں بھی بآسانی کر سکتی ہیں اور کم تعلیم یافتہ مرد بھی۔ وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ اب یہ کام ذرا تنظیم سے ہوں۔ امداد باہمی کے یہ مرکز بالکل جاپانی نمونوں کے ہوں جن میں نہ کام کرنے والوں کو ہی زیادہ الجھن ہو اور نہ تنظیم کرنے والوں ہی کو پیچ در پیچ منزلوں سے گذرنا پڑے۔ پیداوار اور تقسیم کے ایسے اداروں کا تمام قوم میں ایک جال بن جائے۔ ہر مسلم محلہ میں ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جہاں مسلمان عورتیں جو سینے پرونے اور بنائی وغیرہ کے کام میں کسی طرح بھی کسی سے پیچھے نہیں، جا کر کام کریں یہ کام مختلف مرکزوں پر بھی ہو سکتا ہے اور گھروں میں بالکل آزادانہ بھی۔ مقررہ وقفوں سے ان تمام سنٹروں سے تمام پیداوار اکٹھی کی جا سکتی ہے۔ اس طرح ایک جگہ جمع کر کے اس کی جدید سائنٹفک طریقوں سے فروخت کا بندوبست آسانی سے ہو سکتا ہے۔ حکومت خود بھی چاہتی ہے کہ ملک کے تمام شہروں اور دیہات میں ایسی گھریلو دستکاریوں کا ایک جال بچھ جائے۔ حکومت کے قائم کردہ گھریلو دستکاریوں کے شعبے اور انڈین اسٹینڈرڈ انسٹی ٹیوٹ اور اسی قسم کے دوسرے ادارے اس سلسلہ میں بے حد مددگار ہو سکتے ہیں۔

اقتصادی تنظیم کے ساتھ ساتھ ہمیں تعلیم پر بھی جو متفقہ طور سے قوم کے دیرینہ امراض کی

داخل ہے، پوری پوری توجہ دینی ہوگی۔ مذہبی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کرنا ہوگا۔ پرانی طرز کے مکتبوں میں قرآنی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم جدید کی تعلیم کی طرف بھی دھیان دینا ضروری ہے۔ جن جن پرائمری اور ثانوی اسکولوں میں مسلمان بچے پڑھتے ہیں وہاں ان کی مذہبی تعلیم کا معقول انتظام کرانا ہوگا۔ ہندی کے ساتھ مادری زبان کی اہمیت کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ تعلیم نسواں پر خصوصیت کے ساتھ توجہ کرنی ہوگی۔ لڑکوں میں ثانوی تعلیم کے بعد عملی ٹیکنکل تعلیم پر زیادہ زور دینا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں حکومت کے قائم کردہ پیشہ ورانہ رہنمائی کے مراکز (Vocational Guidance Centers) سے زیادہ مدد لینی ہوگی قوم کے وہ افراد جو کسی طرح بھی قوم کی خدمت کر سکتے ہیں انھیں زیادہ سے زیادہ قربانی کے لئے تیار رہنا پڑے گا۔ بے غرض اور بے نفس ہو کر تعمیر کے کاموں میں حصہ لے کر دوسروں کو اونچا اٹھانا ہوگا۔ قوم میں ایک جذبہ اور جوش اور عمل پیدا کرنے کے لئے ہر وقت ذاتی منفعت کے خیال کو چھوڑ کر اپنے آپ کو تیار رکھنا پڑے گا۔

پست قسم کی سیاست کا شکار ہونے سے بچنے کے لئے، جس کا ثبوت اکثر و بیشتر ملتا رہتا ہے، قوم کی از سر نو تنظیم کرنی ہوگی، عادات و اطوار سنوارنے کے لئے ہر مسلم آبادی میں ایک ایسا مرکز قائم کرنے کی ضرورت ہے جہاں جمع ہو کر ہم لوگوں کو بحیثیت مسلمان اور بحیثیت ایک ہندوستانی شہری ہونے کے اپنی اہم ذمہ داریوں کا احساس ہو سکے۔ ہر ایک کا یقین اور اعتماد محکم ہو سکے۔ اور تمام ملک کے لئے دوسروں کے ساتھ مل کر عمل کرنے کا ایک نیا جذبہ پروان چڑھ سکے۔

(۳)

یہ سب کچھ جب ہی ہو سکتا ہے، جب قوم کے ہر فرد میں ایک تڑپ، ایک لگن، خلوص کے ساتھ کچھ کر ڈالنے کی ایک مبہم خلش پیدا ہو۔ آج جن خوابیدہ شب پرستوں پر صبح کی درخشانی گراں معلوم ہوتی ہے اور قوم کے وہ ناامید لوگ جو چپ چاپ زیر افلاک

بے جا الجھے ہیں ان میں ایک سیمابی کیفیت پیدا ہونے کی ضرورت ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ سب مل کر مشین ہر ایک ایک دوسرے کا کھرا بنے۔ جوان اپنا عزم اور محنت لائیں، بزرگ اپنے بیش قیمت تجربے اور ہمہ گیر علم کی روشنی سے رہنمائی کریں۔ ذمہ داری کے وہ فرائض جو پورے ملک نے ان پر عائد کئے ہیں اسی پر اکتفا کرنا کافی نہیں۔ بڑائی اس میں نہیں کہ دوسرے لوگ ہمیں بڑا کہیں بلکہ اس میں ہے کہ ہم اپنے چھوٹوں کی دستگیری کریں۔ ان کے دل اپنے ہاتھ میں لیں۔ ترقی کا نیا راستہ دکھائیں ان میں ہمت اور حوصلہ پیدا کریں۔ ان کو تازگی اور توانائی بخشیں۔ قومی تنظیم کا یہ کام اگر اب نہ ہوا تو کبھی نہ ہوگا اس وقت غفلت کا ایک لمحہ بھی منزل کو کوسوں دور کر دے گا۔ غبار آلود فضاؤں کے متعلق یہ یقین کر لینے سے کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خود بخود صاف ہو جائیں گی اور نحوست اور ادبار کے روز افزوں بادل خود بخود چھٹ جائیں گے اور خود ساختہ موہوم مصلحتوں کو مد نظر رکھ کر سکون اور جمود کی حالت میں بے حس پڑے رہنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا بلکہ اس طرح تو ہم اپنے لئے ہی نہیں بلکہ سارے ملک کے لئے ایک خطرۂ عظیم مول لیں گے ایسا خطرہ جس کا اندازہ آج کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

خوش قسمتی سے ابھی کچھ ایسے شرارے اور بجلیاں موجود ہیں جو اپنی ابدی لپک اور تڑپ سے دلوں کو گرما سکتی ہیں اور قوم میں ابھی چند ایسے شوریدہ سر جوان ضرور موجود ہوں گے۔ جن کی حوصلہ افزائی کرنا ہر ایک کا ایک مقدس فرض ہے۔ ابھی ایک ایسی جماعت خواہ وہ کتنی ہی کھوکھلی اور مطعون کیوں نہ ہو، موجود ہے جس میں نئے خون اور پرانے تجربے کی آمیزش قومی تنظیم کے دشوار ترین کام کو سہل بنا سکتی ہے اگر اس جماعت کے مروجہ ڈھانچے میں رہ کر اس کام کو انجام دینے میں کوئی دقت ہو جس کی بظاہر کوئی وجہ نہیں کیونکہ جہاں تک تعلیم کا سوال ہے۔ یہ جماعت کافی عرصہ سے اس پر غور کرتی رہی ہے اور وقتاً فوقتاً اس نے کئی اہم اقدامات بھی کئے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی اقتصادی پلان کے تحت جمع ہوں۔ اور اپنی اور پورے ہندوستان کی نئی زندگی کی تشکیل کریں۔ خود حکومت نے ایسے ادارے، جن میں سے کچھ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے

قائم کئے ہیں تاکہ ہر قوم کی اقتصادی تنظیم مضبوط ہو سکے۔ ان تک پہنچنا ضروری ہے جماعتی حیثیت سے یہ کام اور سہل ہو جائے گی۔

"قومی حیات کا محل اس طرح تعمیر نہیں ہو سکتا کہ پہلے دیواریں کھڑی ہو جائیں پھر اس کی محرابیں اور اطراف و جوانب بھی تیار ہو جائیں گے۔ کشاکش حیات و ممات اور تسابق اقوام کی کشمکش میں فرصت و مہلت کا سکون بغیر خواب ممات کے ممکن نہیں۔ یہاں تو ہر دم اور ہر لمحہ کام کئے جایئے اور ایک ہی وقت میں اس عمارت کے ہر حصہ کی خبر لیجئے۔ یہ نہ ہو کہ دروازہ بن رہا ہے مگر پشت کی تیار کردہ دیواریں گر رہی ہیں۔ اس عالم میں جو کھو گیا وہ پھر نہیں ملتا اور جو وقت غفلت میں کٹا پھر اس کی تلافی کی مہلت نہیں دی جاتی ؎

ایں رہ عشق است و رجع گشتن ندارد باز گشت
جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست!"

ابوالکلام آزاد

سیرتِ پاکؐ کی تعلیم

اسلام نے ایک خدا اور ایک دین کا تصور پیش کیا ہے۔ اس نے ایک نظامِ کائنات اور ایک ہی اس کا کارساز تسلیم کیا ہے۔ آج سائنس بھی اصولِ کائنات کی ہمہ گیری کی دعوےدار ہے۔ اسلام میں "لا الٰہ اللہ" کا اعلان بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور ایک دین کی ابدیت اس کے تصور میں شامل ہے۔ یوں تو ہر دور اور ہر اقلیم میں خدا کے پیغامبر آئے اور ہر ایک نے اپنے طریقے سے اپنے زمانے کے لوگوں کو خدا کا پیغام سنایا اور اس پر عمل کرنے کی تلقین فرمائی۔ لیکن اس زمان و مکان اور زبان و بیاں کے فرق کے باوجود دین اور پیامِ الٰہی ایک ہی رہا ہے۔ اس طرح اسلام نے کسی کو بانیٔ دین نہ بنایا اور نہ بتایا۔ ہمارے رسولِ کریمؐ کو 'خاتم النبیین' کہا گیا ہے۔ یعنی نبیوں میں ایک نبی، آخر الزماں نبیؐ۔ سرتاج نبیؐ۔ یہ بات اسلام کے قوانین کے عین مطابق ہے۔ اس طرح دین کی ابدیت، سالمیت اور آفاقیت برابر قرار رہتی ہے دین تو اقدارِ مطلقہ کا علمبردار ہوتا ہے۔ اس کے حقائق لازوال ہیں۔ حق کو ضرورتاً یا مصلحتاً وقتاً فوقتاً کم و بیش نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں 'حق و صداقت کے چراغ کی لَو مدھم ضرور پڑ گئی ہے اور اس کے نور کو پورے طور پر پھیلانے کی ضرورتیں اکثر پیش آئی ہیں۔ پس ایسے ہی موقعوں پر نبی اور رسول آتے رہے ہیں۔ انسانیت کی راہ پر چلنے کے لئے، رہنمائی درکار ہے۔ اس حاجت کی تکمیل اللہ نے نبوت اور رسالت کے ذریعے کی ہے۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں نے حق کی مدافعت کی ہے اور پیغامِ حق کو خلقِ خدا تک پہنچایا ہے۔ نبی اور رسول سب انسان ہیں۔ ہاں' بلاشبہ اپنے اپنے عہد کے سب سے اچھے اور سب سے سچے انسان۔ قرآن مجید نے بار بار جتایا ہے کہ رسولِ اکرم انسان ہیں تم جیسے ایک انسان۔ لیکن آج کے اخلاقی [illegible] سے آگے ہے'

جب تک معاملات کو کرامات نہ بنایا جائے، کچھ لطف ہی نہیں آتا۔ اس لئے سیرت پاک کے تذکرے میں بھی واقعات کے بجائے معجزات پر ہی زور دیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیرت پہلے تو روایت بنی اور اب حکایت بنتی جا رہی ہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اسلام نے دستِ قدرت کی کاریگری کے ابدی قوانین کو تسلیم کیا ہے اور واقعات کو ان کا تابع مانتا ہے۔ ہاں، بعض نکات کی فہم کے لئے عام فکرِ انسانی، قاصر رہی ہے۔ اور وہ نکتہ اس کے نزدیک معجزہ قرار پایا ہے۔ اس کے ادراک کے لئے ایک خاص قلب و نظر چاہیئے ہیں تو آں حضرت صلعم کی حیاتِ طیبہ پر توجہ کرنے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو سنوارنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسول کریم کی زندگی، فقر و استغنا کی زندگی تھی۔ اس میں ذاتی اغراض کی ذرا سی بھی کثافت شامل نہیں ہے۔ یہ فقر ہے جسے صرف 'افتقار الی اللہ' ہی کے الفاظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ در اصل اسی فقرِ نبوی میں وہ صفات آ جاتی ہیں جو اجتماعی زندگی کے لئے معجزہ ہیں۔ ان سے ہی ایک بے غرض اور پاک زندگی کا کامل نمونہ سامنے آتا ہے۔ آج کے انسان کی زندگی کا عام مقصد حصولِ دولت ہے جس کی بنا پر معاشرت اور معیشت کے نئے نئے مسائل اٹھے ہیں۔ سیرتِ رسولؐ میں مادی اقدار کی حقارت اور اقدارِ عالیہ کی تفسیر ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم درس یہ ملتا ہے کہ خواہشات اگرچہ نفسِ انسان کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں اور ان کی گرفت انسان پر بڑی مضبوط ہے لیکن یہ سب اس لئے ہے کہ انسان میں ایک ایسا انقلاب آئے جو وہ ان خواہشاتِ نفس پر اپنی گرفت مضبوط کر سکے۔ رسولِ کریم کی زندگی میں نہ تن پروری ہے اور نہ اقربا نوازی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کیسے کیسے با اصول لوگ، آج کی دنیا میں اسی ایک کمزوری کی بنا پر کس طرح بھٹکتے ہیں۔ لیکن رسولِ پاک کی زندگی میں بیٹی کے ساتھ کیا سلوک نظر آتا ہے۔ پدرانہ شفقت انتہا کی ہے لیکن [illegible] پر صدقہ بھی حرام فرمایا۔ اسی [illegible]

کلمہ حق کی ترویج کے لئے قطعی ناسازگار پاکر مدینہ کا رخ کیا تو حضرت علیؓ کو لوگوں کی امانتیں سپرد فرمائیں جبکہ دبا لینے کا نہایت ہی مناسب موقع تھا۔ ہجرت کے بعد مجبوری ولاچاری کا زمانہ ختم ہوا۔ مدینہ کی زندگی با اختیار اور با اقتدار زندگی ہے۔ مگر بے نفسی میں ذرا فرق نہیں آیا۔

اسلام، آخرت کی زندگی کے ساتھ ساتھ دنیاوی زندگی سے بحث کرتا ہے۔ اس نے شخصیت میں کامل اتحاد کی کارفرمائی چاہی ہے۔ یہاں نہ سیاست اور مذہب ایک دوسرے سے جدا ہیں، نہ تجارت اور عبادت ایک دوسرے سے الگ۔ اسلام نے عربوں کو نہ صرف قبائلی بلکہ نسلی تعصب سے بھی پاک کر دیا۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے حضرت بلالؓ کو غصے میں طعنہ دے دیا کہ ان کی والدہ سیاہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں ابھی تک جاہلیت کی بُو آتی ہے۔ اسلام نے انسانوں کے درمیان فضیلت کا صرف ایک معیار طے کیا ہے۔ اور وہ ہے تقویٰ۔ وہ رنگ و نسل کے امتیازات کا قطعی قائل نہیں۔ اسلام نے یہ بھی یاد دلایا کہ تمام انسان عالمی برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیئے۔ اسلام ترک دنیا کا سبق قطعی نہیں دیتا۔ وہ تو کہتا ہے کہ اس دنیا سے دین بنتا ہے۔ آخرت کی راہ اسی جہان سے ہو کر گزرتی ہے۔ حضور کا ارشاد ہے کہ لوگو! تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، اسلام جسم کو نظر انداز نہیں کرتا۔ حضور نے جسمانی صفائی ستھرائی کی تاکید فرمائی۔ آپ کا ارشاد ہے کہ "پاکی ایمان کا جزو ہے" اپنے گھروں کو کوڑے کرکٹ سے پاک صاف رکھا کرو۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ صحت جسمانی کے لئے جسمانی ورزش بھی ضروری ہے آنحضرتؐ نے خود ورزش کے مقابلوں میں شرکت فرمائی ہے۔ عجب معاملہ ہے کہ آج کچھ ایسی فضا قائم کر دی گئی ہے کہ صحت، تقویٰ کی ضد ہے، جو کمزور، ناتواں ہو، گوشہ نشین ہو۔ زندگی سے کترائے، اسی پر مرد مومن کا گمان گذرتا ہے۔

تہذیب کے اس دور میں صرف انسانی حقوق کی ہی بات نہیں ہوتی ہے بلکہ جانوروں کے حقوق کا بھی مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ہم جانوروں کے ساتھ مناسب برتاؤ کی تعلیم دیتے ہیں۔ اہل عرب

زندہ اونٹ کے کوہان اور دُنبے کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے۔ ایسے گوشت کو حضورؐ نے مردار کہا جانوروں کو باہم لڑاتے اور داغ دینے کی ممانعت فرمائی۔ بلا ضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانے کو نا جائز ٹھہرایا۔ جاندار کو بلا مصرف محض تفریحاً مارنے کی مذمت کی۔ آج ایسی باتوں کو ہم نئی روشنی سمجھ کر دیکھ لیتے ہیں۔ جبکہ یہ اسلامی معاشرے میں شامل ہیں اور ان پر عمل کرنا ہی چاہئے۔ اسلام میں حلال طریقے سے روزی کمانا اور رزق تلاش کرنا فرض ہے۔ اگر اس اصول کی ہم پابندی کرنے لگیں تو ذرا غور فرمایئے کہ معاشرت کی کیا تصویر نکھر کر سامنے آتی ہے۔ آں حضرت صلعم نے روزانہ زندگی کے معمولی معمولی کاموں میں حصّہ لیا۔ اور الکاسب حبیب اللہ، فرمایا یعنی کمانے والے اللہ کے دوست ہیں۔

کلام پاک میں مختلف طریقوں سے اکتسابِ علم پر زور دیا گیا ہے۔ رسولِ اکرم پر وحی کا آغاز ہی قرأت اور علم و قلم سے ہوا۔ حضورؐ نے تمام لوگوں کو علم حاصل کرنے کی تاکید فرمائی۔ عہد نبوی میں ہجرت کے بعد آں حضرتؐ نے مسلمانوں کی تعلیم کا ایک طریقہ اختیار فرمایا تھا۔ اسے اسلامی نظامِ تعلیم کی ابتدا کہہ سکتے ہیں۔ اس میں عورتوں کی تعلیم بھی شامل تھی۔ ہفتے میں ایک دن آپ، خواتین کے مخصوص اجتماع میں شرکت فرماتے۔ ان کو تعلیم دیتے اور ان کے استفسارات کا جواب دیتے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اسلام میں پہلی معلّمہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضورؐ نے ان سے علم حاصل کرنے کے لئے فرمایا۔ یوں تو مدینہ منوّرہ میں صحابہؓ کی کئی درس گاہیں تھیں لیکن مدرسہ عالیہ، مسجد نبوی تھی۔ لڑکے، عورتیں اور جن مردوں کا حضرت عائشہؓ سے پردہ تھا، وہ حجرے کے اندر آکر بیٹھتے۔ دوسرے لوگ حجرے کے سامنے مسجد نبویؐ میں تشریف رکھتے اور اسلامی تعلیم کا درس ام المومنین دیتیں۔ رسولِ پاک نے خاک مدینہ سے جو پہلی عمارت اپنے ہاتھوں سے بنائی، وہ یہی مسجد نبویؐ ہے، ہمارا پہلا مدرسہ۔ اس کے بعد جتنی مسجدیں دنیا میں تیار ہوئیں، ان سب سے مدرسے کا کام لیا گیا۔ استاد مسجد میں بیٹھ کر درس دیتا جو خالصاً للہ ہوتا۔ باقاعدہ مدارس کا آغاز چوتھی صدی ہجری سے ہوا۔

ہمیں یہ بات برابر اپنے ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اسلام کی پیروی، مسلمان بناتی ہے۔ یہ کوئی نسلی چیز نہیں کیونکہ ایک شخص اسلام قبول کر سکتا ہے اور ترک بھی۔ گویا اسلام، علم اور عمل کا نام ہے تعلیمات اسلامی کی ترویج کی ذمہ داری خصوصیت کے ساتھ ان حضرات پر رکھی گئی جنھیں نائبینِ رسولؐ کہا گیا ہے یعنی ہمارے عالمانِ دین۔ لیکن دراصل یہ اس وقت کی بات ہے جب تعلیم صرف عالمانِ دین کی ہی ذمہ داری تھی۔ آج دنیاوی تعلیم دینے والوں کا اپنا ایک بہت بڑا نظام ہے لیکن اگر وہ اسلام کے پیرو ہیں تو اُن پر بھی اس تعلیم کی ذمہ داری یقیناً آجاتی ہے جسے صرف عالمانِ دین کے فرائض میں داخل سمجھا جاتا ہے۔ یُوں بھی ایک اُستاد پر ذہنوں کی تربیت کا فرض عائد ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے کے لئے یہ منصبی ذمہ داری، مذہبی فریضہ اور عبادت بھی بن جاتی ہے۔ اس اہم فریضے کو پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں اپنے اعمال کی درستی درکار ہے۔ اسلام نے اخلاقِ حسنہ کو ایمان کی پہچان بتایا ہے اور اس کا نتیجہ کہا ہے۔ جس مسلمان کے اخلاق و اطوار جتنے اچھے ہوں، اتنا ہی اس کا ایمان مضبوط سمجھنا چاہیئے۔ رسولِ مقبولؐ کا ارشاد ہے کہ "اچھے خُلق ہی کو اسلام کہتے ہیں"۔ اخلاقی دولت سے بے نیاز ہو کر یا محروم رہ کر کوئی شخص صحیح معنی میں اُستاد، بن ہی نہیں سکتا۔ اُستاد کی مختلف خوبیاں اپنے اپنے انداز میں سب ہی تعلیمی نظام بیان کرتے ہیں نفسیات کے اس عہد میں شخصیت کی مناسب تشکیل کے لئے نمونے کے انسان کی بات بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اور مردِ کامل، کا تصور بھی پیش کیا جاتا ہے تاکہ کسی طور اقدار کی کوئی مجسّم شکل سامنے آسکے۔ اس باب میں عظیم شخصیتوں، کی مثال سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ لیکن پہلی صورت محض مثالی اور خیالی رہ جاتی ہے، دوسری ادھوری اور ایک رخی؛ تاہم تعلیمی اور نفسیاتی ضرورتیں ایک ہمہ صفت موصوف کا تصور قائم کرنے کی طرف برابر مائل کرتی رہتی ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنے آپ کو "سیرتِ پاک" سے نسبت دیتے ہیں یا کم از کم اس کا علم ہی رکھتے ہیں، انھیں خیالات کا طلسمی پیکر تعمیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس خُلقِ عظیم کو ہی سامنے رکھ کر اعمال پاکیزہ سیکھے اور سکھلائے جا سکتے ہیں۔ سیرتِ پاک میں انسانی

صفات کے تمام اعلیٰ ترین محاسن موجود ہیں۔ اور وہ ایک ہم آہنگ زندگی کا معیار پیش کرتے ہیں۔ بہت سے معلمین اخلاق اور رہبران مذہب کی زندگیوں کو انسانی جذبے کی ناآسودگی سے ردعمل کے طور پر تشکیل پانے والی زندگی کہا گیا ہے یا بالکل دوسری راہ اختیار کی ہے اور انسان کی صف سے ہٹا کر انہیں مافوق البشر شخصیت بنا دیا ہے۔ رسولِ کریم کی زندگی کا ان دونوں صورتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ انسان ہیں انسان کی معراج ! "معلم"

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

مکتوباتِ سلیمانی (جلد اوّل) از مولانا عبدالماجد دریا بادی

سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم ۲۹۸ صفحات، کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ، سنہ طباعت ۱۹۶۳ء
قیمت مجلد پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ :- صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ۔ لکھنؤ۔

جامعہ کے پچھلے شمارے میں زیر تبصرہ کتاب کا ذکر آچکا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنے قلم کے ذریعے علم و ادب، مذہب و ملت اور قوم و ملک کی جو بے لوث اور عظیم الشان خدمت کی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سید صاحب ان چند اصحاب قلم میں سے ہیں جنھوں نے اپنی عمر کے ایک ایک لمحے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور زندگی کی آخری سانس تک اپنے قلم کو علم و دین کی خدمت کے لئے وقف رکھا۔ ظاہر ہے ایسے مصنف اور عالم دین کی ایک ایک تحریر کس قدر اہم اور بایہ کی ہو سکتی ہے۔ ان کے کچھ مضامین کے مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔ ان کی بعد جہاں ان کے حالات زندگی لکھے گئے اور ان کے علمی کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی، وہاں ان کے خطوط بھی شائع کئے گئے۔ سب سے پہلے سید صاحب کے عزیز شاگرد اور مخلص معتقد مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے ان خطوط کا ایک مختصر مجموعہ شائع کیا، جنھیں سید صاحب نے مرحوم کو لکھا تھا، اس کے بعد معارف میں بہت سے خطوط شائع ہوئے اور اب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے ان خطوط کا مجموعہ شائع کیا [illegible] نے موصوف کو وقتاً فوقتاً لکھا تھا۔ مرحوم کے کل ۳۰۲ خطوط ہیں [illegible]

[illegible]

انھیں کے علاوہ اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے ساتھ بمبئی کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے، آخری خط ۱۹۵۳ء کا ہے، جو وفات سے چند ہفتہ قبل کراچی سے لکھا گیا ہے۔ فاضل مکتوب الیہ نے جابجا توضیحی حاشیے بھی لکھ دیے ہیں، جن سے ان خطوط کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس وقت پہلی جلد شائع ہوئی ہے، جس میں یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء سے ۴ فروری ۱۹۳۲ء تک کے ۲۳۰ خطوط شامل ہیں۔ شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے پیش لفظ بھی ہے، جس میں خطوط، خطوط کی بعض شخصیتوں خصوصاً مولانا ابوالکلام آزاد، مکتوب نگار کی شخصیت اور ان کے خیالات و افکار اور مکتوب الیہ و مکتوب نگار کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سید صاحب کے جتنے خطوط اب تک شائع ہوئے ان میں میرے خیال میں زیر تبصرہ خطوط سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ بقول فاضل مرتب "نشیب و فراز، پیچ و خم، جس طرح کہ بشری زندگی کا جزو ہوتے ہیں، ان کی پوری عکاسی ان خطوط میں بھی موجود ہے۔ ۲۷ سال کی عمر بھرپور جوانی کی عمر سے لے کر ۶۷ سال کی پختہ عمر تک جتنی منزلیں طے ہونے کی تھیں سب ہی کے نقشے ان صفحات میں آتے گئے ہیں۔ غم و غصہ، صدمات خانگی، شوخی و ظرافت، معاصرانہ چھیڑ چھاڑ، دینی حرارت، علمی سنجیدگی و متانت، ناگواری و طنز، سیاسی چاشنی سب ہی کی جھلکیاں اپنی اپنی جگہ ان اوراق میں محفوظ ملیں گی۔" (صفحہ ۷، ۸)

غرض یہ خطوط علمی، ادبی، تاریخی ہر لحاظ سے بہت اہم اور قابل مطالعہ ہیں۔

صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات (۱۸۴۸ء–۱۸۵۳ء) مرتبہ محمد عتیق

سائز ۲۰×۳۰/۸، حجم ۳۴۸ صفحات، کتابت و طباعت [illegible]
مجلد قیمت بارہ روپے۔ ناشر: انجمن ترقی اردو ہند [illegible]

محمد عتیق صدیقی صاحب محقق کی حیثیت سے [illegible]

دکھنے کے عہد میں) شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد موصوف کو حکومت صوبہ شمالی و مغربی کے مختلف محکموں کی سالانہ رپورٹوں کے انتخابات ملے، جو آج سے کوئی ایک صدی قبل ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئے تھے۔ ان ہی میں چھ سال کے یعنی ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۳ء تک موجودہ اتر پردیش دلی اور پنجاب کے مطابع اور اخبارات کی رپورٹیں بھی شامل تھیں۔ ان سے اس دور کی صحافتی اور ادبی تاریخ پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے اس لئے جناب عتیق صدیقی صاحب نے نئی ترتیب کے ساتھ ان رپورٹوں کا ترجمہ زیر تبصرہ کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ زیر بحث موضوع سے متعلق دوسرے ذرائع سے اگر کوئی مفید بات معلوم ہوئی ہے، تو اس کا بھی حاشیہ میں ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب کی افادیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ کتاب جہاں اردو صحافت کے اسکالر کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے، وہاں عام پڑھنے والوں کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

مفتاح القرآن

از خدیجہ بنت سیدنا طاہر سیف الدین طع

سائز ۲۰×۳۰/۸، حجم ۳۶ صفحات۔ کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ۔ سنہ طباعت جون ۱۹۶۲ء ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

زیر تبصرہ رسالہ گجراتی میں لکھا گیا ہے اس کے ذریعے نو عمر بچوں اور کم پڑھے بالغوں کو قرآن حکیم کو صحت کے ساتھ پڑھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ موصوفہ نے اس سے قبل بھی اردو اور گجراتی میں ترتیل القرآن نام سے کتاب لکھی تھی جس کا جامعہ میں تعارف کیا جا چکا ہے۔ امید ہے کہ گجراتی زبان کے جاننے میں موصوفہ کی یہ کوشش کامیاب اور مقبول ہوگی۔

کوائف جامعہ

جناب حامد علی خاں صاحب کا انتقال پُر ملال

جناب حامد علی خاں صاحب کا ۵ دسمبر کو اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ۵۸ سال کی عمر میں پیرس میں انتقال ہوگیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کی عرصے سے صحت اچھی نہیں تھی اس سے پہلے دو مرتبہ قلب پر حملے ہو چکے تھے، مگر پھر بھی جس وقت انتقال ہوا کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ اس طرح اچانک ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ انتقال کی خبر جامعہ میں حیرت کے ساتھ سنی گئی اور ہر طرف رنج و غم کی فضا چھا گئی۔ ۱۵ دسمبر کو مرحوم کی میت بذریعہ ہوائی جہاز جامعہ نگر لائی گئی۔ ہوائی جہاز بعد مغرب پالم ہوائی اڈے پر پہنچا۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب، خازن جامعہ کرنل بشیر حسین زیدی اور جامعہ کے استادوں اور کارکنوں کے علاوہ یونسکو کے منتظم اعلیٰ مسٹر جے سوار برک، وزارت تعلیم کے جوائنٹ سکریٹری جناب آر پی نائک اور دو نمائندے شری تواری اور شری سیٹھی، مرحوم کے اعزا اور دوست احباب ہوائی اڈے پر اور دفن کے وقت موجود تھے۔

نائب صدر جمہوریہ اور امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی جامعہ نگر تشریف لائے اور نماز جنازہ میں شرکت کی۔ تابوت کے کھولنے میں کافی وقت لگا اور میت کوئی گیارہ بجے رات میں سپرد خاک کی جاسکی۔ مگر ڈاکٹر ذاکر صاحب آخر تک موجود رہے اور دعائے مغفرت میں شرکت کرنے کے بعد واپس گئے۔

منعقد کی گئی اور ہوائی اڈے پر جانے کے لئے جلسے کو کارروائی مکمل کئے بغیر ملتوی کر دیا گیا تجویز تعزیت حسب ذیل ہے :۔

پیرس سے یہ افسوسناک اطلاع موصول ہوئی کہ انجمن جامعہ کے حیاتی رکن جناب حامد علی خاں صاحب کا انتقال ہو گیا ہے ۔ اناللہ

موصوف نے تقریباً تیس سال جامعہ کی خدمت کی ۔ آپ کی مخلصانہ کوششوں سے مکتبہ جامعہ کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی اردو کی کتابوں کے گٹ اپ میں خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور یونسکو کے ذریعے جامعہ اور ملک کا نام روشن ہوا۔ موصوف کی اچانک اور بے وقت وفات سے جامعہ، اردو ادب اور یونسکو کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی بہت مشکل ہے۔

مرحوم کی اہلیہ اور ان کے لڑکوں اور لڑکیوں سے ہمیں دلی ہمدردی ہے اور ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں ۔ خدا سے دعا ہے کہ ان کے پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ۔ آمین !

انجمن اساتذہ نے ۱۸ دسمبر کے جلسے میں حسب ذیل تجویز منظور کی :۔

انجمن اساتذہ کا یہ جلسہ جامعہ کے قدیم طالب علم اور اس کے حیاتی رکن انجمن اساتذہ کے ممبر اور مکتبہ جامعہ کے سابق مینجنگ ڈائرکٹر جناب حامد علی خاں صاحب کی اچانک اور بے وقت موت پر اپنے گہرے افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم نے تقریباً تیس سال تک جامعہ کی بے لوث خدمت کی اور اپنی اہلیت اور قابلیت کے ذریعے اردو کتابوں کی نشر و اشاعت کا معیار اونچا کیا اور ساتھ ہی ساتھ جامعہ کا نام بھی روشن کیا۔

یہ جلسہ مرحوم کے پس ماندگان سے اپنی گہری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور ان کے غم میں شریک ہے ۔ خدا سے دعا ہے کہ پس ماندگان کو صبر کی توفیق عطا کرے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ۔ آمین ۔

کالج میں تین اہم تقریریں

کالج کے حلقہ مطالعہ ... جامعہ کے اساتذہ و تلامذہ [illegible]

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی زیرِ تصنیف کتاب "ہندوستانی مسلمان — آج اور کل" کے ابواب بڑی دلچسپی اور شوق سے سنے جاتے ہیں۔ ابھی حال میں موصوف نے اس کا ایک باب سیکولرزم پر پڑھ کر سنایا۔ اردو میں اس موضوع پر اتنا جامع اور عالمانہ مضمون اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ لیکن اساتذۂ جامعہ کے علاوہ پچھلے دنوں باہر کے تین مشاہیر نے حلقۂ مطالعہ میں تقریریں کیں جن کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی، صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی اور مدیر ماہنامہ "برہان" (دہلی) اسلامک اسٹڈیز کی نصاب کمیٹی کے جلسے میں شرکت کرنے کے لئے جامعہ تشریف لائے تھے۔ کالج کے پرنسپل کی خواہش پر ایک پرمغز اور دلنشیں تقریر کی۔ مولانائے محترم نے اپنی تقریر میں شرعی قوانین کے شرائط، ان کے اصول اور ان کے مآخذ پر تفصیل سے بحث کی اور تاریخی واقعات اور مثالوں سے متعلقہ مسئلے کی پوری طرح وضاحت کی۔ تقریر کے بعد بہت سے سوالات کئے گئے۔ آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے موضوع زیرِ بحث پر اظہار رائے کرتے ہوئے ان مشکلوں کی طرف توجہ دلائی جو موجودہ زمانے کے بہت سے مسائل کے سلسلے میں فقہی اجتہاد میں اس وجہ سے پیش آتی ہیں کہ ایسے لوگ موجود نہیں جو علوم دینی اور دنیوی کے جامع ہوں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، جناب ضیاء الحسن فاروقی پرنسپل کالج کی دعوت پر جامعہ تشریف لائے اور اپنے حالیہ دورۂ یورپ پر اختصار کے ساتھ اپنے تاثرات بیان کئے۔ فاضل مقرر نے جہاں انگریز قوم کے بلند کردار اور اس کے نظم و ضبط کی تعریف کی وہاں مغربی تہذیب کی خامیوں اور اس کی بے اعتدالیوں کی مذمت بھی کی۔

پروفیسر آغا مہدی حسین، نے "تغلق دورِ حکومت پر نئی روشنی" کے عنوان سے کالج کے حلقۂ مطالعہ میں ایک دلچسپ اور پُر از معلومات تقریر کی۔

موصوف نے سنسکرت کے مآخذ کی مدد سے تغلق دورِ حکومت پر ریسرچ کی ہے۔ راقم الحروف [illegible] تغلق کے عروج و زوال کے عنوان سے ۱۹۳۵ء [illegible]

پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھا تھا جو ۱۹۳۸ء میں لندن یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوا تھا ابھی حال میں اسی کو مزید تحقیق و تلاش کے بعد "تغلق ڈائینسٹی" (سلاطین تغلق) کے نام سے شائع کیا ہے[1]۔ جس میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو سلاطین تغلق اور بالخصوص محمد بن تغلق کے متعلق بہت سی تاریخی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں۔

پروفیسر محب الحسن صاحب نے، جن کا ابھی حال میں جامعہ کے شعبۂ تاریخ میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا ہے، فاضل مقرر کے تعارف میں فرمایا کہ مہدی حسین صاحب ان چند مورخوں میں ہیں جنھوں نے ہندوستانی تاریخ پر بڑی محنت، خلوص اور دیانتداری کے ساتھ کام کیا ہے اور بہت سی تاریخی غلطیوں پر سے نقاب اٹھایا ہے۔ ہندوستانی مورخوں میں شاید ہی کسی کو اتنی زبانوں پر عبور حاصل ہو، جتنا موصوف کو حاصل ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں ہندی، بنگالی اور سنسکرت سے، مشرقی زبانوں میں عربی اور فارسی سے اور مغربی زبانوں میں انگریزی، فرنچ اور اطالوی وغیرہ سے بخوبی واقف ہیں۔ (ع ل ا)

اُستادوں کے مدرسہ میں یوم مولانا آزاد

۸ دسمبر ۱۹۶۳ء کو شام کے چار بجے آزاد ہاؤس کی طرف سے یوم آزاد منایا گیا جلسے کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب نے فرمائی۔ جلسے کا آغاز ڈاکٹر سلامت اللہ کی تعارفی تقریر سے ہوا۔ اس کے بعد عبداللہ ولی بخش قادری نے مولانا آزاد پر ایک مضمون پڑھا جس میں ان پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا تھا جن کا تعلق مولانا آزاد کی تعلیمی سرگرمیوں سے تھا۔ اور خاص طور سے اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ مولانا آزاد، آزاد ہندوستان کے تعلیمی نظام کے پہلے معمار تھے۔ اس کے بعد بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ نے مولانا آزاد کی شخصیت پر ایک مضمون پڑھا

---

[1] انگریزی کی یہ کتاب ۱۸×۲۲/۸ کے سائز پر ۶۷۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ متعدد سلاطین تغلق اور اہم تاریخی عمارتوں اور سکوں کی آرٹ پیپر پر تصاویر بھی شامل ہیں۔ قیمت مجلد تیس ۳۰ روپے۔
ناشر:- Thacker Spink & Co. 3 Esplanade East Calcutta-1

مولانا آزاد کو صالحہ صاحبہ کے خاندان سے بہت محبت تھی اور اس کا انھوں نے وقتاً فوقتاً اظہار بھی کیا۔ اس مضمون میں اس پہلو کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ مضامین کے درمیان میں دو نظمیں پڑھ کر سنائی گئی۔ مصطفےٰ علی صاحب متعلم بی ایڈ نے اردو میں مولانا آزاد پر ایک نظم پڑھ کر سنائی اور ڈی ایم اجولی صاحب نے انگریزی میں اپنی ایک نظم بہت ہی موثر پیرایے میں سنائی۔

آخر میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ عام طور سے جب ہم کسی شخص کو دیکھتے ہیں چاہے وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو تو ہم اس کی اصل صورت کو دیکھنے سے گریز کرتے ہیں اور اس کو اس طرح آراستہ کر کے پیش کرتے ہیں کہ وہ صورت دیدہ زیب ہو جائے۔ اس طرح حقیقت چھپ جاتی ہے اور صحیح شکل نظر نہیں آتی۔ مولانا آزاد کو صحیح رنگ میں دیکھنے کا وہ زمانہ تھا جب وہ سیاست کے میدان میں آئے۔ وہ زمانہ ان کے لئے بڑی آزمائش کا زمانہ تھا۔ مجیب صاحب نے مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ باوجودیکہ مولانا آزاد ہندوستان کے ہردلعزیز لوگوں میں سے تھے لیکن سیاست ہی کی وجہ سے وہ اکیلے رہ گئے۔ ۲۴ء سے ۱۹۴۷ء تک وہ سیاسی کارواں کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی تنہا رہے۔ لیکن میرے دل پر یہ بات اس طرح نقش ہے کہ وہ اس کے بعد بھی تنہا رہے۔ دراصل یہی ان کی شان تھی۔ مولانا آزاد اپنے خاندان میں بھی تنہا رہے۔ وہ جس طرح اپنے خاندان سے الگ ہوئے وہ بھی ہمارے لئے ایک سبق ہے۔ ان کی ابتدائی زندگی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خاندانی روایات کو ٹھیس پہنچائے بغیر حقیقت کا اظہار کیا لیکن اس طرح کہ خاندان کا لحاظ باقی رکھا۔ یہ کام بہت مشکل تھا لیکن مولانا نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ پروفیسر محمد مجیب نے مولانا کے جمالیاتی ذوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا کا جمالیاتی ذوق بہت نمایاں تھا۔ انھیں موسیقی کا شوق تھا اور اس شوق کو انھوں نے پورا بھی کیا۔ ان باتوں کی طرف ان کا ذہن بہت صاف

تھا لیکن مسلمانانِ ہند کے خیالات کو دیکھتے ہوئے وہ صاف صاف بیان نہیں کر سکتے تھے۔ مولانا نے اس زمانے کے حالات یا اس کے بعد کے جو حالات بیان کئے ہیں وہ ایک طرح کا آئینہ ہیں، جن میں ہم اپنے آپ کو بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ دراصل ہم میں سے ہر ایک، دوسرے کے لئے آئینہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ چھوٹا آئینہ ہو چاہے بڑا، ہر آدمی اس آئینے میں اپنی زندگی تو نہیں لیکن کچھ اپنے حسن و جمال کو ضرور جانچ سکتا ہے۔

مجیب صاحب نے گاندھی جی سے مولانا کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا آزاد گاندھی جی سے اختلاف کرنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ انڈیا ونس فریڈم میں بہت صاف طریقے سے اس کا اظہار ہے کہ وہ گاندھی جی کے اندھے مقلد نہیں تھے۔ مجھے یہ ہمت کبھی نہیں ہوئی کہ آشرم میں سگریٹ پیوں لیکن مولانا آزاد گاندھی جی کی بغل میں بیٹھ کر سگریٹ پیتے تھے۔ مولانا جب بھی آشرم میں آتے تو گاندھی جی خود ہی ان کے لئے ایش ٹرے رکھوا دیتے۔ اہنسا گاندھی جی کا خاص مسلک تھا لیکن مولانا اس سے اختلاف کرتے تھے۔ ۱۴ اگست کو ہندوستان کی آزادی کا جب اعلان ہوا تو آئین ساز اسمبلی کے تمام اراکین خوش تھے اس مجمع میں صرف ایک غمگین صورت تھی اور وہ مولانا آزاد تھے۔ اس لئے کہ وہ آزادی کی اتنی قیمت نہیں دینا چاہتے تھے کہ ملک تقسیم ہو جائے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم ملک تقسیم کرنے پر مجبور نہیں تھے۔ یہ بات انھوں نے اپنی زبان میں کہی بھی۔ یہ بہت بڑی ہمت کا کام ہے۔

آخر میں پروفیسر مجیب نے مولانا آزاد کا پنڈت نہرو سے جو تعلق تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے وزیرِ اعظم کو مولانا آزاد کا بہت بڑا سہارا تھا۔ اتفاق کرنے والے بہت مل جاتے ہیں لیکن خلوص سے اختلاف کرنے والے بہت کم نظر آتے ہیں مولانا آزاد پنڈت جی کے سچے مشیر تھے۔ وہ مسائل پر بغیر کسی بات کا خیال کئے ہوئے آزادانہ رائے دیتے تھے۔ اسی ضمن میں مجیب صاحب نے سکھوں سے مولانا آزاد کے جو تعلقات تھے

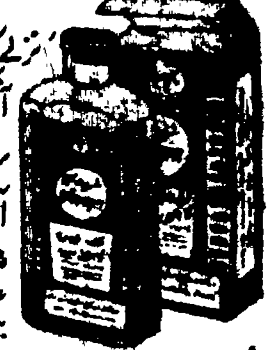
[illegible] ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ان کی موت کا سب سے زیادہ صدمہ سکھوں کو ہوا۔ کیونکہ سکھوں کو ان پر بھروسہ تھا۔ سکھ سمجھتے تھے کہ مولانا آزاد کبھی بھی ان کے لئے بُرا نہ سوچیں گے۔ اس خیال کے پیچھے دراصل مولانا آزاد کی صاف بیانی تھی۔

اس موقع پر مولانا آزاد کی تصانیف اور مولانا آزاد سے متعلق کتابوں کی نمائش بھی کی گئی تھی۔ جناب جنید الحق صاحب، استاد ٹیچرس کالج اور محمد اشرف صاحب سکریٹری آزاد ہاؤس کی کوششوں سے یہ نمائش بہت کامیاب تھی۔ (معین الدین)

نزلے کا حملہ اور بچاؤ



نزلے کا حملہ شدید ہو یا ہلکا سخت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ آنکھوں میں جلن اور حرارت ناک اور گلے میں خراش سر اور پورے جسم میں درد اور طبیعت مضمحل ہو تو یقیناً آپ پر نزلہ کا حملہ ہو گیا ہے۔ ان تمام حالتوں میں شربت نزلہ ایک بہترین دوا ہے یہ گل بنفشہ، کشمیری اور دوسرے مفید اجزا سے تیار کیا جاتا ہے۔ ہر جگہ ایجنسیاں قائم کی جا رہی ہیں۔



دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یو۔ پی)

ایجنٹ اور اسٹاکسٹ (۱) لکھیم پور کھیری۔ بھارتی دواخانہ (۲) ہردوئی۔ دواخانہ معین الصحت صدر بازار (۳) مالیگاؤں ناسک نیشنل میڈیکل اسٹور تلک بازار (۴) ناگپور۔ پولیس لائن روڈ (۵) پوری (گڑھوال) حکیم فضل حسین اپر بازار۔

"شاعر" کی چونتیس سالہ ناقابلِ فراموش ادبی روایات کے بعد وسطِ جنوری میں اس کی

۳۵ ویں سالگرہ پر پیش کیا جا رہا ہے

سالنامہ ۱۹۶۴ء

شعر و ادب اور افسانہ و ڈرامہ کا حسین و جمیل مرقع۔

مشاہیر اہلِ قلم کی تازہ نگارشات

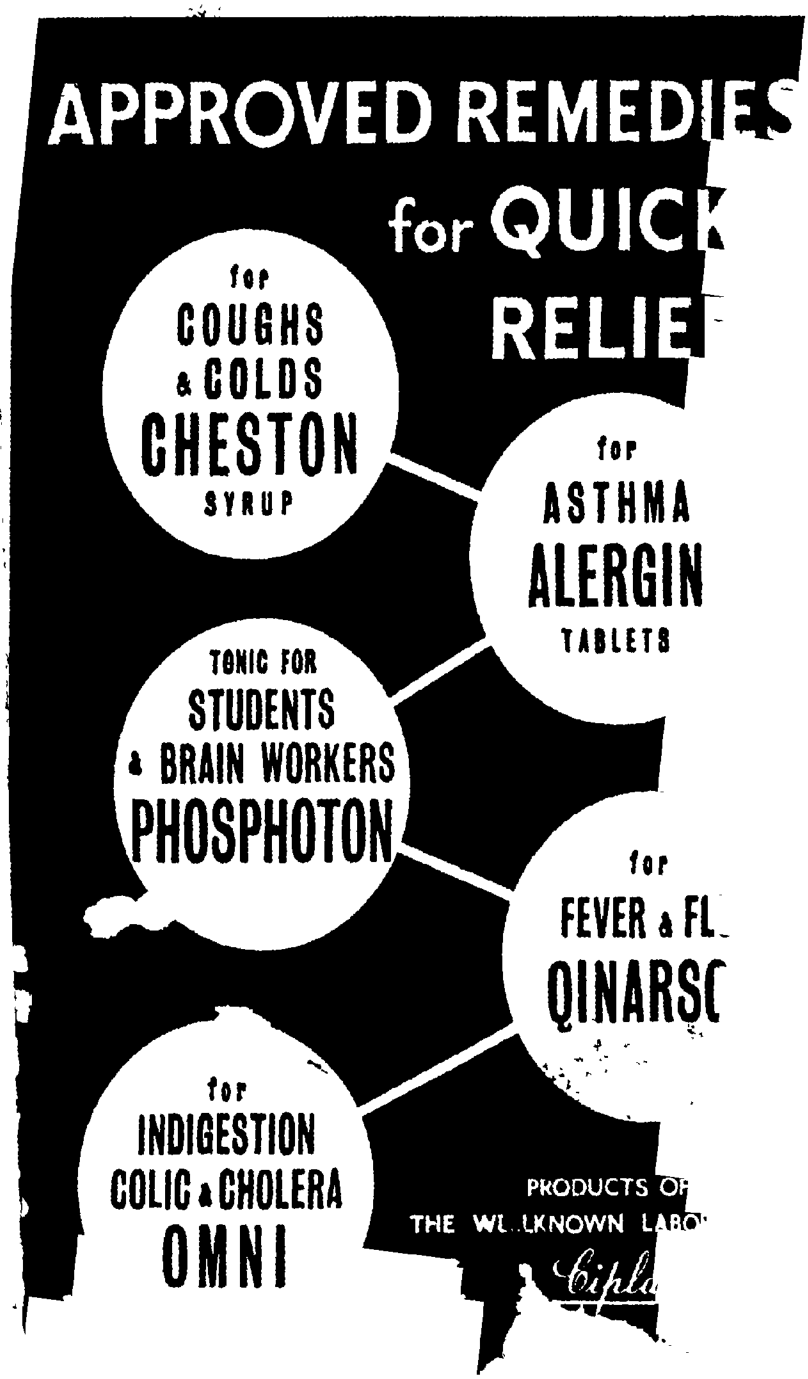
جدید آرٹ کا ایک یادگار سلسلہ مع تصاویر، تنقید و تحقیق اور طنز و مزاح کا بیش قیمت مواد مشاہیر کے چند پرانے خطوط انہی کے اندازِ تحریر میں اور کئی دوسرے علمی و ادبی جواہر پارے

خوبصورت رنگین سرورق ۔ ۱۱۴ صفحات ۔ قیمت صرف ایک روپیہ

منیجر ماہنامہ "شاعر" مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۸

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی ۔ مطبوعہ یونین پریس دہلی ۔ ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

The Monthly JAMIA
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25



جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ

مستشرقین کی بین اقوامی کانگریس نمبر

جامعہ

جلد ۵۱ | بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۶۴ء | شمارہ ۲

فہرست مضامین

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس

جناب ضیاء الحسن فاروقی

امسال ۴ جنوری ۱۹۶۴ء سے ۱۰ جنوری ۱۹۶۴ء تک مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس کا چھبیسواں اجلاس وگیان بھون، نئی دہلی، میں منعقد ہوا، عالموں کے اس اجتماع میں ۹۴ ملکوں کے ۱۳۱۸ مشاہیر شریک ہوئے۔ ان کی تقسیم حسب ذیل تھی:

ڈیلیگیٹ ۱۰۹۴

ایسوشی ایٹ ممبر ۱۴۴

آبزرور ۸۰

اس موقع پر مختلف سیکشن میں کوئی آٹھ سو مقالے پیش ہوئے، ان میں بعض ایسے بھی تھے جو نہیں پڑھے گئے کیونکہ ان کے مصنف کسی وجہ سے کانگریس میں شریک نہیں ہو سکے یا اس وقت موجود نہیں تھے جب ان کے پڑھنے کی باری آئی، کانگرس کو دس حصوں یا سیکشنز میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور مقالوں کی تقسیم بھی عنوانات کے پیش نظر دس حصوں میں کی گئی تھی، ان کی تقسیم اس طرح تھی:

۱۔ مصریات (Egyptology)

۲۔ سامی علوم (Semitic Studies)

۳۔ حطی اور کاکیشیائی علوم (Hittite and Caucasian Studies)

۴۔ التائی علوم و ترکیات (Altaic Studies Including Turcology)

۵۔ ایرانی علوم (Iranian Studies)

۶- انڈولوجی (INDOLOGY)

ا - ویدک علوم اور سندھی تہذیب

ب - کلاسیکی سنسکرت

ج - مذہب وفلسفہ

د - تاریخ وتہذیب

ہ - جدید ہندوستانی زبانیں اور زبانوں کا تقابلی مطالعہ

۷- علوم متعلق بہ جنوب مشرقی ایشیا (SOUTH-EAST ASIAN STUDIES)

۸- علوم متعلق بہ مشرقی ایشیا (EAST ASIAN STUDIES)

۹- علوم اسلامیہ (ISLAMIC STUDIES)

۱۰- علوم افریقیہ (AFRICAN STUDIES)

مقالے اچھے بھی تھے اور بُرے بھی، نمایندوں کا خیال تھا کہ مقالوں کی کثرت کی وجہ سے بحث ومباحثہ کے لئے کافی وقت نہیں ملا، ایسے اجتماعات میں بحث مباحثہ اور تبادلۂ خیالات کے بغیر کسی کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا، نہ تو مقالہ پڑھنے والوں کو اور نہ سننے والوں کو، کسی زیر بحث موضوع پر جب تک مختلف زاویوں سے روشنی نہ ڈالی جائے اور قاری وسامع میں علمی لین دین کا کوئی موقع نہ ہو تو بات یک طرفہ رہ جاتی ہے اور موضوع تشنہ، اس لئے نمایندوں کا عام رجحان یہ تھا کہ مقالوں اور مقالہ نگاروں کو پہلے جانچ لینا چاہیے کہ مقالوں کا کیا معیار ہے اور مقالہ نگار کس حیثیت کے ہیں، چنانچہ کانگریس کے عام اجلاس میں بھی یہ بات کہی گئی لیکن بعض نمائندے اس کی موافقت میں نہیں تھے، ان کا خیال تھا کہ اس صورت میں جانبداری کا اندیشہ ہے اور بعض اچھے اور معیاری مقالے نظریاتی تعصب کا شکار ہو سکتے ہیں اس لئے اجلاس عام میں اس پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا اور یہ معاملہ مشاورتی کمیٹی کو سونپ دیا گیا۔

کانگریس کے جو دس شیکشنز تھے ان کی صدارت کا بارگراں ان غیر ملکی عالموں کے کاندھوں پر ڈالا گیا تھا جو اپنے فن میں بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں، ان کے ساتھ ایک ایک سکریٹری بھی تھا اور یہ سب ہندوستانی تھے، اس انتظام سے کافی سہولت رہی اس موقع پر دو سیموزیم بھی ہوئے ایک کا عنوان تھا۔ 'ROLE OF ORIENTAL STUDIES IN THE HUMANITIES'

اس کی صدارت پروفیسر ہمایوں کبیر نے کی اور تری رسالے گھوش نے سکریٹری کے فرائض انجام دئے، اس سیموزیم میں پروفیسر سونیتی کمار چیٹرجی، پروفیسر فلیوزات، پروفیسر بشیم اور پروفیسر نارمن براؤن، خاص مقرر تھے، مقصد یہ تھا کہ مذہبیات، ادبیات، فلسفہ اور فنون لطیفہ کی تعلیم کے سلسلے میں علوم مشرقیہ کی حیثیت متعین کی جائے، ادھر کچھ عرصہ سے سوویٹ یونین اور امریکہ کو چھوڑ کر مغربی دنیا میں علوم شرقیہ سے دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے اور یہ صورت حال افسوسناک ہے، آج اس کی زیادہ ضرورت ہے کہ ایشیائی ملکوں کی تاریخ، جغرافیہ، ادب، مذہب، آرٹ اور کلچر کا مطالعہ کیا جائے ورنہ مغربی تہذیب مفلس ہو کر رہ جائے گی، عالمی تاریخ کا مطالعہ اس طرح ہونا چاہیئے کہ دنیا کی تمام قوموں نے اپنی استطاعت کے مطابق انسانی تہذیب کی ترقی میں حصہ لیا ہے، تمام تہذیبوں نے ماضی سے استفادہ کیا ہے، آج کے انسان کو خواہ اُس کا تعلق مغرب سے ہو یا مشرق سے، اس تاریخی حقیقت سے واقف ہونا چاہیئے ورنہ وہ عہد جدید کو نہیں سمجھ سکتا، ایشیائی ملکوں میں جب یورپین اقوام کا سیاسی اثر پھیلا تو انھوں نے مشرق کی مختلف تہذیبوں، ادبیات، فلسفہ اور فنون کا مطالعہ شروع کیا اور مغرب کو اس بات سے آگاہ کیا کہ مشرق میں حسن اور علم کی کیسی کیسی دنیائیں ہیں، اس سلسلہ میں مغربی عالموں نے بڑی جدوجہد کی اور اپنی عمریں کھپا دیں، یہاں تک کہ ایک حد تک مشرق کو بھی اپنے تہذیبی خزانے کا علم انھیں کی بدولت ہوا، لیکن اس سب کے باوجود ابھی تک وہ آدرش جو مشرق کی تہذیبوں کی جان ہیں مغرب کی ذہنی دنیا میں اپنا مناسب مقام نہیں حاصل کر سکے ہیں، انسانیت ایک ہے، مسلک انسانیت ایک ہے، اس لئے انسان کی علمی، فنی اور تہذیبی دولت بھی ساری انسانیت کی

مشترک میراث ہے، اس لئے مغرب اور مشرق کی تمام قوموں کو ایک دوسرے کا احسان مند ہونا چاہیئے مشرقی علوم مغرب کے تعلیمی اداروں میں پڑھے جائیں اور مغربی علوم مشرق کی درسگاہوں کے نصاب کا لازمی جزو بن جائیں، انسانی اقدار اور بین الاقوامی مفاہمت کے شریفانہ جذبے کو اسی طرح تقویت بخشی جا سکتی ہے۔

دوسرا سیمپوزیم CHANGES IN MUSLIM PERSONAL LAW کے موضوع پر تھا، اس کے صدر مرکزی وزیر تعلیم مسٹر چھاگلہ تھے اور سکریٹری پروفیسر محمد مجیب، اس کے خاص مقررین حسب ذیل تھے :-

(۱) مولانا سعید احمد اکبر آبادی (علی گڑھ)

(۲) ہز ایکسیلنسی مسٹر سیف اللہ ایسن (سفیر ترکی)

(۳) ہز ایکسیلنسی مسٹر احمد حسن الفقیہہ (سفیر متحدہ عرب جمہوریہ)

(۴) مسٹر میر اقبال حسین (بنگلور)

(۵) پروفیسر سید حسین نصر (ایران)

(۶) پروفیسر اینڈرسن (لندن)

جناب صدر نے اپنی مختصر افتتاحی تقریر میں اس کی وضاحت کی کہ زیر بحث موضوع کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اس کا تعلق ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں سے ہے، لہٰذا یہ بات صاف ہو جانی چاہیئے کہ پرسنل لا، کی کیا حدود ہیں، اُن معاملات کے علاوہ جن کا تعلق خاص طور پر ذاتی عقیدہ اور اس کے متعلقہ اعمال سے ہے، فرد کی زندگی کے ہر مسئلہ کا اثر سماج اور ریاست پر پڑتا ہے، ہندوستان سیکولر ریاست ہے اس لئے ان قوانین پر کسی کمیونٹی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیئے جو فلاح عامہ کے پیش نظر وضع کئے جائیں، ایسے قوانین اور عدالتی فیصلے پہلے ہی سے موجود ہیں جن کی بنا پر مسلم پرسنل لا میں بڑی تبدیلی ہو گئی ہے اور آج بھی ہو رہی ہے، اس لئے یہ نقطہ نظر کہ یہ پرسنل لا مقدس ہے اور اس میں کوئی مداخلت نہیں کی جا سکتی، صحیح نہیں ہے، آخر میں انہوں

نے کہا کہ جہاں تک پرسنل لا کا تعلق ذاتی عقیدہ سے ہے اس میں کوئی مداخلت نہیں ہونا چاہیئے، باقی اور معاملات میں پارلیمنٹ کو یہ طے کرنے کا حق ہے کہ مجموعی طور پر قوم کے حق میں کیا چیز مفید ہے۔

مولانا اکبرآبادی نے دین اور شریعت کے فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ شریعتیں بدلتی رہی ہیں۔ انھوں نے امام ابو یوسفؒ کی یہ رائے نقل کی کہ جو شخص اپنے زمانے سے واقف نہیں ہے وہ شریعت کے معاملات میں رائے دینے کا اہل نہیں، انھوں نے منصوص اور غیر منصوص کے فرق کو بھی واضح کیا اور اس کی تائید کی کہ غیر منصوص معاملات میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے بشرطیکہ وہ اجتہاد قرآن اور سنت کے خلاف نہ ہو، مولانا کی یہ رائے تھی کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے اہل صرف حضرات علماء ہیں۔

ترکی اور متحدہ عرب جمہوریہ کے سفیروں نے اپنے اپنے ملک میں مسلم پرسنل لا میں تبدیلیوں کا ذکر کیا، سفیر ترکی نے کہا کہ حالات کے ساتھ یہ تبدیلیاں آئیں، ترکی کی نیشنل اسمبلی کی رائے کی وہی حیثیت قرار پائی جو اجماع کی ہے، انھوں نے فرمایا کہ جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ قرآنی تعلیمات اور انصاف و مساوات کے اصولوں کے مطابق ہوئی ہیں۔ سفیر متحدہ عرب جمہوریہ نے بتایا کہ مصر میں پرسنل لا سے متعلق جو قوانین بنائے گئے ہیں وہ قرآن و سنت کے مطابق ہیں، ہم لوگوں نے یہ طریقہ کار اختیار کیا کہ چاروں مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) اور شیعہ امامیہ فقہ کے اصولوں کو پیش نظر رکھا اور فلاح عامہ کے اصول کے تحت جہاں جو بات معقول ملی اسے لے لیا، انھوں نے اس کی کئی مثالیں دیں اور ثابت کیا کہ جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ شریعت کے حدود میں ہیں۔ میر اقبال حسین نے پورے طور پر انصاف و استحسان کے اصول پر تبدیلی کی حمایت کی، سید حسین نصر نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ مسلم پرسنل لا میں ہم جن تبدیلیوں کے خواہاں ہیں وہ کہیں اس لئے تو نہیں ہیں کہ ہم مغرب سے مرعوب ہیں اور اس کی تقلید کرنا چاہتے ہیں، اس کا عام چرچا ہے کہ قانون کو زمانہ کے ساتھ چلنا چاہیئے، اگر یہ بات ہے تو پھر زمانہ کس کے ساتھ چلے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ کیا اصول ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیئے، اسلام میں کوئی لا پرسنل لا نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام افراد اور سماج میں کوئی فرق نہیں کرتا، یہ بات

عیسائیت کے لئے تو آسان تھی کہ وہ جب چاہے اپنے لئے قانون وضع کرے کیونکہ عیسائی مذہب میں شریعت کا کوئی تصور نہیں ہے، لیکن اسلام کے لئے یہ اتنا سہل نہیں ہے۔ پروفیسر اینڈرسن نے پروفیسر نصر کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا اور اسلامی ملکوں کے قوانین میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ان پر بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی اور اس کی حمایت کی کہ فلاح عامہ کے اصول کے تحت اسلامی ملکوں میں تبدیلیاں ہوئی ہیں اور ہونی چاہئیں۔

کانگرس کے آخری عام اجلاس میں اس کا اعلان ہوا کہ کانگرس کا آئندہ اجلاس امریکہ میں ہوگا۔ کانگرس کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا اجلاس ایشیا میں ہوا، اور ایشیا کے اس ملک میں ہوا جو عہد عتیق ہی سے ایک خاص طرز زندگی اور نمایاں تہذیب کا حامل رہا ہے کانگرس میں یہ بات کہی گئی کہ اگرچہ اس موقع پر کوئی دور آفریں دریافت پیش نہیں کی گئی لیکن اس اجتماع سے بہت فائدے ہوئے۔ اس میں ہر شخص کو اپنے خیالات پیش کرنے اور تبادلہ خیالات کا پورا موقع نصیب ہوا، کسی قسم کی پابندی اور حوصلہ شکنی نہیں ہوئی۔ امسال پہلے کے مقابلے میں زیادہ نمایندے شریک ہوئے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا کی توجہ ان ملکوں اور علاقوں کی طرف ہے جو قدیم تہذیبوں کے گہوارے رہ چکے ہیں اور جہاں آج ایک نئی زندگی پروان چڑھ رہی ہے، یہ زمانہ تخصص کا ہے اور علم کے مختلف شعبوں اور مختلف علاقوں اور تہذیبوں سے متعلق محققین کے اس اجتماع کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں اور اپنے میدان تخصص سے باہر دوسرے علمی افق کے مناظر سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں، کچھ نئے محققین ہیں انھیں اپنے مضمون کے ان ماہرین سے ملنے اور ان کے علم و تجربے سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے، نئی راہیں ان کے سامنے کھلتی ہیں، سوچنے کے نئے طریقوں سے ان کی واقفیت ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں ان کے سمند شوق کے لئے تازیانہ ثابت ہوتی ہیں، اس لحاظ سے اور نظم و نسق کے نقطہ نظر سے ۔۔۔ غرض کسی زاویہ نگاہ سے دیکھیے تو نئی دہلی میں مستشرقین کا بین الاقوامی اجتماع بہت کامیاب رہا۔

کانگرس کے کئی سیکشنز میں میں نے مقالے سنے اور مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے یہاں مجموعی طور پر علم و فضل اور تحقیق و تلاش کا جو معیار ہے وہ ابھی عرصہ تک مغرب کے عالموں کے معیار تک نہیں پہنچ سکتا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب میں علمی کام کی جو گراں قدر روایات قائم ہو چکی ہیں ان کے پیچھے ایک دور گزر چکا ہے، علم اور تجربہ، مسلسل محنت اور مستقل شوق کا ایک سلسلہ ہے جو ایک عرصہ میں قائم ہوتا ہے، پھر مغربی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کے پاس جو وسائل ہیں وہ وافر ہیں، ان وسائل کو وہاں دیانتداری سے برتا جاتا ہے، ہمارے یہاں صورتِ حال مختلف ہے، اس لئے کہ ہماری تاریخ مختلف رہی ہے، ذہین لوگوں کی یہاں کمی نہیں ہے لیکن تنظیم نہیں، دیانتداری نہیں، محنت اور شوق کا وہ معیار نہیں، اس لئے ٹھوس علمی روایات کے قائم ہونے میں ابھی وقت لگے گا۔

کانگرس کی مختصر تاریخ

یہ تخیل کہ مستشرقین کی ایک بین الاقوامی کانگرس قائم کی جائے، فرانس کے متبحر عالم پروفیسر لیون ڈی روزنی (LEON DEROSNY) کا تھا، چنانچہ پہلی کانگرس کا انعقاد اسی کی صدارت میں ۱۸۷۳ء میں ہوا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی بنیاد اسی وقت پڑ چکی تھی جب ۱۷۸۴ء میں سر ولیم جونس نے کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی تھی، سر ولیم جونس فارسی، عربی اور سنسکرت کے بڑے عالم تھے اور مغربی دنیا کے ان افراد میں سے تھے جو ہیومانزم کے شیدائی تھے اور مشرق کی زبانوں اور ادبیات کے فدائی، وہ اپنے ہم عصروں میں اس بات کا سب سے زیادہ احساس رکھتے تھے کہ مشرقی علوم کا خزانہ بہت وسیع ہے اور مشرقی تہذیبوں کی خصوصیات گوناگوں، یورپ جس کے تعلقات مشرق سے بڑھ رہے ہیں، اگر ان تہذیبوں کو نہ سمجھ سکا تو یہ تعلقات سطحی ہوں گے اور ان کی بنیاد محض مادیت پر ہو گی، ذہنی و روحانی روابط قائم نہیں ہوں گے اور اس سے یورپ ہی کو نقصان پہنچے گا۔ اس طرح ایشیاٹک سوسائٹی جس کا مقصد ایشیا کے علوم

ادبیات، فنون، آثار اور تاریخ کے متعلق تحقیق و تلاش" تھا، ایک ایسا ادارہ تھا جس نے اہل یورپ کی توجہ اس اہم کام کی طرف مبذول کی اور پھر اس کے بعد انیسویں صدی کے نصف اول میں یورپ میں کئی ادارے اس طرز کے قائم ہوئے۔ مثلاً روس کی ایشیاٹک اکادمی (۱۸۱۰ء)، پیرس کی Societe Asiatique (۱۸۲۲ء) اور لندن کی روائل ایشیاٹک سوسائٹی (۱۸۲۹ء) وغیرہ۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) کے قیام کے بعد یورپ کی دلچسپی علوم شرقیہ میں بڑھی اور ایران، عراق، مصر اور ہندوستان کے متعلق نئے اور عظیم انکشافات ہوئے، اسی دوران اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ان طلباء اور معلمین کے لئے جو مختلف ملکوں میں مشرقی تہذیبوں سے متعلق علمی کاوشوں میں مصروف ہیں، باہم مل کر بیٹھنے کا کوئی انتظام ہو تو اس سے مفید نتائج برآمد ہوں گے، سب ایک دوسرے کے کام سے باخبر رہیں گے، تحقیق و تدقیق کے لئے نئی راہیں سامنے آئیں گی اور علمی لین دین کی ایسی فضا قائم ہوگی کہ علوم شرقیہ کے کاز کو تقویت ملے گی، یہی وہ طرز فکر تھا جس نے اس کانگرس کو جنم دیا اور اس کا سہرا اسی فرانسیسی عالم کے سر ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس پر کڑا وقت بھی گزرا اور لوگوں نے اس کی افادیت پر شبہ کیا، لیکن ہم شکر گذار ہیں میکس مُلر (MAX MULLER) اور دوسرے مستشرقین کے جنھوں نے اس کو ختم ہونے سے بچایا اور اپنی شخصیت اور دانش مندی سے اس کے مقاصد کی ایسی وضاحت کی کہ آج تک یہ نہ صرف قائم ہے بلکہ اس کی وجہ سے اورینٹیل اسٹڈیز کے کام کو بڑا سہارا اور بڑی ترقی ملی ہے۔

کانگریس نے اب تک جو تجویزیں پاس کی ہیں، اس کے مختلف سیکشنز میں جو مقالے پڑھے گئے ہیں، اور اس کی حوصلہ افزائی کے سبب مشرقی علوم و فنون اور تاریخ و ادبیات کا جو ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، ان سے اس کے کارناموں کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میکس مُلر نے ایک موقع پر کہا تھا:۔

"ہمارے مقالوں کو دیکھئے اور ہماری بحثوں اور تبادلہ خیالات کے طریقے پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ کس کس طرح اورینٹل اسکالرشپ کے اہم مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے

کہ ہماری کانگرس علوم شرقیہ کی تدوین و ترقی کی راہ میں دور آفریں ثابت ہوگی، کانگرس کے مختلف اجلاسوں میں ہم نے چونکا دینے والی باتیں بتلائی ہیں، ہم نے ثابت کیا ہے کہ ہم میں اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن ہم اپنے مخالفوں کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔"

شروع ہی میں کانگرس نے اپنے لئے کچھ قاعدے بنائے تھے، کچھ ضابطے مقرر کر لئے تھے، اور آج تک انھیں کے مطابق کام ہو رہا ہے۔ کانگرس کے سامنے ایک مسئلہ یہ تھا کہ اس کی زبان کیا ہو، پہلی کانگرس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ کانفرنس میں صرف دو زبانوں کا استعمال ہوگا، ایک فرانسیسی ہوگی اور دوسری اس ملک کی زبان ہوگی جہاں کانگرس کا اجلاس ہوگا لیکن بعد میں اس سے دشواریاں پیدا ہوئیں اور یہ طے ہوا کہ جس کسی کا جس زبان میں جی چاہے اظہار خیال کرے، لیکن اب عام طور پر تین زبانیں ——— انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ——— استعمال کی جاتی ہیں، ویسے کسی زبان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ پہلے عورتیں کانگرس کے اجلاسوں میں شریک نہیں ہو سکتی تھیں لیکن اب یہ حق انھیں بھی مل گیا ہے اور وہ بھی اس میں شرکت کرتی ہیں۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کانگرس میں مختلف سیکشنز ہوتے ہیں اور شروع ہی سے یہ اصول رہا ہے کہ ہر سیکشن کی صدارت ایک ایسا عالم کرتا ہے جو اس سیکشن کے موضوع پر عالم گیر شہرت کا حامل ہوتا ہے۔

پہلے مصریات، اسلامی علوم اور دوسرے موضوعات کے تحت افریقہ پر بھی گراں قدر مقالے پڑھے جاتے تھے اور ان کی وجہ سے علوم افریقیہ سے متعلق علمی کاوشوں کی ایک روایت قائم ہو چکی تھی لیکن اب جب کہ افریقہ بیدار ہو گیا ہے، افریقی اقوام اپنے ماضی سے واقف ہونے کے لئے بے چین اور مستعد ہیں اور افریقہ کی تاریخ، تہذیب اور فنون پر کام کرنے والوں نے اپنی الگ کانگرس بنالی ہے، تو مستشرقین کی کانگرس نے بھی ۱۹۶۰ء میں اپنے ماسکو کے اجلاس میں یہ طے کیا ہے کہ اس کا ایک سیکشن علوم افریقیہ سے بھی متعلق ہوگا، دونوں علمی انجمنیں ہیں اس لئے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہاں مستشرقین کی کانگرس کا یہ سیکشن افریقہ اور ایشیا

کے مابین ایک رابطہ کا کام دے گا۔

اب تک کانگرس کے چھبیس اجلاس ہو چکے ہیں، عام طور پر دو یا تین سال کے بعد اس کے اجلاسات ہوتے رہتے ہیں علاوہ دو عالم گیر لڑائیوں کے زمانے کے جب یہ وقفہ طویل ہو گیا تھا، اس کو قائم ہوئے نوے سال (۱۸۷۳ - ۱۹۶۳ء) ہو چکے اور اس عرصہ میں اس نے نہ صرف مغربی دنیا کو مشرق کے علمی، فنی اور تہذیبی کارناموں سے روشناس کرایا بلکہ اس کے پلیٹ فارم پر مشرق کے عالموں نے بھی اپنی تاریخ اور تہذیب سے آگاہی حاصل کی، اس کی کاوشوں کے طفیل ہیومانزم (HUMANISM) کی قدروں کو سہارا ملا، اور آج جب دنیا کی قومیں ایک دوسرے کے قریب آ رہی ہیں، اس کے سہارے ایک عالمی تہذیب کے نصب العین کو بڑی تقویت مل سکتی ہے۔

ذیل کی تفصیل سے یہ معلوم ہوگا کہ مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس کب اور کہاں ہوئی اور اس کے مختلف اجلاسوں کی صدارت کن لوگوں نے کی :-

(۱) ستمبر ۱۸۷۳ء، پیرس، پروفیسر لیون ڈی روزنی

(۲) ستمبر ۱۸۷۴ء، لندن، ڈاکٹر سیموئل برچ۔

(۳) ستمبر ۱۸۷۶ء، سینٹ پیٹرس برگ، کاونٹ ورن زوف، صدر منتخب ہوئے لیکن شریک نہ ہو سکے۔

(۴) ستمبر ۱۸۷۸ء، فلورنس، کوئی صدر نہیں تھا، اور ہر سیکشن نے اپنے طور پر کام کیا۔

(۵) ستمبر ۱۸۸۱ء، برلن، ڈاکٹر ڈلمن

(۶) ستمبر ۱۸۸۳ء، لیڈن، پروفیسر کوئنن

(۷) ستمبر - اکتوبر ۱۸۸۶ء، وی انا، بیرن فان کریمر

(۸) ستمبر ۱۸۸۹ء، اسٹاک ہوم (سویڈن) اور کرسچیانا (ناروے)، کوئی صدر نہیں تھا۔

(۹) ستمبر ۱۸۹۲ء، لندن، کوئی صدر نہیں تھا۔
(۱۰) ستمبر ۱۸۹۴ء، جنیوا۔ کوئی صدر نہیں تھا۔
(۱۱) ستمبر ۱۸۹۷ء، پیرس، پروفیسر شیفر
(۱۲) ۱۸۹۹ء، روم، کوئی صدر نہیں تھا۔
(۱۳) ستمبر ۱۹۰۲ء، ہمبرگ
(۱۴) ۱۹۰۵ء، الجیرز
(۱۵) اگست ۱۹۰۸ء، کوپن ہیگن
(۱۶) اپریل ۱۹۱۲ء، ایتھنز، کاؤنٹ انجیلو ڈی گوبر نٹیس
(۱۷) اگست ستمبر ۱۹۲۸ء، آکسفورڈ، لارڈ شیلمرس
(۱۸) ستمبر ۱۹۳۱ء، لنڈن، پروفیسر سی، سنوک ہُرونجے
(۱۹) ستمبر ۱۹۳۵ء، روم، پروفیسر پاؤلو امیلیو پاولنی
(۲۰) ستمبر ۱۹۳۸ء، برسلز، پروفیسر جین کپارت
(۲۱) جولائی ۱۹۴۸ء، پیرس
(۲۲) ستمبر ۱۹۵۱ء، استنبول، پروفیسر ذکی ولیدی توغان
(۲۳) اگست ۱۹۵۴ء، کیمبرج، پروفیسر سر الف، ایل، ٹرنر
(۲۴) اگست ستمبر ۱۹۵۷ء، میونخ، پروفیسر ارنسٹ والشمت
(۲۵) اگست ۱۹۶۰ء، ماسکو، پروفیسر بی غفوروف
(۲۶) جنوری ۱۹۶۴ء، نئی دہلی، پروفیسر ہمایوں کبیر

خُطبوں کے خُلاصے

تلخیص وترجمہ: جناب عبداللہ ولی بخش قادری

مستشرقین کی کانگریس میں تین خطبے پڑھے گئے تھے، پہلا خطبہ، پچھلے اجلاس کے صدر ڈاکٹر غفوروف کا تھا، اس کے بعد صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کا افتتاحی خطبہ پڑھ کر سنایا گیا، موصوف اپنی علالت کی وجہ سے خود تشریف نہیں لاسکے تھے، اس لئے پروفیسر ہمایوں کبیر نے ان کا خطبہ پڑھ کر سنایا، اس کے بعد صدر جلسہ پروفیسر ہمایوں کبیر نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھا۔ ان تینوں خطبوں کے اہم نکات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

ڈاکٹر غفوروف، سابق صدر کانگریس

مستشرقین کی پچیسویں کانگریس ایک طویل عرصے تک یاد رہے گی، ماسکو کی اس کانگریس میں نمایاں حیثیت مشرق ہی کو حاصل تھی، وہ مشرق جو اپنے وجود سے آشنا ہو رہا ہے، وہ مشرق جو اپنے آپ کو سمجھنے لگا ہے، وہ مشرق جس نے ابھی ابھی نوآبادیاتی نظام کی بیڑیوں سے نجات حاصل کی ہے اور جو نئی زندگی کی شاہراہ تعمیر پر گامزن ہے، ایسی زندگی پر جو سیاسی، معاشی اور تہذیبی ترقی کے اعتبار سے خود مختار ہے۔

مستشرقین کے گذشتہ جلسوں کی اچھی روایات یعنی تمام ملکوں کے اسکالروں کا جذبہ تعاون، صلح و آشتی اور دوستانہ تعلقات کا جوش و خروش، جس کا اظہار بہت نمایاں طور پر ماسکو کی کانگریس میں کیا گیا تھا، برابر جاری ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ مفید سلسلہ دہلی میں قائم رہے گا۔

گذشتہ چند برسوں میں علمی دنیا میں جو قابلِ ذکر انکشافات ہوئے، ان میں سنسکرت زبان کے وہ مخطوطے بھی ہیں جو سوویٹ سنٹرل ایشیائی جمہوریتوں میں برج کی چھال پر لکھے ہوئے ہیں۔ ان مخطوطات کا تجزیہ کرنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ عہد وسطیٰ کی ابتدائی صدیوں میں وسط ایشیا اور ہندوستان کے درمیان تہذیبی لین دین رہا تھا۔ سوویٹ اسکالر ان دستاویزوں کی نقلیں اپنے ہندوستانی ساتھیوں کو ہدیتہً پیش کر رہے ہیں اور اس کی امید کرتے ہیں کہ مشترک مطالعہ سے

اس اہم مسئلے کی بھرپور چھان بین اور مکمل تحقیق کی جائے گی۔

مشرق کا مطالعہ، جس کے لئے ہم نے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں، اس دور میں روز بہ روز ترقی کر رہا ہے۔ مشرقی علوم کو انسان دوستی کے نصب العین سے فیضان حاصل کرنا چاہیئے اور ترقی اور امن کے مقاصد کو پورا کرنا چاہیئے، ہمارا ہر عمل جارحانہ وطن پرستی اور تنگ قومیت کے احساسات سے جس کی بعض جگہوں پر مثالیں ملتی ہیں، بالکل پاک ہونا چاہیئے۔ مشرق کے عوام کی تاریخ اور تہذیب کے مطالعہ کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ان لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے نہ کہ ایک دوسرے سے جدا کیا جائے۔

ہم اسکالروں سے توقع کی جاتی ہے کہ ہم جنگ کے خلاف اور امن کی خاطر، ایٹمی اور ہائیڈروجن بموں کے مقابلے میں ترک اسلحہ کے لئے، فوجی تیاریوں کی مخالفت اور پرامن اشتراک عمل کی حمایت میں، وحشیانہ نسلی تعصبات کے نظریوں کے بجائے انسان دوستی کے لئے، جہالت کے خلاف تہذیب کی خاطر، نوآبادیاتی استبداد کے خلاف آزادی کے لئے، نسلی امتیازات، جارحانہ وطن پرستی اور ہر قسم کے سماجی اور قومی ظلم وجور کے خلاف اور عوامی مساوات کے لئے لڑیں گے۔

اس سلسلے میں مشرق کے عظیم شاعر حافظ شیرازی کے الفاظ میں عرض کروں گا۔

درختِ دوستی بنشاں کہ کامِ دل بیار آرد
نہالِ دشمنی برکن کہ رنجِ بے شمار آرد

ترجمہ:۔ دوستی کا درخت لگا، تاکہ دل کا مقصد پھل لائے۔ دشمنی کا پودا اکھاڑ پھینک، کیونکہ بے شمار تکلیفیں دیتا ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن، صدر جمہوریۂ ہند

یہ کانگریس جتنے سکشن میں تقسیم کی گئی ہے اور ان سکشن میں جن موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا جائے گا وہ مصر، بابل، شام، ایران، اسرائیل، مغربی ایشیا اور جنوبی مشرقی ایشیا میں پروان چڑھنے والی تہذیبوں کے ایک وسیع میدان کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ ان تہذیبوں کا عطیہ آج انسان کی

میراث ہے۔ اگرچہ ان سب میں ادبی، فلسفیانہ، جمالیاتی اور مذہبی اسالیب موجود تھے لیکن ان میں سے بعض کسی مخصوص تہذیب میں بعض سے نمایاں ہو گئے۔

آج دنیا کے تمام انسان سائنس کی ایجادات اور صنعت وحرفت کی کارگزاریوں کی بدولت ایک قریبی پڑوس بن گئے ہیں۔ آمدورفت اور رسل ورسائل کا نتیجہ تہذیبوں، قوموں اور مذہبوں کے میل ملاپ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ موجودہ صورت میں ہم جو نظریہ قائم کر سکتے ہیں وہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے کی خواہش نہیں ہے بلکہ وسیع الخیالی کا رجحان ہے۔ وہ عدم رواداری نہیں بلکہ مفاہمت کا، وہ نفرت اور تردد کا نہیں بلکہ قدرشناسی اور اپنے اندر سمو لینے کا رجحان ہے۔

آج دنیا ایک ایسی عالمی برادری کی تشکیل کی خواہش مند ہے، جس میں اتحاد اور یکجہتی ہو نہ کہ اتحاد و اتفاق پر مبنی عالمی برادری کی یکسانیت اور ہم خیالی۔ ہمیں عظیم معلمین عالم کے ارشادات یاد رکھنے چاہئیں کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ اور ان کے آپسی امتیازات کو فنا نہیں کر دینا ہے بلکہ ان کو باہمی مفاہمت کے ذریعے قائم و برقرار رکھنا ہے۔ ہمیں دوسروں کے تجربات اور معتقدات سے سیکھنا چاہیئے۔ ہم یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ قوموں کے مابین نزاع کا تصفیہ جنگیں نہیں ہو سکتیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑی تباہ کن ہوتی ہیں۔ موجودہ جنگ میں نہ کوئی کچھ پاتا ہے نہ کھوتا ہے۔ نہ کوئی فاتح ہوتا ہے اور نہ کوئی مفتوح۔ اختلافات کو انسانی فطرت اور اس کے مختلف مظاہر کی واقفیت کی وسیع سطح پر ختم کر دینا چاہیئے۔ ہم دنیا کا خاتمہ اپنے نظریات کے مجنونانہ جوش یا نہایت ہی سخت سیاسی حماقت میں ہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں تمام بنی نوع انسان کے وفادار رہنے کی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔ کلیتاً ایک قوم یا جماعت یا مذہب کی وفاداری موجودہ دنیا میں کافی نہیں ہے۔

آپ حضرات جو فنون لطیفہ، ادب، فلسفہ، اور دنیا کی مختلف تہذیبوں کے کھوج لگانے والے ہیں، انسانوں کے دل و دماغ کی تعمیر میں سیاسی رہنماؤں سے بھی زیادہ قطعی آواز رکھتے ہیں۔ آیئے آج ہم علم و فضل کے جذبے کے تحت جو حدود سے ناآشنا ہے اور جو اگر حقیقی ہو تو انسانی

اور ضبط پیدا کرتا ہے، اپنے آپ کو وقف کردیں ایک نئی دنیا کے تعمیر کے لئے اپنے اندر سے نفرت، تعصب اور ہر قسم کے تشدد کا شائبہ تک مٹانے کے لئے۔ آیئے ہم ایک ایسی منزل کی طرف چلیں، جہاں ہر نسل، ہر تہذیب اور ہر ملک کی قدر کی جاتی ہے۔ دنیا دوستی کی طلب گار ہے، اس سرزمین کی آثار گ وید کے زمانے سے لے کر آج تک ہم سے مشترک نصب العین اور مقاصد کی آبیاری کے لئے دوش بدوش بڑھنے کے لئے کہتی رہی ہے۔

پروفیسر ہمایوں کبیر، موجودہ صدر کانگریس

یہ پہلا موقع ہے کہ کانگریس کا اجلاس یورپ کے باہر ہو رہا ہے اور غالباً یہ نہایت مناسب ہے کہ یہ اجلاس ہندوستان میں ہو جو زمانۂ ما قبل تاریخ سے بہت سے تمدنوں اور تہذیبوں کا سنگم رہا ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ اس کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ہندوستان اور مشرق و مغرب کے دور دراز ملکوں میں تعلقات تھے۔ انسانیت کے ماہرین اس کی شہادت بھی پیش کرتے ہیں کہ مغربی حصے کے تصورات اور مشرقی علاقوں کے فنون نے ایک دوسرے سے مل کر ہندوستانی تہذیب کو زمانۂ ما قبل تاریخ میں بھی ایک زرق برق اور بوقلموں تار و پود عطا کر دیا تھا۔ ادب ان شہادتوں سے بھرا پڑا ہے کہ ہندوستان کے اندر و باہر افراد اور حالات کی آمد و رفت زمانۂ ما قبل تاریخ کی دھندلی گذرگاہوں سے ہوتی رہی ہے۔

اس کرۂ زمین کے مشرق و مغرب کے مادی لین دین سے قطع نظر دنیا کے مختلف حصول میں قدیم زمانے سے آپس کا نظریاتی اور تہذیبی ربط ضبط کا گہرا اور دور رس سلسلہ جاری ہے۔ حروف تہجی کی ایجاد فنونیوں نے کی جہاں موجودہ لبنان ہے لیکن بہت جلد وہ ساری دنیا میں پھیل گئی۔ ہو سکتا ہے کہ اقلیدس کی بنیاد مصر نے ڈالی ہو لیکن وہ آناً فاناً انسان کی مشترک میراث بن گئی۔ صفر کا تصور اور اعشاریہ کا طریقہ ہندوستانیوں کا استنباط ہے ساری مہذب دنیا ان کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ کاغذ شاید چینیوں کی دین ہے۔ لیکن آج علم کی ہر منزل پر دنیا کے تمام ممالک میں کاغذ ایک لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک یقینی بات کسی بھی ملک کے اندر کسی بھی عہد میں کسی بھی تہذیب کے متعلق یہی ہے کہ اس کی قوت نمو اور تازگی کے مختلف سرچشمے رہے ہیں اور اس نے اپنے موقع پر بعد کے زمانے میں مختلف ممالک کے اندر ابھرنے والی نئی تہذیبوں کو اپنی دولت سے مالا مال کیا ہے۔

شرعی قانون کی تبدیلی

پروفیسر محمد مجیب

زندگی کے نظام کو قائم رکھنے کے لئے قانون کا سہارا چاہیئے۔ یہ عالموں کا مانا ہوا ایک اصول ہی نہیں ہے، اس کے بغیر واقعی سماجی زندگی میں کوئی استقلال پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن تاریخ اس کی شاہد ہے کہ حالات بدلتے رہتے ہیں، نئی ضرورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں اور قانون میں اسی رفتار سے ترمیم نہ ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے، اس لئے کہ تبدیلی کے بارے میں یقین اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس سے متاثر ہونے والے لوگوں کی تعداد کافی ہو جائے اور قانون کے نہ بدلنے سے، جو نقصان ہو رہا ہو وہ ثابت کیا جا سکے۔ یہ ہے ان قوانین کا مسئلہ جو حکومتِ وقت کی تحریک پر یا اس کے توسط سے یا اس کے حکم سے بنتے ہوں۔ اگر قانون کی بنیاد دینی عقائد پر ہو اور اس کی سند دینی کتابوں سے دی جاتی ہو تو معاملہ اور مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے کہ عقائد کی طرح عقائد پر منحصر قوانین وقت کے ساتھ بدل دئے جائیں تو عقیدے اور قانون دونوں کی حیثیت بدل جاتی ہے۔

خالص تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے شرعی قانون اصولاً برابر نافذ رہے مگر عملاً حاکموں نے دنیاوی معاملات میں جو چاہا کیا۔ مثلاً بادشاہوں نے آمدنی کے طریقے نکالے، سزائیں دیں اور بہت سے ایسے کام کئے جن کی شریعت اجازت نہیں دیتی اور جن کی جانچ کی جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ صرف قانون ہی نہیں بلکہ اسلامی عقائد اور اخلاق کے بھی خلاف تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو ظاہر ہے شریعت کا نفاذ حکومت کے ذمے نہیں رہا اور صرف چند معاملات میں، جو انفرادی حقوق یا پرسنل لا کے ضمن میں آتے ہیں عدالتوں نے اس کی رعایت رکھی کہ ہر انا قانون رسم سمجھ کر برتا جائے۔ اس وقت یہ معلوم ہوا کہ انفرادی

حقوق یعنی پرسنل لا کے ایک اہم شعبے ہیں، جس کا تعلق وراثت سے ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی رسمیں شرعی قانون کے خلاف پڑتی ہیں اور انگریزوں نے نہیں بلکہ خود مسلمانوں نے اصرار کیا کہ عدالت شریعت کے بجائے رسم کے مطابق فیصلے کرے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال پنجاب اور یوپی کے زمینداروں کی رسم تھی کہ لڑکی کو جائداد ورثے میں نہ ملے اور لڑکوں میں بھی سب سے بڑے لڑکے کو وراثت اور باقی کو صرف گذارے کا حق دار مل جائے۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت نے جو قانون بنائے اور خاص طور سے قانون تعزیرات میں اسلامی شریعت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

یہ خیال غلط ہے کہ حکومت کے قانون اپنی جگہ اور شریعت کے قانون اپنی جگہ نافذ سمجھے جا سکتے ہیں۔ شریعت کے قانون زندگی اور معاملات کے ہر پہلو پر حاوی ہیں اور حکومت کے قانون بھی لامحالہ زندگی اور معاملات کے ہر پہلو پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ انگریزی حکومت نے عبادات کے میدان میں دخل اندازی نہیں کی، لیکن یہ مسئلہ کافی شدید اختلافات اور فسادات کے بعد طے ہوا کہ اگر مسجد سڑک میں آ جائے تو سڑک کو الگ ہٹا کر بنانا چاہیئے۔ یا مسجد یا اس کے کسی حصے کو گرا دینا چاہیئے۔ مسلمان اس خوش فہمی میں رہے کہ انہیں مذہبی آزادی حاصل ہے اور شریعت کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا رہی ہے، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ حکومت کی تحریک سے فتویٰ حاصل کیا جا سکتا تھا کہ ہندوستان دارالامن ہے اور معاملات سے متعلق شریعت کا کوئی قانون نہیں تھا جسے بناتے وقت علماء سے مشورہ کیا گیا ہو یا شرعی قانون سامنے رکھا گیا ہو۔ انگریزی حکومت کی مصلحت اندیشی تھی کہ اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ شرعی قانون میں تبدیلی کرنے کی مجاز ہے اور ایسی کسی اصلاح کی کوشش نہیں کی جس کی مخالفت مسلمانوں کا کوئی طبقہ دین اور شریعت کا حوالہ دیکر کر سکتا۔

جس کسی منظم ریاست میں قانون بنتے ہیں تو یہ واضح اور مسلم ہوتا ہے کہ قانون بنانے یا بنے ہوئے قانون میں تبدیلی کرنے کا اختیار کس کو ہے۔ شرعی قوانین میں تبدیلی کرنے کا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جس کے مستند ہونے کے بارے میں مسلمان متفق ہوں۔ اجتہاد اور اجماع بحث کی خاطر تو تبدیلی کرنے کے ذریعے مانے جا سکتے ہیں، لیکن نہ تو اجتہاد کرنے کا حق کسی کو واضح طور پر دیا گیا ہے اور نہ اس کی

حدود مقرر کی گئی ہیں۔ اجماع کی صورت کیا ہو سکتی ہے اس کا طے کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ علماء کو تمام مسلمانوں کا نمائندہ رہنا یا احتراماً مان لیا جائے تب بھی یہ معاملہ رسم اور احترام کا ہوگا، واضح قانون کا نہ ہوگا ویسے اعتراض کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ آج کل صحیح معنی میں عالم اسی کو مانا جا سکتا ہے جو صرف دینی علوم میں ہی نہیں بلکہ دنیاوی علوم اور خاص طور پر اجتماعیات اور علم قانون میں ملکہ رکھتا ہو۔ یہ شرط ان لوگوں کو جمع کرکے پوری نہیں کی جا سکتی جن میں سے کچھ دینی علوم سے اور کچھ دنیاوی علوم سے پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ دودھ، چاول اور شکر کو ملا کر کھیر نہیں بنتی، اس کے لئے ہانڈی اور آگ بھی چاہیئے اور وہ مدت کہ جو ان تینوں اجزاء کو ملا کر ایک مزہ پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے

اس وقت اگر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل ثابت ہے کہ شرعی قوانین میں تبدیلی کرنے کا حکومت کو حق نہیں ہے، اگرچہ مستشرقین کی کانگریس میں جو سیمنار ہوا تھا اس میں چھاگلا صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ سیکولر ریاست کی پارلیمنٹ انصاف اور عام مفاد کی خاطر ہر قسم کا قانون بنانے کی مجاز ہے، صرف عقائد کے معاملے میں اس کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس رائے کو ثابت کرنے کے لئے چھاگلا صاحب نے دلیل یہ دی تھی کہ حکومت معاشی اور سیاسی معاملات سے متعلق قوانین بنانے کی مجاز ہے اور اس سے بہرحال انفرادی حقوق پر اثر پڑتا ہے اور جب کوئی ایسا معاملہ جس کا تعلق ان انفرادی حقوق سے ہو جو شریعت کے مطابق دیئے گئے ہیں، عدالت میں پیش ہوتا ہے تو جج کا فیصلہ لامحالہ شرعی قانون میں اضافہ یا ترمیم کرتا ہے (شاید اسی خیال سے کہ قاضی کا فیصلہ اضافہ یا ترمیم نہ کر سکے شریعت میں کسی معاملہ کا فیصلہ اسی قسم کے دوسرے معاملات کے لئے سند نہیں مانا گیا ہے)۔ اسی سیمنار میں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے یہ رائے دی کہ علماء کا قانونی معاملات میں اولو الأمر کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ ہو سکتا ہے کہ وہ وزارت قانون کے اشتراک عمل سے اس پر غور کریں کہ کن خاص معاملات میں شرعی قانون پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

اسی سیمنار میں ترکی کے سفیر، سیف اللہ لبیبن اور مصر کے سفیر، احمد حسن الفقیہہ کے بیانات سے معلوم ہوا کہ اگر کسی ایک فقہی مذہب کی پابندی کرنے کے بجائے چاروں مذاہب کے اصولوں

سامنے رکھا جائے تو بہت سی ضروری اصلاحیں کی جاسکتی ہیں۔ مصر میں چاروں مذاہب کے علاوہ شیعی مذہب کے اصول بھی سامنے رکھے گئے اور اسی طرح یہ معلوم ہوا ہے کہ مختلف مذاہب کے دائرے سے نکلے بغیر ایسے اصولوں کو قانون کی شکل دی جاسکتی ہے جو انفرادی حقوق کے دائرے کو اتنا ہی وسیع کردیں جتنا کہ وہ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہے۔

ضروری اصلاحوں سے کیا مطلب ہے یہ چند مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں بیوہ کی شادی کا رواج بند ہوگیا تھا اور اتنے عرصے تک بند رہا تھا کہ اس کی ممانعت کو ایک شرعی قانون کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ سید احمد شہیدؒ نے ضروری سمجھا کہ بیوہ کو اس کا حق دیا جائے اور اس حق کو دلانے کے لئے خود ایک بیوہ سے شادی کی اور اپنے ان ساتھیوں کو جن کی شادی نہیں ہوئی تھی ہدایت کی کہ بیوہ سے شادی کریں۔ اس اصلاح کی ضرورت ایک اعلیٰ شخصیت کے ضمیر نے محسوس کی اور اس کے خلاف یہ کہنا کہ بیوہ عورتیں خود نہیں چاہتی ہیں کہ دوبارہ نکاح کریں یا یہ کہنا کہ بیوہ عورتوں کی نمایاں تعداد نے اس کا مطالبہ نہیں کیا ہے بالکل غلط ہے۔ دوسری قسم کی مثالیں وہ ہیں جو احمد حسن الفقیہہ صاحب، سفیر مصر نے اپنی تقریر میں پیش کیں۔ مصر میں عدت کا زمانہ تین سال تھا، شوہر مفقود الخبر ہو جاتا تو بیوی انتظار میں عمر بھر بیٹھی رہتی۔ شوہر کے لئے طلاق دینا اتنا آسان تھا اور خاص حالات کی وجہ سے جو شوہر قانونی رعایت سے فائدہ اٹھا رہے تھے ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ بیوی کے حق کا تحفظ نہیں ہوسکتا تھا۔ عورتوں میں تعلیم پھیلی تو یہ لازمی بات تھی کہ رائج قانون کے خلاف احتجاج کریں، اس کے علاوہ مسلمانوں اور ان کے طریق زندگی پر اعتراض کرنے والے بہت تھے اور اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ترکی میں ۱۹۱۱ء سے جو لڑائیاں شروع ہوئیں تو انھوں نے مردوں کی آبادی اتنی کم کردی کہ اگر عورتیں پردے میں بیٹھی رہتیں یا انھیں وراثت کا اور اپنی جائداد کا خود انتظام کرنے کا حق نہ ملتا تو ترک بالکل تباہ ہوجاتے۔ ایسی صورتوں میں یہ بحث پھر لازمی ہے کہ جس تقاضے یا قانون کی پیروی یہ سمجھ کر کی جارہی ہے کہ وہ شریعت کا حکم ہے وہ واقعی حکم ہے یا نہیں اور اگر ان سوالات کا جو کئے جا رہے ہوں کوئی معقول جواب نہ دیا جائے تو پھر افراد تنگ ہوکر شریعت

کے دائرے سے بالکل ہی نکل جانے کا فیصلہ کرنے لگتے ہیں جیسے اس صدی کے شروع میں پنجاب کی عورتوں نے ان حقوق سے محروم رکھے جانے پر جو اسلام نے ان کو دئے تھے، عیسائی مذہب قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ کہہ دینا کہ ایسے لوگ بہرحال کم ہوں گے مسٔلے کو ٹالنا ہے اور اس سے ایسا نقصان ہو سکتا ہے کہ جو اصولی اعتبار سے بہت اہم ہو۔

اس سیمینار میں سید حسین نصر، ایک ایرانی فاضل کی تقریر بہت فکر انگیز تھی۔ انھوں نے بہت اصرار سے کہا کہ شریعت کو دین اور معاملات دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے انسان کو جسم اور روح دو حصوں میں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی شریعت جسم اور روح کے اتحاد و اتصال کا نمونہ اور احکام الٰہی کا مجسمہ ہے، ہم جن مادی حقائق کو سامنے رکھ کر شریعت کو جانچتے ہیں وہ حقیقت کا صرف ایک رخ ہے، ایسا رخ جو بدلتا رہتا ہے اور قابل اعتبار نہیں ہے۔ یہ کہنا بھی مہمل ہے کہ قانون کو وقت کے ساتھ قدم بہ قدم چلنا چاہئے کیونکہ اس کے بعد پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقت کس کے ساتھ چلتا ہے اور اس کو چلانے والا کون ہے۔ دراصل شریعت کو عقائد اور معاملات دو حصوں میں کرنا عیسائیوں کی تقلید میں شروع کیا گیا۔ عیسائی مذہب میں کوئی شریعت نہیں ہے، یہ پوری پوری رومی قانون سے ماخوذ ہے، اس لئے عیسائیوں میں قانون کی حیثیت ضمنی اور اتفاقی ہے اور دراصل اس کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اب اسی بات کو سامنے رکھ کر مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ جیسے عیسائی ملکوں نے اپنا قانون بدلا ہے ویسے ہی وہ بھی اپنی شریعت کو بدلیں۔ یہ مطالبہ یورپ اور امریکہ کی نقل کے خاطر کیا جاتا ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم تعدد ازدواج کو برا سمجھیں اس لئے کہ یورپ اور امریکہ میں اس کو برا سمجھا جاتا ہے اور ہم میں احساس کمتری اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ہم اسے بلا تامل مان لیتے ہیں۔ عیسائی مذہب کے طریقہ کار اور یورپ و امریکہ کے رواج کی نقل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاست اخلاقی حاکم بھی بن جائے گی اور اس کے مقابلے میں شریعت کیا قرآن کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہ جائے گی۔ لیکن یہ سب کہنے کے بعد سید حسین نصر نے یہ بھی کہا کہ ایران میں علمار کے مشورہ سے اور نپولین کے مجموعہ قانون کو سامنے رکھ کر احکام مدنیہ مرتب کئے گئے ہیں۔ یعنی ایران میں بھی اسی طرح انفرادی حقوق میں

تبدیلیاں کی گئی ہیں جیسے کہ ترکی اور مصر میں اور طریق کار بھی وہی اختیار کیا گیا ہے جو ان ملکوں میں۔ اب اگر ترکی میں یہ مان لیا گیا ہے کہ قومی اسمبلی کا فیصلہ اجماع کی حیثیت رکھتا ہے اور اس طرح قومی حکومت کو قانون بنانے کا پورا اختیار دے دیا گیا ہے تو اس سے حسین نصر صاحب کو بھی اختلاف نہیں کرنا چاہیئے۔

دراصل جو حقیقت ہے اسے نظر میں رکھیں تو بحث بہت مختصر کی جا سکتی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں شریعت کو نافذ کرنا تو درکنار شرعی مسائل کے متعلق رائے دینے کا اختیار بھی کسی شخص یا جماعت کو نہیں ہے اور فتویٰ حاصل کرنے کا پرانا طریقہ معاملوں کو طے کرنے کے بجائے خود علماء میں فساد پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی کوئی ایسی دینی تنظیم بھی نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ افراد پر اثر ڈالا جا سکے اور صحیح اور غلط طریقۂ کار کے بارے میں فیصلے کئے جا سکیں۔ مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت خود ان کی مرضی سے قائم ہے اور اگرچہ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس میں استقلال اسی وجہ سے ہے لیکن اس صورت حال کے سبب سے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں میں جو اہل فکر ہوں وہ نئے سماجی رجحانات کا اندازہ کرتے رہیں اور جن مسائل کی اصولی حیثیت ہو ان میں افراد کی رہنمائی کی صورتیں نکالتے رہیں۔ عیسائی دنیا میں ہر جگہ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے درمیان مخالفت ہے۔ پروٹسٹنٹ لڑکی کسی رومن کیتھولک لڑکے سے شادی کرلے تو وہ فرقے سے خارج سمجھی جا سکتی ہے اور اگر رومن کیتھولک لڑکی پروٹسٹنٹ سے شادی کرلے تو رومن کیتھولک کلیسا کی طرف سے اس کو اجازت مل سکتی ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ اولاد رومن کیتھولک ہوگی، اس طرح لڑکی کلیسا کے اثر میں رہتی ہے اور رومن کیتھولک جماعت میں اگر ایک فرد کی کمی ہو جاتی ہے تو نئے افراد کے اضافے کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے اور ایک کارروائی جو فی نفسہٖ مناسب نہیں مانی گئی ہے غیر قانونی نہیں ہو جاتی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے لوگوں میں شادی بیاہ کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، ہم چاہیں تو اس بات کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں کہ مسلمان لڑکیاں ہندوؤں سے شادی کرتی ہیں، چاہیں تو اس کا کوئی انتظام کر سکتے ہیں کہ قانون کی خلاف ورزی سے جماعت کو کم سے کم نقصان ہو۔ اگر ان لوگوں کو جو اپنے آپ کو الیا

طریقہ اختیار کرنے پر مجبور پاتے ہیں، جس کی رعایت شرعی قانون نے نہیں رکھی ہے تو وہ رائج سرکاری قانون سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ شرعی قانون عملاً منسوخ ہوجائے۔ رہا کی جو بحث ہے اس کا ایک نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ لوگ علمار کی رائے پر منافع کو ترجیح دیں۔ جن لوگوں کو شرعی قانون کا احترام اور اس کا زیادہ سے زیادہ نفاذ جاری رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے، انھیں کسی کی تحریک کے بغیر بھی سوچنا چاہیئے کہ اب تک کن کن شعبوں اور معاملوں میں شرعی قانون کا نفاذ بالکل نہیں رہا ہے اور جن شعبوں اور معاملوں میں ہے۔ ان لوگوں کو اسے نافذ رکھنے پر کسی طرح آمادہ کیا جاسکتا ہے۔

حکومت ہند کی طرف سے اگر اعلان کردیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے شرعی قانون میں تبدیلی کرنے کی مجاز نہیں سمجھتی اور اس کا عمل اس اعلان کے مطابق رہے تب بھی اصل صورت حال میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

مسلم پرسنل لا پر نظر ثانی

عبداللطیف اعظمی

مستشرقین کی بین اقوامی کانگریس میں اسلامی قانون کے ماہرین بھی دنیا کے مختلف حصوں سے بہت بڑی تعداد میں آئے تھے۔ اس لئے اس اہم موقع پر مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے مسئلے پر سمپوزیم کا انتظام ضرورت اور محل کے لحاظ سے عین مناسب تھا۔ کانگریس کی مختلف کارروائیوں پر جو سرسری تبصرہ اس شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے اس میں مسلم پرسنل لا پر بحث وگفتگو کا خلاصہ بھی درج ہے۔ اس خلاصے میں اگرچہ تفصیل اور وضاحت نہیں ہے، مگر اس سے مقررین اور مقالہ نگاروں کی رایوں اور ان کے رجحانات کا بہر حال بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اس بحث کے اختتام پر صدر جلسہ جناب محمد کریم چھاگلا صاحب نے بالکل صحیح فرمایا تھا کہ سوائے ایک مقرر (پروفیسر سید حسین نصر) کے سبھی نے اس سے اتفاق کیا کہ مسلم ممالک میں حسب ضرورت تبدیلیاں کی گئی ہیں اور ضرورت کے مطابق کی جانی چاہئیں۔

ہندوستان میں یہ مسئلہ چند ماہ قبل حکومت کے سامنے آیا تو علماء اور مذہبی اور نیم مذہبی اخبارات ورسائل کی طرف سے شدید اعتراضات کئے گئے کہ یہ مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ ہے جس میں حکومت کو از روئے دستور مداخلت کا اختیار حاصل نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہے کہ سنجیدہ رسالوں اور روشن خیال علماء نے موجودہ مسلم پرسنل لا پر نظر ثانی کی ضرورت کا اعتراف کیا اور لکھا ہے کہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری تبدیلی کرنا از بس ضروری ہے اس احساس کے زیر اثر دار العلوم ندوۃ العلماء نے منتخب علماء کی ایک کمیٹی مقرر کی اور اس نے کافی کام کر بھی لیا ہے، مگر ابھی زیر تکمیل ہے اس لئے اس کے متعلق کسی قسم کا اظہار خیال قبل از وقت ہوگا، مگر اخبارات ورسائل کے ذریعہ ہندوستان کے علماء کے جو افکار وخیالات سامنے آئے

ہیں ان کے پیش نظر کسی بہتر تبدیلی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ علماء دین اپنی بحثوں اور بیانوں میں سب سے زیادہ زور اس پر دیتے ہیں کہ اس معاملۂ خاص میں پارلیمنٹ کو کوئی قانون بنانے یا مروجہ قوانین میں ترمیم کرنے کا کوئی اختیار نہیں، بلکہ اس کا حق صرف علمائے اسلام کو ہے۔ یہ کہتے وقت وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قانون تو بہرحال صرف پارلیمنٹ ہی بنا سکتی ہے[۱] دوسرے شرعی قوانین کے لئے تجاویز مرتب کرنے کے لئے صرف دین اور سنت سے واقفیت کافی نہیں ہے، زمانے کی ضروریات و مسائل سے گہری واقفیت بھی ضروری ہے، جیسا کہ مولانا سعید اکبر آبادی صاحب نے اس سمپوزیم میں امام ابو یوسف رح کے حوالہ سے فرمایا تھا۔

ترکی اور متحدہ عرب جمہوریہ کے سفیروں نے اگرچہ اپنے مقالوں میں یہ بات پوری وضاحت سے کہی تھی کہ ان دونوں ملکوں میں مسلم پرسنل لا میں پارلیمنٹ کے ذریعے تبدیلیاں کی گئی ہیں مگر عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ان ملکوں میں بھی اسلامی قوانین میں جملہ تبدیلیاں علمائے دین کے مشورہ اور ان کی رائے کے مطابق کی گئی ہیں۔ مگر یہ کہتے وقت یہ حقیقت نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ ان مسلم ملکوں کے علماء اور ہندوستان کے علماء کے خیالات اور تصورات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جن جدید افکار اور مغربی تصورات کو مصری، بغدادی اور ترکی علماء نے عرصہ ہوا قبول کر لیا ہے، ہمارے ہندوستان و پاکستان کے علماء ابھی ان کی حلّت و حرمت کی بحث میں ہی الجھے ہوئے ہیں۔ ابھی حال میں ندوۃ العلماء کے ایک عربی رسالہ میں فنونِ لطیفہ کے متعلق کوئی مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کے جواب میں ازہر یونیورسٹی کے ایک جید عالم دین نے لکھا تھا کہ اس ترقی یافتہ دور میں کوئی باہوش آدمی فنون لطیفہ کو حرمت و حلت کی بحث کا موضوع

---

[۱] مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے نزدیک اسلامی معاشرہ کے لئے قانون بنانے کے مجاز "اولوا الامر" ہیں اور "اولوا الامر" کی وضاحت موصوف نے اس طرح کی ہے: "اولوا الامر سے مراد حکومت اور علماء دونوں ہیں۔ ایک کے پاس نفاذ کی قوت ہے اور دوسرے کے پاس وضع قانون کی اور اصلاح دونوں کے ملنے سے ہی ہو سکتی ہے، تنہا کوئی ایک گروہ اس کو انجام نہیں دے سکتا۔" (برہان بابت ماہ اگست ۶۳ء صفحہ ۶۸)

نہیں بنا سکتا چاہے وہ ندوہ کا عالم ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارے ایک عالم دین کو یہ بات اتنی ناگوار گزری کہ علالت کے باوجود جب تک اس کی تردید میں ایک زوردار مقالہ نہیں لکھ لیا ان کو چین نہیں آیا۔ اسی سے دوسرے مسائل کے متعلق ان علمائے کرام کی رایوں اور ان کے خیالات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک مسلم روزنامے نے زیر بحث سمپوزیم کے صدر جناب چھاگلا کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک اچھے ماہر قانون ہو سکتے ہیں، مگر ان کو مذہبی علوم میں کوئی درک نہیں ہے اس لئے وہ مسلم پرسنل لا میں کسی تبدیلی یا عدم تبدیلی کے متعلق کچھ کہنے کے مجاز نہیں ہیں لیکن یہ لکھتے وقت معاصر مذکور کو اس کا خیال نہیں رہا کہ ایسا ہی سوال علمائے دین سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ دینی علوم کے بیشک وہ عالم اور ماہر ہیں مگر اقتصادیات و معاشیات کے جدید اصولوں اور نظریوں بنک اور تجارت کے مغربی طریقوں، سوشلزم اور کمیونزم کے پیدا کردہ مسائل وغیرہ سے بخوبی واقف نہیں ہیں اس لئے وہ موجودہ سوسائٹی کے تقاضوں اور مطالبوں کے مطابق کوئی قانون بنانے کے اہل نہیں ہیں۔

چھاگلا صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں بہت معقول بات کہی تھی کہ مسلم پرسنل لا میں کچھ کا تعلق ہمارے ایمان اور عقیدے سے ہے۔ ایسے معاملات میں پارلیمنٹ کو دخل دینے کا حق نہیں، لیکن جن امور کا تعلق روزمرہ سماجی زندگی سے ہے ان کے متعلق بہرحال عوام کے نمائندے اور پارلیمنٹ ہی بہتر فیصلہ کر سکتی ہے۔ یا مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب نے فرمایا تھا کہ دین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، مگر شریعت زمانے اور حالات کے مطابق برابر بدلتی رہتی ہے[1] اسی طرح میر اقبال حسین صاحب نے محجوب الارث کے مروجہ

---

[1] کن احکام میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور کن میں نہیں۔ اس مسئلے پر مولانا اکبرآبادی نے برہان بابت ماہ اگست ۶۳ء کے "نظرات" میں ذرا تفصیل سے بحث کی ہے۔ "لکھتے ہیں"۔ یہ احکام دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن کی نسبت نصوص قطعیہ موجود ہیں اور اس بنا پر ان کو فرض، واجب یا حرام و ناجائز کہا جاتا ہے، مثلاً محرمات نکاح و طعام، تقسیم میراث کے قوانین، انعقاد و فسخ نکاح کے شرائط و لوازم، یہ تمام احکام قطعی ہیں اور ان پر ہرگز نظر ثانی نہیں کی جاسکتی

(باقی اگلے صفحہ پر)

قانون کا حوالہ دیکر فرمایا تھا کہ یہ بات کسی طرح قرین انصاف نہیں کہی جاسکتی کہ ایک شخص کے کچھ بہتے مخصوص حالت میں، وراثت سے محروم کر دئیے جائیں اور کچھ پورے ترکہ کے مالک قرار پائیں۔ مولینا سعید احمد اکبرآبادی اور میر اقبال حسین دونوں نے سوسائٹی کے مفاد میں ایک سے زیادہ شادی پر پابندی لگانے کو حق بجانب اور جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح کے بہت سے مسائل اور معاملات پر اسلامی ملکوں میں پارلیمنٹ کے ذریعہ پابندیاں عائد کی گئی ہیں اور حسب ضرورت کی جاتی ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہی طریقہ ہندوستان میں بھی اختیار نہ کیا جائے۔

اس سمپوزیم میں صرف ایک تقریر ایسی تھی، جسے جذباتی کہا جاسکتا ہے۔ ایران کے ایک پروفیسر، سید حسین نصر صاحب نے پرسنل لا میں تبدیلی کو مغرب کی اندھی تقلید اور اس سے بیجا مرعوبیت بلکہ احساس کمتری کا نتیجہ قرار دیا۔ موصوف کے نزدیک شریعت کو دینی اور دنیادی معاملات میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اسلام میں پرسنل لا (انفرادی قانون) سرے سے موجود نہیں ہے، کیونکہ اسلام نے افراد اور معاشرہ میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ ان کے خیال میں شریعت نے کبھی زندگی کی حقیقتوں کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کیا، اس لئے تبدیلی کا کبھی سوال بھی پیدا نہیں ہوا۔ موصوف کے جذبات اور خیالات سے قطع نظر انھیں شاید اس سمپوزیم کا پس منظر اور مقصد معلوم نہ تھا یا تقریر کے وقت شدت جذبات میں یاد نہیں رہا کہ یہ بحث ہندوستان کے نئے حالات کے پیش نظر شروع کی گئی تھی، جہاں آزادی کے بعد سوسائٹی کی اصلاح و بہتری کے لئے نئے نئے قوانین وضع ہو رہے ہیں، جہاں مسلمانوں کا ایک پرسنل لا پہلے سے موجود ہے، جہاں ایک سیکولر حکومت قائم ہے، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور جہاں یہ سوال ہے کہ

(بہ سلسلہ صفحہ سابق) ان کے مقابلے میں دوسری قسم کے احکام وہ ہیں جن کی نسبت سرے سے کوئی نص شرعی نہیں ہے یا نص موجود ہے مگر اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ وہ حکم، فرض، واجب یا حرام نہیں ہے یا نص ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکم کسی خاص علت یا سبب یا حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ اس صورت میں اگر کبھی علت سبب یا حکمت و مصلحت باقی نہ رہے تو حکم خود بخود بدل جائے گا۔ خواہ وہ حکم وقتی و ہنگامی طور پر کیا ہی لازمی اور ضروری (صفحہ ۶۶، ۶۷)

مسلمانوں کے پرسنل لا میں، دوسری سماجی اصلاحات کی طرح، تبدیلی کی جائے یا نہیں، اگر کی جائے تو کس حد تک اور اس کا طریق کار کیا ہو۔

ابھی تک اخبارات ورسائل میں مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے خلاف جتنی باتیں کہی گئی ہیں وہ زیادہ جذباتی اور حقیقت پسندی سے دور ہیں۔ ایسے دلائل اور بحثوں سے وقتی طور پر رکاوٹ ڈالی جاسکتی ہے، مگر مستقل طور پر نہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ علمائے دین حالات کو سمجھیں اور زیادہ بہتر ہو اگر وہ خود ہی زمانے کے تقاضوں کے مطابق تجاویز مرتب کرکے مسلم رائے عامہ کے سامنے پیش کردیں۔ مولانا اکبرآبادی نے بہت ہی بروقت اور صحیح مشورہ دیا ہے کہ "علماء وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں کا وسعتِ نظر اور روشن دماغی کے ساتھ جائزہ لیں اور ہر چیز کو مداخلت فی الدین کہنے کی عادت ترک کردیں"[1] لیکن اگر انھوں نے یہ عادت نہ چھوڑی اور وقت کی سوئی کو روکنے کی کوشش کی تو انھیں ترکی کے انقلاب سے سبق لینا چاہیئے۔ ایک مسلم مبصر اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ مسلمان اس قدر روایت پرست واقع ہوئے ہیں کہ ترکی میں عمامے کی جگہ ترکی ٹوپی پہنانے کے لئے گولی چلانی پڑی اور جب اسی ترکی ٹوپی کو اتروا کر ہیٹ پہنایا گیا تو اس وقت بھی طاقت استعمال کی گئی۔

---

[1] موصوف نے علماء کے ساتھ حکمراں طبقہ کو بھی مشورہ دیا ہے کہ وہ "اپنے فکر و عمل کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالے، خود شریعت کے اوامر و نواہی کا پابند ہو اور اپنی طاقت و قوت سے کام لے کر ملک کو منکرات و فواحش سے پاک و صاف کرے۔" (برہان بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۳۲) میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک سیکولر حکومت کا حکمراں طبقہ موصوف کی اس نصیحت پر کیوں عمل کرسکتا ہے۔

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا شعبۂ علوم اسلامیہ

پروفیسر خلیق احمد نظامی

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا چھبیسواں اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ کانگریس کی سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے اجلاس کے لئے ایک ایشیائی ملک کا انتخاب کیا گیا جن لو نے کانگریس کے چند پچھلے اجلاسوں میں شرکت کی ہے اُن کا کہنا ہے کہ دہلی کا یہ اجلاس کانگریس کے کامیاب ترین اجلاسوں میں شمار کرنا چاہیئے۔ غالباً اس سے قبل اتنے مستشرقین بیک وقت ہندوستان میں جمع نہیں ہوئے تھے۔

کانگریس کے دس شعبے تھے جن میں سے ایک شعبہ علوم اسلامیہ سے متعلق تھا۔ اس شعبہ کی دس نشستیں ہوئیں۔ صدارت کے فرائض پروفیسر ولفریڈ کینٹول اسمتھ نے انجام دئے۔ اپنی تصانیف ـ (MODERN ISLAM IN INDIA) اور SLAMIN MODERN HISTORY کے باعث علمی حلقوں میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ شرکت کرنے والوں میں جرمنی کے پروفیسر آٹو اسپیس (OTTO SPIES) اور پروفیسر ایس۔ لبیب (S. LABIB) فرانس کے پروفیسر سی۔ پلا (C. PELLAT)، قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی کے پروفیسر کے۔ اے۔ سی کریسویل (K.A.C. CRESWELL)، امریکہ کے پروفیسر ایس۔ ڈی۔ گوئٹین (S.D GOITEIN)، ڈاکٹر ڈبلو۔ ایم۔ برنیر (W. M. BRINNER)، کناڈا کے پروفیسر سیوری (P. M. SAVORY) اور ڈاکٹر سی۔ ایڈمس (C. ADAMS)، انگلستان کے ڈاکٹر جے۔ این۔ ڈی۔ اینڈرسن (J.N.D. ANDERSON)، روس کے ڈاکٹر بی۔ جی۔ غفوروف (B.G. GAFUROV.) اور ڈاکٹر ایس عظیم جانوا (S. AZIM JANOVA)، متحدہ جمہوریہ کے ڈاکٹر عبدالرحمن بدوی اور ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی، اسرائیل کے ڈاکٹر

بلاؤ (J. BLAU) ڈاکٹر اے۔این۔پولیک (A. N. POLIAK) اور ڈاکٹر یوریل ہیڈ (URIEL HEYD) عراق کے ڈاکٹر یوسف عزیز الدین سیکریٹری عراق اکاڈمی، ایران کے ڈاکٹر سید حسین نصر، اٹلی کے ڈاکٹر ار۔روبی نیسی (R. RUBINACCI) اور ترکی کے ڈاکٹر نیازی رمضان آگلو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علوم اسلامیہ کے شعبہ میں ۷۱ مقالے پیش کیے گئے۔ ان میں سے ۳۱ مقالے ہندوستان، ۸ اسرائیل، ۶ متحدہ عرب جمہوریہ، ۵ امریکہ اور ۳ روس کے نمائندوں نے پیش کیے۔ فرانس، جرمنی، عراق، لبنان، اٹلی، ترکی، ایران، کینیڈا، وغیرہ کے نمائندوں نے ایک ایک دو دو مقالے پیش کیے۔ بیشتر مقالات انگریزی زبان میں تھے، لیکن بعض حضرات نے فرانسیسی، ترکی، عربی اور روسی زبانوں میں بھی اپنے مقالات پڑھے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ مقالات مذہب، ادب، فلسفہ، تاریخ، فنون لطیفہ، اقتصادیات، آثار قدیمہ وغیرہ مختلف فنون سے تعلق رکھتے تھے۔

ہندوستانی نمائندوں کے مقالات کی تعداد تو یقیناً زیادہ تھی، لیکن سب کا معیار یکساں نہیں تھا بعض میں سطحیت اور انتشار فکر کے آثار نمایاں تھے۔ یہ صورت حال تقریباً ہر سیکشن میں پیش آئی۔ بالآخر ایک ہندوستانی نمائندے ہی نے عام اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ مقالات کو کانفرنس کے لیے منظور کرنے سے پہلے ان کا معیار دیکھ لینا ضروری ہے۔

ہندوستانی نمائندوں نے جو مقالات پڑھے ان میں بعض کے عنوانات یہ تھے۔

۱) شاہ محب اللہ الہ آبادی اور ان کا متصوفانہ فلسفہ : ڈاکٹر یوسف حسین خاں

۲) رسول اکرمؐ کے عہد کی عربی شاعری میں تدوین سیرت کا مواد : ڈاکٹر عبد المعید خاں

۳) صوفیائے کے ملفوظات اور تذکروں کی تاریخی اہمیت : پروفیسر حسن عسکری

۴) شاہان مغلیہ اور ان کی سیاست پر نقشبندی اثرات : پروفیسر خلیق احمد نظامی

۵) اسلام اور مسلم : پروفیسر محمد اجمل خاں

۶) عرب اور CAPE OF GOOD HOPE کا چکر : ڈاکٹر مقبول احمد

۷) ہندوستان کا پہلا فارسی مصور سفر نامہ : پروفیسر نجیب اشرف ندوی

(۸) تصوف اور ویدانت کے بعض مشترک پہلو : ڈاکٹر سوبھا رانی باسو
(۹) بخاری سے پہلے کا حدیث اور تفسیر لٹریچر : ڈاکٹر یوسف الدین
(۱۰) خواجہ معین الدین چشتیؒ کا سنہ ولادت اور وفات : مولانا صباح الدین عبدالرحمن
(۱۱) ذوالقرنین : جناب سید اوصاف علی
(۱۲) سلوک الملوک میں مسلم نظم مملکت کا خاکہ : ڈاکٹر نظام الدین
(۱۳) حیٔ ابن یقظان لکھنے میں ابن طفیل کا مقصد : ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی
(۱۴) اسلام کے ۷۳ فرقے : ڈاکٹر عبدالعلیم
(۱۵) رومی اور اقبال کا نظریۂ محبت : پروفیسر نعیم الدین
(۱۶) مرزا ابوطالب اور ان کے سفرنامہ کی اہمیت پر دو مضامین

۱۔ چودھری ثروت علی ۲۔ جناب عتیق صدیقی

(۱۷) ذات اور صفات خداوندی کا تصور ترجمان القرآن کی روشنی میں : ڈاکٹر ایم ایم صدیقی
(۱۸) شیخ عراقی صوفی شاعر کی حیثیت سے : ڈاکٹر وائی۔ڈی۔ آہوجا

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنے مقالے میں شاہ محب اللہ الہ آبادی اور ان کی تصانیف کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے، ان کے فکر کی اہمیت اور شیخ محی الدین ابن عربی کے نظریات کی وضاحت میں اُن کے کارناموں کا ذکر کیا اور بتایا کہ دارا شکوہ نے ان ہی کے ذریعے امام اکبر کے نظریات سے واقفیت حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر عبدالمعید خاں نے عہد نبوی کی عربی شاعری کا تفصیلی جائزہ لے کر تدوین سیرت کے لئے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اور تمام ان اشعار کی نشان دہی کی جن میں رسول اکرمؐ کا اسم مبارک آیا ہے۔ پروفیسر حسن عسکری نے اپنے مضمون میں ملفوظات کی تاریخی اہمیت سے بحث کی اور بہار کے بعض صوفیا کے ملفوظات مثلاً مونس المریدین اور معدن المعانی میں جو تاریخی مواد ملتا ہے اس کی طرف توجہ دلائی۔ مشائخ نقشبند کے مغل بادشاہوں سے تعلقات کا جائزہ لیتے ہوئے راقم الحروف نے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریکوں کی نوعیت کو واضح کیا اور بتایا کہ سترویں اور اٹھارہویں صدی

کے ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ ان تحریکوں کے بغور جائزہ کے بغیر ممکن نہیں۔ CAPE OF GOOD HOPE) کا چکر لگانے میں عربوں نے جو جد وجہد کی تھی اس کی تفصیلات کو ڈاکٹر مقبول نے بیان کیا۔ بنارس کی ایک خاتون ڈاکٹر سوبھارانی باسو نے وحدت الوجود کی روشنی میں تصوف اور ویدانت کے مشترک پہلوؤں سے بحث کی۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے صفی بن ولی قزدینی کے فارسی سفرنامے کا تعارف کرایا اور بتایا کہ یہ سفرنامہ جناب شاہ معین الدین ندوی مرتب کر رہے ہیں۔

پروفیسر پیلا نے جو ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM کی مجلس ادارت کے ایک اہم رکن ہیں اپنی تقریر میں ان دشواریوں کا ذکر کیا جو ENCYCLOPAEDIA کا جدید ایڈیشن تیار کرنے میں پیش آرہی ہیں۔ اور جن کے باعث طباعت کی رفتار سست پڑتی ہے۔ پروفیسر کرلیسول نے، جو اسلامی فن تعمیر پر اس وقت دنیا کے ممتاز ترین ماہروں میں شمار کئے جاتے ہیں اور جن کی کتاب EARLY MUSLIM ARCHITECTURE اپنے موضوع پر مستند ترین کتاب مانی جاتی ہے، مجوف محراب کی ابتداء پر اپنا مقالہ پڑھا۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۳۶ء میں عراق کے ڈائرکٹر جنرل آثار قدیمہ شفیع بیگ الحصری نے ان سے دریافت کیا تھا کہ کوئی دو ایسے مقامات بتائیں جہاں کھدائی سے تاریخ اسلام کے اہم گوشوں پر روشنی پڑسکے۔ پروفیسر کرلیسول نے کوفہ اور واسط میں کھدائی کا مشورہ دیا۔ واسط میں کھدائی کے دوران میں حجاج بن یوسف کی بنوائی ہوئی مسجد کے آثار ملے۔ یہ مسجد ۸۳-۸۴ھ ۷۰۲-۷۰۳ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ پروفیسر کرلیسول کے قول کے مطابق یہ آثار تاریخ اسلام میں مسجد کے سب سے قدیم آثار ہیں۔ اسلامی آثار پر دوسرا اہم مقالہ ڈاکٹر ایچ این چیٹک (H. N. CHITTICK) کا تھا جس میں انھوں نے مشرقی افریقہ میں اسلامی آثار پر تفصیلی بحث کی تھی۔ ڈاکٹر چیٹک خود دارالسلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی سلسلہ کا ایک اور دلچسپ مقالہ ڈاکٹر کلاس برِش (KLAUS BRISCH) کا تھا جس میں عہد بنی اُمیہ کے ایک قلعہ کا حال بیان کیا گیا ہے جو شام میں قاہرہ کی GERMAN ARCHAEOLOGICAL INSTITUTE اور

(DEUTSCHE FORSCHUNGSGE MEINSCHAFT) نے کمرانی کے دوران میں دریافت کیا ہے۔

علوم قرآن پر جو مقالات پیش کئے گئے ان میں متحدہ عرب جمہوریہ کی ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی کا مقالہ کافی دلچسپ تھا۔ انھوں نے قرآن کی روشنی میں مترادف الفاظ کے مسئلہ پر بحث کی۔

فقہ اسلامی پر جو مقالات پڑھے گئے اُن میں جرمنی کے ڈاکٹر ایس لبیب (S. LABIB) کا مقابلہ مسئلہ بدعت پر، لبنان کے ڈاکٹر جوسف فان ایس (JOSEPH VAN ESS) کا مقالہ ابن کلتب پر، اور اسرائیل کے ڈاکٹر اوریل ہائڈ (URIEL HEYD) کا مقالہ عثمانی نظام تعزیرات میں قانون اور شریعت پر، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر لبیب نے چودہویں صدی کے ایک عالم ادریس ابن عبداللہ اکتر کمانی الحنفی کی "کتاب اللمع" کی روشنی میں مسئلہ بدعت پر مختلف پہلو سے بحث کی۔

اسلامی فنون پر دو مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک امریکن خاتون ڈاکٹر گلنار کے بوچ (GULNAR.K.BOACH) نے مسلمانوں کے فن جلد سازی پر نہایت دلچسپ مضمون پڑھا۔ اور ایک روسی خاتون ڈاکٹر عظیم جانوا (AZIM JANOVA) نے خط بابری پر نہایت پرمغز مقالہ پیش کیا اور خط بابری کے نمونے دکھا کر اس کی خصوصیات واضح کیں۔

نئے تاریخی مواد پر جو مضامین پیش کئے گئے ان میں ڈاکٹر ایس گوئیٹن S. GOITEIN کا مضمون بعض عربی دستاویزات کی روشنی میں ہندوستان اور بحیرہ روم کے ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات کی تفصیلات، اور اسرائیل کے ڈاکٹر ذوی انکوری (ZVI ANKORI) کا مضمون کریٹ میں عہد اسلامی میں یہودیوں کی حالت عثمانی سجلات کی روشنی میں، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر گوئیٹن نے CAIRO GENIZA کی روشنی میں ہندوستانی تجارت سے متعلق دلچسپ تحقیقات پیش کیں۔ اور بتایا کہ عہد وسطی

میں مسلمان، ہندو، عیسائی اور یہودی تاجر مل کر تجارت کرتے تھے۔ ان کاغذات میں بعض نام ایسے ہیں جو اب تک متعین نہیں ہو سکے ہیں اور جن کی وضاحت میں مدد کرنے کے لئے ڈاکٹر گوئیٹن نے خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے اہلِ علم سے درخواست کی۔

خلفاءِ بنی عباس اور زوالِ بغداد سے متعلق بھی بعض دلچسپ مقالات پیش کئے گئے۔ اسرائیل کے ایک پروفیسر ڈاکٹر ڈی ایالون (D. AYALON) نے خلفاءِ بنی عباس کے مملوک اور ان کے ح.و.د مملکت پر ایک مضمون پڑھا۔ متحدہ عرب جمہوریہ کے ایک عالم ڈاکٹر یحییٰ الخشاب نے مسلمان مورخین اور منگولوں کے حملہ بغداد پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ جناب عباس ہمدانی نے اپنے مقالہ میں فاطمیوں اور عباسیوں کے درمیان ہندوستان میں جو کش مکش ہوئی تھی۔ اس کی تفصیل بیان کی۔ جرمنی کے ڈاکٹر اوٹو اسپیس (OTTO SPIES) نے منگولوں کی فتح بغداد کے متعلق تاج الدین السبکی کی طبقات الشافعیہ میں جو نئی معلومات ملتی ہے، اس کی طرف توجہ دلائی۔

اسلامی فلسفہ پر جو مضامین پیش کئے گئے تھے اُن میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بدوی کا مقالہ یونانی فلسفہ کی کتابوں کے عربی ترجمے، اور ڈاکٹر سید حسین نصر کا مضمون "ملا صدرا اسلامی فلسفہ کے مآخذ کی حیثیت سے" خاص طور پر دلچسپی سے سنے گئے۔

سیاسی اور تاریخی مباحث پر امریکہ کے ڈاکٹر ڈبلو۔ ایم۔ برنر (W.M. BRINNER) کا مضمون "مملوک مصر میں اقتدار کے لئے کش مکش"، کناڈا کے پروفیسر پی ایم سیوری (P.M. SAVORY) کا مقالہ "مرزا سلمان کے قتل کی سیاسی اہمیت"، اور روس کے ڈاکٹر غفوروف (GAFUROV) کا مضمون "مشرقی عربی ممالک کے تاریخی روابط وسط ایشیا کے ساتھ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ عراق اکاڈیمی کے سیکریٹری ڈاکٹر یوسف عزیز الدین نے ۱۹ ویں صدی میں عراق کے نظم مملکت پر مقالہ پیش کیا۔ اور ڈاکٹر LENCZOWSKI نے بیسویں صدی میں مشرقِ وسطیٰ کے بدلتے ہوئے سیاسی نظام پر بحث کی۔ پروفیسر نیازی عثمان اگلو نے مشرقِ وسطیٰ میں عربوں کی نوآبادیوں پر ترکی زبان میں مقالہ پیش کیا اور

ڈاکٹر ایل ایسن نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا۔ یہ سب مقالات دلچسپی سے سُنے گئے۔

علاوہ ازیں بعض مضامین ندرت عنوان اور جدت فکر کی بنا پر کافی جاذب توجہ تھے۔ بالخصوص ڈاکٹر ابراہیم پولیک (ABRAHAM POLIAK) کا مضمون "عربوں اور مغرب کے درمیان کش مکش کے اسباب سیاست ارضی (GEOPOLITICS) کی روشنی میں" اور ڈاکٹر ایم مختاروف (M. MUKHTAROV) کا مقالہ "دہقان" کے تاریخی ارتقا پر بڑے دلچسپ اور پر مغز تھے۔

اگر مباحث کی نوعیت سے مختلف ملکوں کے علمی اور تحقیقی رجحانات کا کوئی اندازہ ممکن ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی مقالات میں تصوف، اسرائیلی علماء کے مضامین میں سیاست ارضی، روسی فاضلوں کے مقالات میں وسط ایشیاء کی تمدنی تاریخ، مصری علماء کے مضامین میں تاریخ و ادب، اور امریکی ماہرین کے مقالوں میں نظام مملکت اور تجارتی تعلقات کی نوعیت پر زور تھا۔

علوم اسلامیہ ہی کے ضمن میں دو چیزوں کا ذکر ضروری ہے۔ ایک مسلم پرسنل لا پر سمینار، جس کی صدارت مسٹر چھاگلا نے کی اور جس کے سیکریٹری پروفیسر محمد مجیب تھے۔ اس سے متعلق تفصیلی رپورٹ اسی شمارہ میں شامل ہے۔ دوسرے نادر عربی اور فارسی مخطوطات کی نمائش جس کو جناب حکیم عبد الحمید نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی جانب سے ترتیب دیا تھا۔ اور جس میں بعض نادر مخطوطات جمع کر دیئے گئے تھے۔ اس میں ہندوستان کی جلد سازی کا ایک نمونہ بھی تھا جو اپنی خصوصیات میں منفرد تھا۔ اس نمائش میں سب سے زیادہ قدیم نسخہ ترجمہ تفسیر طبری کا تھا جو چوتھی صدی ہجری میں نقل ہوا تھا۔

۱۸۷۴ء میں پروفیسر میکس ملر (MAX MULLER) نے اس کانگریس کے دوسرے اجلاس میں جو الفاظ کہے تھے، ان ہی پر اس مختصر تعارف کو ختم کرنا

- 7 FEB 1964

مناسب ہوگا۔ بیکس ملر نے کہا۔

"مجھ سے بارہا دریافت کیا گیا ہے کہ مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس سے کیا فائدہ ہے؟ میں خیال کرتا ہوں کہ اس نوعیت کی علمی کانفرنسوں کے دو فائدے ہیں۔ اول تو یہ کہ ان سے ہمیں موقع ملتا ہے کہ اپنا جائزہ لیں، اپنے کام کا دوسروں کے کام سے مقابلہ کریں اور یہ پتہ لگائیں کہ ہم کہاں ہیں اور ہمیں کہاں ہونا چاہیئے تھا!

دوسرے یہ کہ ان اجتماعات کے ذریعہ ہم وقتاً فوقتاً دنیا کو یہ بتا سکتے ہیں کہ ہم کہاں ہیں، ہم نے دنیا کے لئے کیا کیا ہے اور ہم دنیا سے اپنے لئے کیا توقع رکھتے ہیں۔"

مستشرقین کی خدماتِ اُردو

مستشرقین کا خیر مقدم

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

[مستشرقین کی بین اقوامی کانگریس کے اجلاس دہلی سے فائدہ اٹھا کر دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے "مستشرقین کی خدمات اردو" کے عنوان سے ایک سمپوزیم کا انتظام کیا تھا جس میں چند بیرونی مستشرقین نے شرکت کی اور دلی یونیورسٹی کے بعض اساتذہ نے مقالے پڑھے۔ ان کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

سمپوزیم کا افتتاح نائب صدر جمہوریہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب فرمانے والے تھے، مگر عین وقت پر علالت کی وجہ سے موصوف تشریف نہیں لا سکے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں پہلے ذاکر صاحب کی علمی خدمات کا ذکر کیا تھا، اس کے بعد مستشرقین سے خطاب کیا]

میں ان محترم مستشرقین کو بھی خوش آمدید کہنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جن کے علمی فیوض نے یورپ اور ایشیا کے درمیان ایک شاہراہ بنا دی ہے جس پر اہل علم کے قافلے ہمیشہ چلتے رہیں گے۔ آپ حضرات اتنا دور دراز سفر کر کے اورنٹیل کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لائے اور نیز ہمارے مذاکرے کو اعزاز بخشا۔ اس کے لئے تہہ دل سے شکر گزار اور آپ کی قیمتی امداد اور علم دوستی کا احسان مند ہوں۔

دلی اردو کا وطن ہے۔ یہ ہندوستان کا دل ہے جو تمام مقامی اور صوبہ وارانہ حد بندیوں سے

جاتا ہے۔ یہ قومی یک جہتی کا ایک ایسا نشان ہے جس کی وحدت میں تمام کثرتیں ضم ہو جاتی اور تمام تہذیبیں شیر و شکر ہو جاتی ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ دہلی نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام مشرق میں ایک امتیازی حیثیت کی مالک ہے، اس کی عالی شان عمارتوں، خوب صورت مساجد اور مدارس سے اوران کے علمی امتیاز سے آپ سب واقف ہیں۔ آج یہ جدید آزاد جمہوریہ ہندوستان کا دارالسلطنت ہے، جہاں قدیم وجدید، مشرق و مغرب، ماضی و حال آگے گلے ملتے ہیں۔

ہماری تہذیب کا سب سے نمایاں مظہر وہ مرمریں خواب ہے جس کو تاج محل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یا پھر وہ محبت کا نغمہ جس کو اردو کہتے ہیں۔ ہماری تہذیبی زندگی کے دو اہم نشانوں یعنی اردو اور تاج محل میں مماثلت یہ ہے کہ اس میں عرب، ایران، مغل اور مغربی ممالک کے بہترین صناعوں کا خون جگر شامل ہے۔ اردو نے ہمیشہ قومی یک جہتی اور یک رنگی کے عناصر کو فروغ دیا۔ انسانیت اور اخوت اس کے خمیر میں ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ فاضل مستشرقین نے ہمیشہ اس زبان کے مقاصد کو ترقی دینے اور اس کے خزانے کو علمی جواہر سے مالامال کرنے کی سعی کی ہے۔ اگر اردو ادب کو تخلیقی تجربات کا مخزن کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے دریچے مشرق و مغرب کی ہواؤں کے لئے کھلے ہوئے ہیں اور مستشرقین کا اس کی تعمیر و ترقی میں نمایاں حصہ ہے۔

جناب والا

یہی نقطہ نظر تھا جس کے تحت ان ذی علم مستشرقین کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شعبہ اردو دلی یونیورسٹی کی جانب سے یہ مجلس مذاکرہ منعقد کی جا رہی ہے۔ جس کا موضوع اردو کی اشاعت میں مستشرقین کا حصہ ہے۔ اس موضوع کی ندرت اور انوکھا پن مسلّم ہے۔

مجھے اجازت دیجئے کہ لفظ "مستشرق" کے بارے میں کچھ عرض کردوں۔ سنہ ۱۶۸۳ء میں یہ لفظ صرف ان لوگوں کے لئے استعمال ہوتا تھا، جن کا تعلق یونانی یا مشرقی کلیسا سے تھا۔ سنہ ۱۶۹۱ء میں اس لفظ کو ان لوگوں کے لئے مخصوص سمجھا گیا، جو مختلف مشرقی زبانوں سے

واقف تھے۔ لارڈ بائرن نے ایک جگہ مسٹر تھارن ٹن کے سلسلے میں اس کے گہرے مستشرقانہ اشارات کا ذکر کیا ہے۔ ہند کے تعلیمی مسائل کی بحث کے دوران میں ۱۸۳۴ء میں میکالے کی یادداشت کی بنا پر یہ طے ہوا کہ وہ لوگ جو ہندوستانی علوم اور ادب کے علم بردار ہوں، وہ مستشرق کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اس مشہور بحث کے نتیجہ کے طور پر جو جذبات بر دئے کار آئے، ان کی بدولت مستشرق کے لفظ کے ساتھ ایک بدنامی کا دھبا لگ گیا۔ یہی سبب ہے کہ ایک مستشرق نے لکھا تھا کہ زمانے نے مجھے عرب بنا دیا، مگر مستشرق ہونے کی کج روی سے محفوظ رکھا۔" میکالے لکھتا ہے کہ مجھے ایک بھی مشرقی زبانوں کا طالب علم ایسا نہیں ملا جو مجھے مطمئن کر سکتا، کہ تمام مشرقی ادب یورپ کے ادبیات عالیہ کا عشر عشیر بھی ہے۔"

ان مستشرقین کی خدمات نے جو مشرقی ادب اور السنہ کے ماہر ہیں، ثابت کر دیا ہے کہ میکالے کا یہ بیان حقیقت کے خلاف تھا۔ گوتم بدھ کا قابل قدر ورثہ، وہ تخیل آفریں ذہن، جس نے مہا بھارت کو جنم دیا۔ وہ انسانوں اور دیوتاؤں کے افسانے، جو مذہبی ڈراموں کا موضوع ہیں، وہ مذہبی سرگرمی جو رگ وید کے بھجنوں کی محرک ہوئی جیوانات کی وہ قدیم کہانیاں جو ایسپ کی حکایات کے روپ میں یورپ پہنچیں اور آج تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تبت کے پہاڑوں اور غاروں میں مراقب راہبوں کے مابعد الطبیعاتی اور متصوفانہ افکار اور کنفوسشس کی عملی اور ظرافت آمیز حکمت مطالعہ کے خاص موضوعات بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ عربی زبان جو اپنی حیرت انگیز ساخت اور اپنے بے لوچ اور مؤثر انداز کے لئے مشہور ہے۔ اس کا بےمثل خزانۂ الفاظ۔ اس کی مکمل گرامر، فن بلاغت، علم لغات، لسانیات، اس کا عظیم الشان ذخیرہ فقہ۔ فلسفہ۔ ریاضیات اور اس طرح ترکی، ایرانی اور اردو زبان کا سرمایہ شاعری ایسے مباحث ہیں جو تحقیقات کے متقاضی ہیں اور بقول اشپرنگر صدیوں تک مستشرقین کی توجہ کا مرکز بن سکتے ہیں۔

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ اس [illegible]

کا حصہ ہے۔ مثلاً جان کیشلر۔ بیچمن بیڈے۔ جان گل کرائسٹ۔ ٹیلر۔ اشپرنگر۔ ہنٹر۔ گارساں دتاسی۔ فیلن۔ پلیٹ۔ جان شکسپیئر۔ گریرسن۔ اوران کے بے شمار رفقا وغیرہ۔ ان لوگوں نے اردو کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔ ان کے کارنامے کبھی نہ تھکنے والی سعی اور بے مثال استقامت کا نمونہ ہیں۔ اس مذاکرے سے ہمارا مقصد دراصل تین مستشرقین — "ڈاکٹر اشپرنگر"، "ڈاکٹر گارساں دتاسی" اور "ڈاکٹر جان گل کرائسٹ" کی ادبی خدمات کا جائزہ لینا ہے۔

اردو ہندوستان کی مقبول ترین زبان ہے —— ڈاکٹر دیش مکھ کی تقریر

دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سی۔ ڈی دیش مکھ نے سمپوزیم کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب افتتاح کرنے والے تھے، مگر اچانک علالت کی وجہ سے نہیں آسکے۔ اصل میں اس اہم سمپوزیم کے افتتاح کے لئے وہی موزوں تھے ان کی تقریر یقیناً آپ کی دلچسپی کا باعث ہوتی لہٰذا کا ذکر کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اردو اپنے متعین معیاروں کی بنا پر ملک کی مقبول ترین زبان ہے جب کہ دوسری زبانیں متعدد بولیوں پر مشتمل ہیں جو علاقائی خصوصیات کے زیر اثر بدل جاتی ہیں اور اسی لئے ان کے معیار متعین نہیں ہوسکے۔ اس کے برعکس اردو صدیوں سے اپنے اسالیب کو اپنی ہی کسوٹی پر کستی اور اپنے معیاروں پر جانچتی رہی ہے اور اس طرح جو اعلیٰ اسلوب وجود میں آیا ہے وہ دراصل نتیجہ ہے ملکی زبان اور متعدد بیرونی اثرات کے باہم ملاپ کا اور اسی کی بدولت عربی و فارسی زبان و ادب کی بیش بہا دولت سے ہمارے ملک کے زبان و ادب مالامال ہوسکے ہیں۔ آپ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ دیوناگری اور فارسی دونوں رسم خط میں لکھے جانے والی ہندوستانی کو ہی ہندوستان کی سیکولر جمہوریہ کی قومی و سرکاری زبان ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ اسی طریقے سے اسلوب کی نزاکتوں اور لطافتوں کے اظہار اور ٹکنیکل اصطلاحات کے تراجم کے سلسلے میں سنسکرت اور عربی و فارسی دونوں ذرائع سے استفادہ

کیا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر دیش مکھ نے فرمایا: "اردو جو کہ پانچ کروڑ ہندوستانیوں کی زبان ہے، بجا طور پر اس ملک کے سب سے بڑے گروہ کی زبان ہونے کا دعوی کر سکتی ہے کیونکہ زبانیں مقامی بولیوں میں بٹی ہوئی ہیں اور ان میں معیاروں کی وحدت ناپید ہے۔ اردو کی اس دولت مندی کا سب سے بڑا سبب وہ قیمتی ورثہ ہے جو اس نے ہندوستان، عرب، ایران، ترکی اور مغربی ممالک سے حاصل کیا ہے۔"

موصوف نے ان مستشرقین کی تصانیف کے مطالعے کی اہمیت پر بھی زور دیا جنھوں نے اپنے عرصہ حیات کو سنسکرت، اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ آپ نے مستشرقین کی ان تھک محنت و مشقت اور صبر و سکون کو سراہا اور فرمایا کہ ابھی ایسے ہزارہا مخطوطات کا دریافت ہونا باقی ہے جو نہ صرف یورپ کے کتب خانوں میں ہی بلکہ ہمارے پڑوسی ملکوں (مثلاً نیپال) میں ہوں گے جہاں انھیں کسی زمانے میں بھیج دیا گیا تھا۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ حکومتِ نیپال نے ایک قومی آرکائیوز کے قیام اور ایسے مخطوطات کے تحفظ کا فیصلہ کر لیا ہے جن سے ہندوستان کی تاریخ اور ادبیات سے متعلق اہم معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔ ان مخطوطات کے مطالعے سے ہندوستانی ادبیات خصوصاً اردو کو بہت فائدہ ہوگا اور مستشرقین کی کوششیں بارآور ہونگی۔

مقالوں کے خُلاصے

تلخیص و ترجمہ: صدیق الرحمن قدوائی

ڈاکٹر الوے اشپرنگر — از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

۱۴۹۸ء میں جب ہندوستان کے بحری راستے کی دریافت نے مغربی تاجروں کے لئے اس سرزمین پر منفعت بخش تجارت کے امکانات پیدا کئے تھے اسی وقت مغربی عالموں اور دانشوروں نے بھی اسی سمت سے ایک خاص کشش محسوس کی۔ اسی وقت سے مغربی عالموں کی ہندوستان سے دلچسپی کی داستان شروع ہوتی ہے۔ ان قابلِ قدر شخصیات نے اس راہ میں بے شمار ناقابلِ بیان مصائب برداشت کئے اور مشرق کو سمجھنے اور سمجھانے میں اپنی عمریں تیاد دیں اور آنے والوں کے لئے علم اور تجربے کی بے پناہ دولت چھوڑ گئے۔ ان ہی عظیم الشان شخصیتوں میں ایک ناقابلِ فراموش شخصیت ڈاکٹر اشپرنگر کی تھی۔

اشپرنگر ۳ ستمبر ۱۸۱۳ء کو جرمنی کے ایک مقام ٹائی رول میں پیدا ہوا۔ ابھی نوخیز ہی تھا کہ مشرقی زبانوں سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اپنی ماں کے نام سے مشرقی علوم سے متعلق مضامین لکھنے شروع کئے بالآخر ۱۸۳۶ء میں پیرس ہوتا ہوا لندن پہنچا اور انگلستان کی شہریت اختیار کرلی۔ یہیں اس نے عرب طب پر اپنا مقالہ پیش کیا جس پر اسے ایم۔ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے ۱۸۴۳ء میں کلکتے پہنچا۔ ۱۸۴۴ء میں دہلی کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے اس کا تقرر ہو گیا۔ یہاں وہ ۱۸۴۸ء تک رہا اور اس دوران میں اس نے صوفیوں کی اصطلاحات پر ایک کتاب انگریزی میں اور پھر ایک اردو گرامر مرتب کی۔ اس کے قیام دہلی ہی کی یادگار وہ ہفتہ وار اردو جریدہ تھا، جو اس کے لیتھوگرافک پریس میں چھپا کرتا

اور جس کا نام "قران السعدین" تھا۔ جس کا نام ہی مشرق و مغرب کو قریب تر لانے کی خواہش کا آئینہ دار ہے۔ یہ جریدہ جس میں زیادہ تر سائنسی مضامین شائع ہوتے تھے، تاریخ صحافت ہند میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اشپرنگر لکھنؤ میں بھی مقیم رہا اور یہیں اس نے شاہانِ اودھ کے کتب خانوں کے مخطوطات کی فہرست مرتب کرنے کا اہم کام انجام دیا۔ بدقسمتی سے یہ سارے کتب خانے ۱۸۵۷ء میں تباہ ہو گئے۔

انڈیا آفس لائبریری لندن کے لائبریرین مسٹر سٹن کی عنایت سے مجھے لکھنؤ کے مسلم کتب خانوں کی تحقیقات سے متعلق روداد کا اصل نسخہ دیکھنے کا شرف حاصل ہوا جسے اشپرنگر نے مرتب کیا تھا۔

۱۔ یہاں فارسی شاعری کو ہندوستانی شاعری ہی سمجھا جاتا تھا مغل بادشاہوں کی قیام نوازی کی بدولت ایران کے بڑے بڑے شعرا یہاں آکر رہے۔ ان کے علاوہ ہندوستان کے فارسی شاعر بھی ایرانی شاعروں سے ٹکر لیتے تھے اور اس لئے شاید خود ایران میں فارسی شاعری کے متعلق اتنے مخطوطات نہیں جتنے کہ ہندوستان میں ہی ہیں۔

۲۔ اشپرنگر مغلیہ دور کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی کے زوال سے واقف تھا اور اردو کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا بھی اسے پورا اندازہ تھا جس کا اس نے جا بجا ذکر کیا ہے وہ اردو کتابوں کی کمی کے ذکر کے ساتھ ان کی عظمت کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اور سب اہم شعراء کی کلیات کا حوالہ بھی دیتا ہے جو ان کتب خانوں میں موجود تھیں۔ شاعروں کی اس فہرست میں ولی، میر، سودا، جرات، درد، قائم، یقین، مصحفی، اور ظفر بھی شامل ہیں۔

۳۔ اشپرنگر توپ خانے کی لائبریری اور کتب خانہ فرح بخش کی بے انتہا تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام ضروری موضوعات سے متعلق کتابوں کا جتنا بڑا پرانا اور قیمتی ذخیرہ ان دو کتب خانوں میں محفوظ ہے وہ دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

۴۔ وہ اس عام خیال کی تردید کرتا ہے کہ قصہ چہار درویش فارسی داستانوں سے ماخوذ ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ہندی سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ قصہ چہار درویش کے ایک فارسی مخطوطے کے بیّن لفظ سے نقل کرتا ہے، جس میں یہ بات صراحت کے ساتھ رقم ہے کہ "..... سرگزشتے از گزشتگان قلندران بزبانِ ہندی بود۔"

۵۔ انگریزی کتابوں کے فارسی تراجم بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جو غیاث الدین حیدر کے لئے کئے گئے تھے۔ یہ نادر ذخیرہ کہانیوں، سفرناموں، سائنس اور تاریخ سے متعلق کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس دورِ زوال میں غیاث الدین کی مغربی سائنس سے دلچسپی اہم اور قابلِ غور ہے۔

اشپرنگر پچیس زبانیں جانتا تھا۔ قرآن السعدین کی اشاعت اور قدیم کتب خانوں کے بارے میں اس کی تحقیق ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو سے کس قدر لگاؤ رکھتا تھا۔ وہ فارسی سے بھی بخوبی واقف تھا۔ چنانچہ گلستانِ سعدی کا جو ایڈیشن اس نے ۱۸۵۱ء میں شائع کیا تھا اس پر اظہارِ پسندیدگی کے طور پر شاہِ اودھ نے اسے ایک ہاتھی بھی انعام میں دیا تھا۔

اشپرنگر ہندوستان میں مختلف اہم عہدوں پر فائز رہا۔ وہ کچھ عرصے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا سکریٹری اور پھر تاحیات اعزازی رکن رہا۔ ہندوستان سے جانے کے بعد بھی وہ مشرقی زبانوں کے درس و مطالعہ میں مصروف رہا۔ میں نے ۱۹۵۷ء میں ان مخطوطات کو دیکھا ہے جو اشپرنگر یہاں سے لے گیا تھا۔ یہ بڑے نادر مخطوطات ہیں اور کسی ذخیرے میں دہ مجلس کا وہ نسخہ بھی تھا جو دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو نے شائع کیا ہے۔ اشپرنگر نے اردو کی جو خدمت کی ہے اس کی بنا پر اس کا نام ہمیشہ باقی رہے گا اور اسے احسان مندی اور تشکر کے جذبات کے ساتھ یاد کیا جاتا رہے گا۔

گارساں دتاسی ـــــــ از ڈاکٹر محمد حسن

گارساں دتاسی ان چند نادرِ روزگار شخصیات میں سے تھا جو نہ صرف اپنے علم و فضل کی بنا پر ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا بلکہ گارساں دتاسی کی شخصیت جس سپردگی، خلوص اور لگن کا مرقع تھی۔ مدتوں تک طالب علموں اور عالموں کے لئے ایک روشن اور یادگار مثال کے طور پر وہ زندہ رہے گا۔ وہ ۲۰ جنوری ۱۷۹۴ء کو مارسائی میں پیدا ہوا تھا۔ اور حسن اتفاق ہے کہ آج سے ٹھیک دس دن بعد اس کا ایک سو ستر سالہ یوم پیدائش آئے گا اس لئے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج یہاں اس کے عظیم الشان کارناموں کو یاد کیا جا رہا ہے اور اسے خراجِ عقیدت پیش کیا جا رہا ہے۔

دتاسی کو بچپن سے ہی عربی زبان سے دلچسپی تھی۔ بڑا ہو کر وہ عربی سیکھنے کے لئے پیرس گیا جہاں اس نے اس دور کے مشہور مستشرقین کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا عربی کے ذریعے وہ فارسی تک پہنچا اور پھر اردو سے اس کی دلچسپی بڑھی اور بالآخر اسی کا ہو رہا۔ وہ فرانس کے مختلف اہم علمی اداروں سے وابستہ رہا اور مشرقی زبانوں کے درس و تدریس میں بڑے انہماک سے دلچسپی لیتا رہا۔ وہ فرانس کی ایشیاٹک سوسائٹی کے بانیوں میں سے تھا اور اس کا نائب سکریٹری بھی رہا۔ اس کے بعد وہ مشرقی زبانوں کے اسکول کا ڈائریکٹر اور پھر اسی ادارے میں ہندوستانی زبان کی تدریس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی سیاسی معاشی اور تہذیبی زندگی میں اس کی بنیادی اہمیت اور نوجوانوں کے لئے اس کے مطالعے کی ضرورت پر زور دیتا رہا اور اپنے گرد طلبہ کا ایک بڑا گروہ جمع کر لیا۔ وہ یہاں ہر سال ہندوستانی زبانوں اور دوسرے ہندوستانی علوم پر مسلسل لکچر دیتا جو یہاں سے متعلق تمام اہم امور پر جاری ہوتے۔ وہ ان خطبات کو مرتب کرنے میں ہندوستان کے پبلشوں، رسالوں، اخباروں اور دوستوں کے مراسلوں سے مدد لیتا۔ اس طرح اس نے ایک سر[illegible]

دیئے صرف یہ تعداد ہی اس کے کام کی وسعتوں کے اندازے کے لیے کافی ہے۔

اس کے علاوہ میر امن اور تحسین کی مثنویوں کے تراجم قصہ گل بکاؤلی، مرثیہ مسکین اور سرسید احمد خاں کی آثار الصنادید کے خلاصے۔ اکرام علی کی اخوان الصفا، میر امن کی باغ و بہار اور نہال چند لاہوری کی "تاج الملوک و گل بکاؤلی" کے اہم حصے شائع کیے۔ اس طرح اس نے پہلی بار مغرب کو ہندوستانی ادب اور اس کے مزاج سے روشناس کرایا۔ ان میں سب سے بڑھ کر ہندوستانی ادب کی تاریخ ہندوستانی۔ فرانسیسی اور فرانسیسی ہندوستانی لغت، اُردو گرامر، ہندوستان کی مشہور شاعرات اور اہم مصنفین کی تصانیف پر اس کی تالیفات وہ اہم سرمایہ ہیں جو ہمیں دتاسی نے عطا کیا۔ اس نے ۱۸۳۶ء میں بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد دیوانِ ولی شائع کرایا۔ اس سلسلے میں اس نے اس دیوان کے تمام ایسے مخطوطات سے استفادہ کیا جو اسے دستیاب ہو سکتے تھے۔

ہندوستانی ادب کی تاریخ کے متعلق اس کی کتاب ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے اور خود اس کے بیان کے مطابق اس میں ساڑھے تین ہزار شاعروں کا ذکر ہے۔ جن میں چھ سو دہلوی شعرا اور چار سو بیس لکھنوی شعرا بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ اور اگرچہ ہمارے دوسرے تذکروں سے بہت ملتی جلتی ہے پھر بھی اس کی نقادانہ صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔ یہ بات اہمیت سے خالی نہیں کہ مولوی کریم الدین نے اپنی کتاب طبقات شعرائے ہند" تمام تر اسی کے مطابق مرتب کی تھی۔

مگر اس کے خطبات اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہیں۔ یہ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک سال بہ سال پڑھے جاتے رہے صرف ۱۸۵۸ء میں توقف ہوا جس کی وجہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی بنا پر مواد کی فراہمی میں اس کی دشواریاں اور مجبوریاں تھیں۔ اس کے بعد اس نے مقالات لکھنے شروع کیے جو ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۷ء تک لکھے جاتے رہے [illegible]

میں پورا سی برس کی عمر میں وہ اس دنیا سے چل بسا۔

گارساں دتاسی کو اردو کے مطالعے کا شوق گل کرسٹ کی کتابوں کے مطالعے سے ہوا۔ اس نے جان شیکسپیر سے بہت زیادہ اثر قبول کیا تھا۔

دتاسی کے خطبات ومقالات آج بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ہماری تاریخ کے ایک اہم دور کے حالات وواقعات پر مفصل روشنی ڈالتے ہیں اور ایسی معلومات فراہم کرتے ہیں جن کا آج حاصل ہونا انتہائی دشوار مگر بڑا کارآمد ہے۔ ان تحریروں میں ہندوستان کی ادبی سرگرمیاں، سیاسی معرکہ آرائیاں، تہذیبی جھلکیاں، یہاں کے درباروں کے احوال ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقدامات سے متعلق ہندوستان کا ردعمل اور اس کے اپنے خیالات غرض کہ سب ہی کچھ محفوظ ہے جس کا مطالعہ آج بھی ہندوستانی ادب، تاریخ اور تہذیب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر جان بورتھ وِک گل کرسٹ —— از صدیق الرحمٰن قدوائی

گل کرسٹ پہلا شخص تھا جس نے ہندوستان کی عام زندگی میں یہاں کی عام بول چال کی زبان کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو محسوس کیا اور اس زبان کے مزاج، اس کے اصول و قواعد اور لغت ومحاورے اور اس کے صوتی ولسانی نظام کی طرف توجہ کی اور اس کے مطالعے اور تحقیق و تدریس کے سلسلے میں پہلی بار باقاعدہ اور منظم کوشش کی۔ اس سے قبل غیر ملکی سیاحوں، مشنریوں، تاجروں اور افسروں نے انفرادی طور پر اپنی روزمرہ کی چھوٹی موٹی ضروریات کے پیش نظر توجہ تو ضرور کی تھی مگر یہ سب کوششیں نسبتاً غیر اہم تھیں اور ان سے کوئی اہم نتیجہ برآمد نہیں ہوا گل کرسٹ نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نہ صرف اس کی [illegible] کا اندازہ کیا بلکہ اسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ ایک غیر ملکی اقتدار کے [illegible] کے ذریعہ اہم اور بنیادی کام انجام دیئے جا سکتے ہیں بلکہ اس کے [illegible]

ہیں۔ گل کرسٹ طبعاً علمی مشاغل کی طرف مائل تھا چنانچہ ملک کی خدمت کے جذبے اور علم کی طرف فطری رجحان نے باہم مل کر اس کے ذہن و کردار کی ساخت و پرداخت کی۔ ابتدا میں وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے تنہا سرگرمِ عمل رہا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو "ہندوستانی" کی اہمیت سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس سلسلے میں اسے بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا جو ایک اجنبی ملک میں عام طور پر پیش آتی ہیں۔ مگر وہ ہمت نہ ہارا اور بالآخر اسے کامیابی حاصل ہوئی۔

گل کرسٹ انگلستان کی طب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نوکری کی تلاش کے لئے ہندوستان آیا۔ یہاں وہ فوج میں ملازم ہوگیا۔ فوج کے ساتھ اس نے ہندوستان کا طویل سفر کیا۔ وہ پہلے بمبئی سے فتح گڑھ آیا اور یہاں سے کلکتے گیا اور اسی دوران میں اسے ہندوستانی زبان کی مقبولیت اور وسعت کا اندازہ ہوا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ فارسی کا زور رفتہ رفتہ گھٹ رہا ہے اور ہندوستان کی عام زبان کم از کم شاعری کی حد تک ادبی حیثیت بھی حاصل کر چکی ہے۔ مگر جب اس نے زبان کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہا تو اسے کوئی ایسی کتاب دستیاب نہ ہو سکی جو اس سلسلے میں اس کی مدد کر سکے۔ اس نے محسوس کیا کہ یہی وقت اس کے تمام ہم وطنوں کو پیش آتی ہے لہذا یہ کام لائق توجہ ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی اس زبان کی تحقیق کے لئے وقف کر دی۔

گل کرسٹ کا خیال تھا کہ ہندوستانی زبان اس "ہندوی" کی ترقی یافتہ شکل ہے جو مسلمانوں کی آمد سے قبل بولی جاتی تھی۔ ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات نے جن نئے تہذیبی عناصر کو جنم دیا ان میں یہ زبان بھی شامل ہے جو اب ہندوستان کے تمام باشندوں کی مشترک زبان ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں علاقائی اثرات کی بنا پر اس کی شکل میں تھوڑا بہت فرق ہونا قدرتی ہے۔ پھر بھی اس کے چند عام معیار ہیں جنھیں سامنے رکھ کر [illegible] اور یہی ہماری زبان دراصل ہندوستانی ہے گل کرسٹ

اس زبان کی مثالیں پیش کرتے ہوئے، میرؔ، سوداؔ، جیسے شعرا کا سہارا لیتا ہے اس لئے جس زبان کو وہ ہندوستانی کے نام سے یاد کرتا ہے وہ دراصل وہی زبان ہے جسے ہم آج اُردو کہتے ہیں۔ گل کرسٹ کے کارناموں میں اس کی گرامر اور لغت خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان سے ہمیں اپنی زبان کے ماضی کا پتہ چلتا ہے اور یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آج سے تقریباً پورے دو سو برس قبل اس زبان کی کیا شکل تھی اور اس کے کیا معیار تھے۔

گل کرسٹ کا سب سے بڑا کارنامہ فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کی تشکیل و تنظیم ہے۔ وہ چار سال تک ہندوستانی شعبے کا صدر رہا اور اس چار سال کے عرصے میں اس نے حیرت انگیز کام انجام دیا۔ یہاں اس نے ہندوستان کے بہترین ادیبوں کو جمع کیا اور ان سے مختلف اور متعدد موضوعات پر سادہ اردو نثر میں کتابیں لکھوائیں۔ ادبی نثر کا یہ اسلوب پہلی بار فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کے ذریعے ہی وجود میں آیا اور اس عظیم الشان کام کی تحریک گل کرسٹ ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اسی نے ہندوستانی ادیبوں کو عام بول چال کی زبان میں ادبی تجربات کرنے پر آمادہ کیا اور "باغ و بہار" جیسی کتابیں لکھوائیں جسے آج بھی اردو نثر کا کلاسیکی نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

گل کرسٹ نے پہلا اردو پریس قائم کیا۔ اہم شعرا کے دواوین کی ترتیب و اشاعت کا اہم کام پہلی بار انجام دیا۔ طباعت کے سلسلے میں نستعلیق ٹائپ کا پہلا تجربہ کیا۔ اُردو زبان کی باقاعدہ تعلیم و تدریس کا پہلا تجربہ کیا۔ اور زبان سیکھنے والوں کے لئے کتابوں کا کثیر اور بیش بہا ذخیرہ فراہم کر دیا۔ آج بھی ہندوستانی زبانوں سے دل چسپی رکھنے والے لوگ ان زبانوں سے متعلق ضروری ابتدائی کتابوں کی کمی کے شکوہ سنج ہیں۔ گل کرسٹ نے اس کمی کو دور کرنے کی جو ابتدائی کوشش کی تھی اس سلسلے میں اس نے جو تجاویز پیش کی تھیں ... طریقہ کار اختیار کیا تھا ان کا مطالعہ آج بھی ہمارے سامنے نئی راہیں ... گل کرسٹ رومن رسم خط کا حامی تھا اس کی ایک اہم وجہ شاید ...

تھے۔ یوروپی طلبہ کے لئے رومن رسم خط زیادہ مفید تھا اور اس سے وقت کی بچت بھی ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اپنی ضروریات کے پیش نظر اس نے اس کا تجربہ کیا اور فارسی دیوناگری رسم خط پر اسے ترجیح دینے لگا۔ رسم خط کا معاملہ آج بھی زیر بحث ہے۔ اس سلسلے میں بھی گل کرسٹ کی تجاویز کا مطالعہ ہمیں غور و فکر میں مدد دے سکتا ہے۔

گل کرسٹ کی تمام کتابوں کا اگر تفصیلی جائزہ لیا جائے تو اس میں بہت سے مقامات ایسے آئیں گے جو قابل اعتراض ہوں گے یا جہاں ہم اس سے اتفاق نہ کر سکیں گے مگر اس کی خوبیوں کا پلہ پھر بھی کئی گنا بھاری ہوگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور اس کے کارناموں کا اعتراف و احترام کیا جاتا رہے گا۔

اس سمپوزیم میں مذکورہ بالا مقالات کے علاوہ فرانس، جرمنی اور انگلستان کے مشہور مستشرقین نے تقریریں کیں۔ ڈاکٹر ولفرڈ نولے نے اشپرنگر کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالی۔ موصوف نے ایک موقع پر فرمایا کہ اشپرنگر کا شمار میکس ملر کے زمرے میں کیا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اشپرنگر کی تحقیقات زیادہ تر ہندوستان پر مسلم اثرات اور یہاں کی تہذیب، تمدن اور فلسفہ و فکر کے ساتھ ان کے امتزاج سے متعلق تھیں۔ ڈاکٹر ایمل کمیرر (EMIL KUMMERER) نے بھی اشپرنگر کی خدمات پر تقریر کی۔ موصوف نے بتایا کہ اشپرنگر انیسویں صدی کے ان چند مستشرقین میں سے ہے جن کی بدولت مشرق و مغرب میں علمی سطح پر رابطہ قائم ہوا۔ پروفیسر جین فلیوزا (JEAN FILLIOZAT) اور سائمن ڈگبی (SIMON DIGBY) نے گارساں دتاسی پر تقریر کی اور ہندوستان کی علمی، ادبی، تہذیبی اور فکری سرگرمیوں سے متعلق اسکی خدمات پر روشنی ڈالی۔

سمپوزیم کے آخری اجلاس میں روسی مستشرقین کی خدمات اردو پر تقریریں کی گئیں جن میں پروفیسر گان کردیکی [illegible] الیس سکاروف نے حصہ لیا اور انھوں نے بتلایا کہ ہندوستان [illegible] [illegible] آج کل سوویت روس میں [illegible]

تعارف و تبصرہ

چند رسالوں کے شخصیات نمبر

زندہ اشخاص پر رسالوں کے خاص نمبر، کچھ عرصہ پہلے بھی، شائع ہو چکے ہیں، مگر ایسی مثالیں بہت کم ہیں، لیکن ادھر چند برسوں سے اس کا رواج بہت تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ چنانچہ "افکار" کے جوش نمبر کے بعد ۱۹۶۳ء میں ایسے تین خاص نمبر شائع ہوئے ہیں — نیاز نمبر، حفیظ نمبر اور جوش نمبر

نیاز نمبر (حصہ اوّل و دوم) مرتبہ : فرمان فتحپوری

زندہ اشخاص پر اب تک جس قدر خصوصی نمبر شائع ہوئے ہیں، ان کا متعلقہ اشخاص سے اس کے علاوہ اور کوئی خاص تعلق نہیں تھا کہ ان سے نمبر نکالنے کی اجازت لے لی گئی تھی اور متعلقہ اشخاص نے طوعاً یا کرہاً اس کی اجازت دے دی تھی؛ "افکار" کے جوش نمبر کے متعلق یہ ضرور سننے میں آیا تھا کہ اس کی ترتیب و اشاعت میں حضرت جوش کا کافی عمل دخل رہا ہے۔ مگر "نگار" کا نیاز نمبر اس لحاظ سے ان سب سے منفرد ہے کہ خود حضرت نیاز اس کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ خود نوشت سوانح حیات کا رواج تو ضرور ہے، مگر کسی مدیر نے خود اپنی شخصیت اور اپنے علمی کارناموں کے متعلق خصوصی شمارہ شائع کیا ہو، اردو میں یہ پہلی مثال ہے۔ اس کا احساس بقول فاضل مرتب حضرت نیاز کو بھی تھا، چنانچہ ملاحظات میں جناب فرمان فتحپوری صاحب نے لکھا ہے کہ "نیاز صاحب نگار کے "نیاز نمبر" کی اجازت جس بنا پر نہ دے رہے تھے وہ میرے ذہن میں بھی تھی۔ خود نیاز صاحب جس پرچے کے مدیر ہوں وہی ان کا نمبر شائع کرے، یہ بات بظاہر کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتی۔" مگر فاضل مرتب لکھتے ہیں کہ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ "نگار" کے سوا کسی اور پرچے کو نیاز نمبر نکالنے کا استحقاق [illegible]

نیاز صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نگار کے بہت سے خاص نمبر تنہا مدیر محترم کے قلم کے مرہون منت ہیں۔ اس لئے جب میں نے نیاز نمبر کا اعلان دیکھا تو پہلے پہل مجھے یہی خیال آیا کہ نیاز صاحب خود ہی اپنے بارے میں لکھیں گے اور ایک طرح سے یہ نمبر ان کی خود نوشت سوانح حیات ہوگا۔ مگر یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ ان دو جلدوں میں جو ۳۰×۲۰ سائز کے مجموعی طور پر ۳۱۵ صفحات پر مشتمل ہیں، صرف ایک مختصر مضمون ہے، جس میں موصوف نے زیادہ تر اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے، مختصراً اپنے ابتدائی حالات لکھے ہیں اور دو صفحے نگار کے بارے میں۔ جن لوگوں کو حضرت نیاز کی تحریروں اور خیالات سے محبت ہے، انھیں ضرور مایوسی ہوئی، مگر اس میں شبہ نہیں کہ ان دونوں جلدوں میں حضرت نیاز کے حالات و کارناموں کے متعلق کافی مواد جمع ہو گیا ہے۔ اور نیاز پر آئندہ کام کرنے والوں کو رسالوں اور کتب خانوں کی خاک چھاننے کی دردسری سے بچا لیا ہے۔ البتہ بعض مضامین اتنے معمولی ہیں کہ وہ نہ ہوتے تو اچھا تھا۔

بہر حال اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ نیاز نمبر کے یہ دونوں حصے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور حضرت نیاز کی چالیس سالہ ادبی خدمات کے متعلق بیش قیمت معلومات کے حامل ہیں۔ قیمت فی جلد چار روپے (مجموعی آٹھ روپے) ملنے کا پتہ:۔ نگار پاکستان ۳۲۔ گارڈن مارکٹ۔ کراچی ۳؎۔

حفیظ نمبر

مرتبہ :۔ صہبا لکھنوی

افکار کا یہ حفیظ نمبر، جوش نمبر کی طرح سنسنی خیز" اور متنازع فیہ مضامین کا حامل نہیں ہے، مگر ایک شاعر کی، جو برصغیر ہند و پاک میں بہت مقبول ہے، مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ اس ضخیم نمبر میں حضرت حفیظ جالندھری کی زندگی اور شاعری کو پوری طرح اجاگر کیا گیا ہے۔ خود شاعر نے اپنی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ مشاہیر اور معاصرین کے تاثرات اور خیالات بھی بہت بڑی تعداد میں پیش کئے گئے ہیں۔ غرض یہ نمبر حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری کی شخصیت اور شاعری کے بارے

میں دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اس شخص کی زندگی اور فن کی داستان بیان کرتا ہے، جو بقول پروفیسر سید احتشام حسین "جدید اردو شاعری کے ان معماروں میں سے ہیں جن کی خدمات کا سراہنا ہم سب کا فرض ہے۔ حفیظ پنجاب میں پیدا ہوئے جہاں زرخیزی تھی، زندہ دلی تھی، امنگ تھی، لہکنے اور بہکنے کی فضا تھی، ماہیا اور ہیر کی نغمہ انگیزی تھی اور بھانگڑے کی گرمی اور جوش۔ حفیظ نے اس جادو بھری سرزمین سے شاعری کا رس پیا، نغمہ سرائی کی جھومے اور اپنی آواز سے دوسروں کو مست کرنے لگے۔" لیکن خود جناب حفیظ کا خیال ہے کہ "میرے قدردانوں کا حلقہ تو محض عوام الناس ہیں — ہندو ہوں یا مسلمان۔"

میں عامی ہوں مخاطب ہی عوام الناس ہیں میرے

یہ خصوصی نمبر ۲۰×۳۰/۸ سائز پر ۶۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ شاعر کی مختلف زمانوں کی تنہا اور خاندان اور دوست احباب کے ساتھ آرٹ پیپر پر متعدد تصاویر بھی ہیں۔ قیمت دس روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی (پاکستان)

جوش نمبر مرتبہ: شاہد دہلوی

"ساقی" کا یہ جوش نمبر "افکار" کے جوش نمبر کی "صدائے بازگشت" ہے۔ "افکار" کے جوش نمبر میں جناب شاہد دہلوی کا ایک مضمون شائع تھا، جس میں نہ تو جوش صاحب کی یک طرفہ تعریف تھی اور نہ تنقیص، بلکہ زندگی کے دونوں پہلو بڑے متوازن انداز میں دکھلائے گئے تھے۔ شاہد صاحب کے بیان سے یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے مدیر افکار جناب صہبا لکھنوی کو اس کا بھی اختیار دیا تھا کہ چاہیں تو مضمون کو نہ شائع کریں یا اس میں حسب خواہش ردوبدل کرلیں، چنانچہ موصوف نے اس کے کچھ حصے حذف کر دئے۔ مگر شائع ہونے کے بعد، حضرت جوش نے، بقول شاہد صاحب اپنے دوست احباب کے مجبور کرنے پر، اس کا جواب لکھا، جس میں بہ الفاظ شاہد صاحب ان کے باپ دادا کو "رگڑا" دیا۔ شاہد صاحب نے باہمی احباب کے ذریعے جوش صاحب کو کہلوایا کہ جواب ضرور لکھیں لیکن باپ دادا تک نہ پہنچیں۔۔ اگر میرے بزرگوں کی توہین کی گئی تو میں بھی ایک

جوش نمبر شائع کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا" چونکہ جوش صاحب نے اپنا جواب لکھا" افکار کے طبع ثانی میں شائع ہوا۔ اس لئے شاہد صاحب نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا اور یہ حقیقت ہے کہ شاہد صاحب نے مخالفت کا حق ادا کردیا ہے۔ ایک صاحب نے شاہد صاحب کو ان الفاظ میں داد دی ہے کہ جوش صاحب کو کیا پتہ تھا کہ واسطہ شاہد احمد دہلوی سے نہیں، ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے سے ہوگا۔ شاہد احمد دہلوی اچھے آدمی ہیں، مگر جو ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہیں۔ اصل میں وہ ہیں خطرناک"۔ (ساقی جوش نمبر ۱۰۵)

غرض اس خاص نمبر میں جوش صاحب کے خلاف بہت کافی مواد جمع کردیا گیا ہے، بہت سے مضامین مطبوعہ بھی ہیں، مگر اب آسانی سے میسر نہیں آتے تھے، مضمون نگاروں میں ہند و پاک کے بہت سے مشاہیر کے نام نظر آتے ہیں، جنھوں نے کسی وقتی جذبے کے ماتحت نہیں لکھا ہے، بلکہ انھیں جوش کے خیالات و افکار اور ان کے فن اور اسلوب بیان سے واقعی اختلاف ہے۔

سائز ۲۰×۳۰/۸، حجم ۰ ۵ صفحات، قیمت چھ روپے، ملنے کا پتہ: ماہنامہ ساقی، کراچی ۵

مذکورہ بالا خاص نمبروں کے علاوہ بعض ایسے مشاہیر کے متعلق بھی خاص نمبر شائع ہوئے ہیں، جن کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے۔ مثلاً ماہنامہ سب رس (حیدر آباد) کا زور نمبر، ماہنامہ کتاب (لکھنؤ) کا شوکت تھانوی نمبر اور ہفتہ وار ندائے ملت (لکھنؤ) کا صدیق حسن نمبر۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا اردو ادب میں جو مرتبہ ہے اور انھوں نے اردو زبان و ادب کی جو بے لوث خدمت کی ہے، وہ کسی پر مخفی نہیں۔ مرحوم کے قائم کردہ ادارہ ادبیات اردو نے "زور نمبر" شائع کرکے ایک ایسی خدمت انجام دی ہے جو تمام اردو دوستوں کے شکریہ کی مستحق ہے۔

جناب شوکت تھانوی پاکستان چلے گئے تھے اور وہیں انتقال فرمایا، مگر ان کی عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گذرا تھا، اس لئے کتاب نے ایک شاندار خاص نمبر شائع کرکے لکھنؤ بلکہ ہندوستان کی طرف سے فرض کفایہ ادا کردیا۔ —— سید صدیق حسن صاحب بڑے اچھے شاعر تھے، مگر ان کی شرافت، مروت، نیکی اور انسان دوستی ان کی شاعری پر بھاری تھی۔ "ندائے ملت" مرحوم کے حالات زندگی اور ان کی مخلصانہ خدمات کے متعلق مخصوص نمبر شائع کرکے بڑا نیک اور ضروری کام انجام دیا ہے۔

ماہنامہ "جامعہ" ہر ماہ کی پانچ یا چھ تاریخ کو روانہ کیا جاتا ہے۔
پرچہ کے نہ ملنے کی شکایت کی تعمیل بھی انہیں تاریخوں میں کی جا سکتی ہے۔

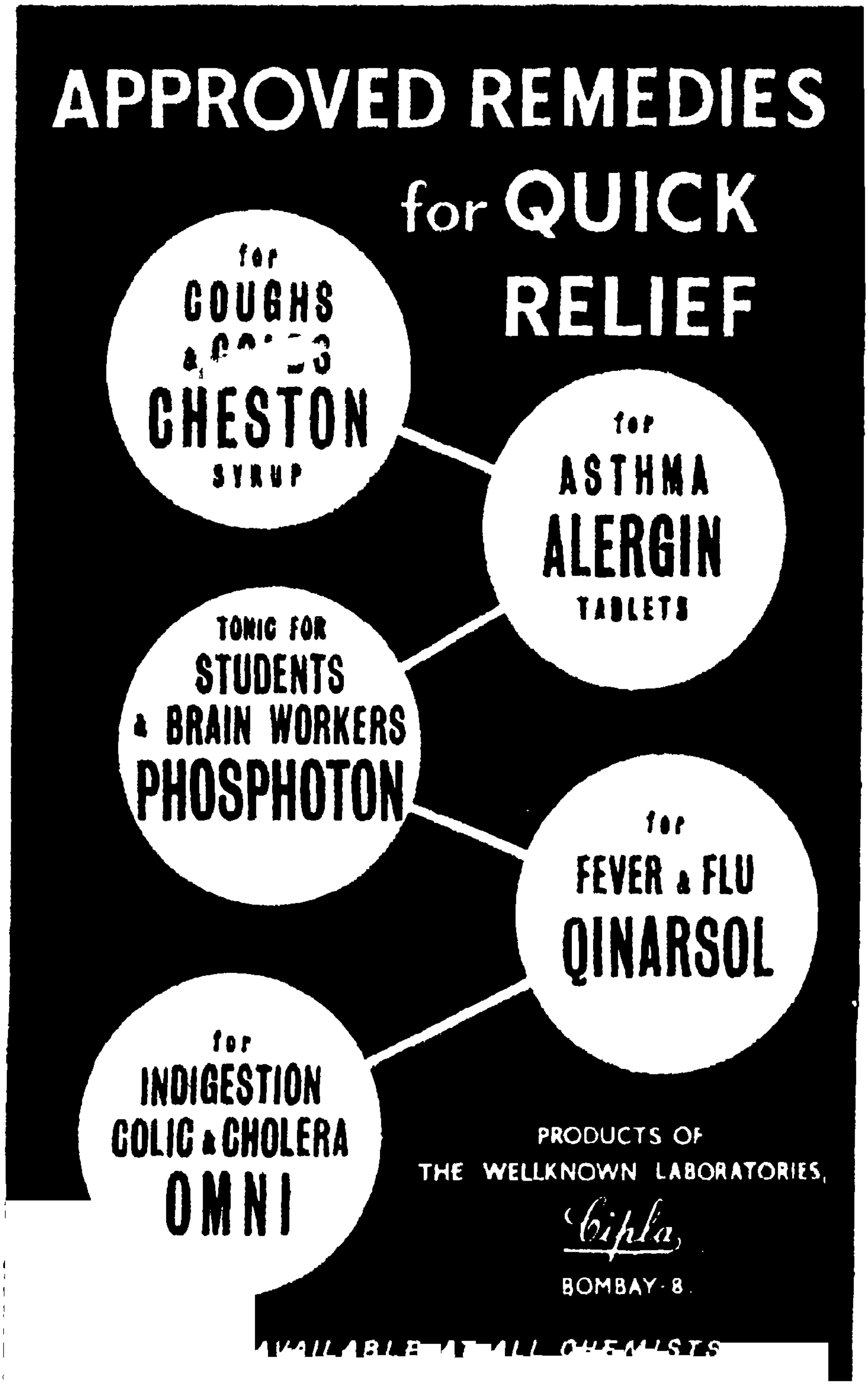
ماہنامہ "جامعہ"، جامعہ نگر، نئی دہلی نمبر ۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائٹل: دیال پریس دہلی

Regd No. D - 768 February, 1964

The Monthly JAMIA

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25



مارچ سنہ

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ ضیاء الحسن فاروقی

عبداللطیف اعظمی (مرتب)

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

گاندھی جی

پروفیسر محمد مجیب

[یہ مضمون گاندھی جی کی سولھویں برسی کے موقع پر جامعہ ملیہ میں پڑھا گیا]

آج گاندھی جی کی شہادت کو سولہ برس ہوئے ہیں اور وقت کے ساتھ ان کی تعلیمات کا ہماری زندگی سے تعلق کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ حالات بدل گئے ہیں، گاندھی جی کا ایک مقصد، کہ شہریت کا حق سب کو پورا پورا مل جائے بڑی حد تک پورا ہو گیا ہے اور اگرچہ اب بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں، امن اور شانتی کا بول بالا ہوتا جا رہا ہے، اور قومی یک جہتی اور اتحاد کی جو تحریک قریب دو سال ہوئے شروع ہوئی تھی یقین ہے کہ فتنہ فساد کے میلانات پر حاوی ہو جائے گی۔ مگر گاندھی جی کی تعلیمات میں اتحاد کے اصول کے علاوہ اور بہت کچھ تھا جن سے ہم دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک بنیادی تعلیم تھی جسے اب سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کم کی جاتی ہے اور بیکار ثابت کرنے کی کوشش زیادہ، جس کا رواج اب بس اس حد تک ہے کہ اسکول خالی اسکول نہیں کہلاتے بنیادی اسکول کہلاتے ہیں۔ پہلے کھدر کے کپڑے گاندھی جی کی پیروی کی علامت کا کام دیتے تھے، اب وہ بات بھی نہیں رہی۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں چینیوں نے ہندوستان پر حملہ کرکے آہنسا کے ماننے والوں کا منہ بند کر دیا، اور اب قومیت کا جوش پیدا کرنے کے لئے ایسی نظمیں اور گیت لکھے جا رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اصولی اعتبار سے بھی اہنسا کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ اب گاندھی جی کی یادگار قائم رکھنے کے لئے اس تاریخی حقیقت کے سوا بہت کم رہ گیا ہے کہ ان کی شخصیت بہت بڑی تھی، انھیں کی جدوجہد اور رہنمائی سے ہندوستان کو آزادی ملی، اور آخر میں انھوں نے حق اور انصاف کی خاطر اپنی جان کو قربان کیا۔

یہ تاریخی حقیقت تو بس ایک صحیح بات ہو سکتی ہے جس کے ان لینے سے کوئی نتیجہ نہ نکلے کیونکہ

نتیجہ اسی صورت میں نکل سکتا ہے جب گاندھی جی کی تعلیمات، یعنی عقیدت اور شردھا کی وہ کیفیتیں جو ان کی زندگی میں نمایاں ہوئیں، وہ اصول جو انھوں نے برتے اور وہ طریق کار جو انھوں نے اپنی قوم کو غلامی کے پھندوں سے چھڑانے اور حق کا احساس دلانے کے لئے اختیار کیا، یہ سب ہماری نظر کے سامنے ہوں اور ہمارے دلوں پر اثر کریں۔ کہنے کو تو یہ ہمارے سامنے ہیں، گاندھی جی کی زندگی کا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے، ان کے مضمون، ان کی تقریریں، ان کے خط موجود ہیں اور چھپ گئے ہیں، مگر یہ سب کسی دوسرے زمانے، کسی دوسری دنیا کی باتیں لگنے لگی ہیں، اور ہم میں سے بہت کم ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ گاندھی جی کی سچی پیروی کے لئے ہمیں اپنے زمانے کے حالات میں کیا کرنا چاہیئے۔

بڑا سوال یہ ہے کہ سچی پیروی کا کیا مطلب ہے، یا یوں کہیئے کہ پیروی کرنے اور نقل کرنے میں کیا فرق ہے۔ گاندھی جی کے زمانے میں بہت سے لوگ تھے جو ان کی نقل کرنے کو ان کی پیروی سمجھتے تھے، اور واقعی اس کا جواب دینا مشکل ہے کہ جو آدمی کھانے پینے کے کپڑے کے، دیش سیوا کا دم بھرنے کے معاملے میں گاندھی جی کا ساتھ نبنا چاہے وہ اور کسی معاملے میں ان کا پیرو کیسے ہو سکتا ہے۔ لوگ اپنی عقیدت کو اسی طرح سے ہی تو ظاہر کرتے ہیں، اور جو ظاہر میں گاندھی جی کا پیرو نہ ہو وہ دل میں کیسے ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی تفصیلات کو بڑی اہمیت دیتے تھے، انھوں نے نہ جانے کتنی توجہ صحیح غذا کے لئے چیزیں اور ان چیزوں کی مقدار معلوم کرنے پر صرف کی، کس کس طرح سے یہ ثابت کیا کہ کھدر پہننا ضروری ہے اور یہ کہ دراصل تندرست وہ ہے جو کم سے کم پہن کر گرمی جاڑا گذار سکے۔ انھوں نے تجربہ کرکے کھانے کے صحیح اوقات طے کئے اور بڑی سختی سے ان کی پابندی کرتے اور آشرم والوں سے کراتے رہے۔ آشرم میں کوئی کوئی کونی تو پی لیتا تھا، مگر چائے اور تمباکو کی ممانعت تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ جو چائے یا تمباکو پیے وہ گاندھی جی کا پیرو نہیں ہو سکتا، جو کھانے میں پکی چیزیں زیادہ اور کچی کم کھائے، جس کے کھانے کا وقت دن کو ایک ڈیڑھ بجے اور رات کو آٹھ نو بجے ہو، وہ گاندھی جی کی تعلیمات کو [illegible] نہیں سمجھا، اور جو یہ محسوس کر سکا کہ بکری کا دودھ کھانے سے کہ دودھ سے اور [illegible]

بھینس کے دودھ سے کیوں بہتر ہے وہ گاندھی جی کے اصل پیغام سے ناواقف رہے گا۔ میں ان معاملوں میں رائے دینے کا حق نہیں رکھتا، میری گنہگاری کا یہ عالم تھا کہ آشرم میں بھی چھپ کر سگار پیتا رہا، مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ گاندھی جی نے غذا اور لباس اور علاج میں جو تجربے کئے بہت خلوص کے ساتھ کئے، جس سے ان میں ایک شان اور سچائی پیدا ہو گئی، دوسروں نے وہی تجربے ان کے کہنے سے یا ان کا جیسا بننے کے شوق میں کئے، جن سے ان تجربوں کا چرچا تو ہوا لیکن شاید یہی چرچا گاندھی جی کا اصل مقصد معلوم کرنے میں ایک رکاوٹ بن گیا۔ ہم خود جامعہ میں اسے دیکھ چکے ہیں جب ایک مرتبہ گاندھی جی کے ایک خاص چیلے جامعہ میں چند دن مہمان رہے تھے۔ انھوں نے فرمائش کی تھی کہ ان کے لئے گائے کے دودھ سے نکالے ہوئے گھی اور مکھن کا انتظام کیا جائے جس کے مہیا کرنے میں نہ جانے کتنی دوڑ دھوپ کرنی پڑی اور اس ڈر سے کہ کہیں وہ گھی یا مکھن میں کوئی عیب نہ نکال دیں ہم ان کے اپدیشوں کو جی لگا کر سن بھی نہ سکے۔

یہ شبہہ اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے کہ جو چھوٹی اور آسان باتوں میں گاندھی جی کی پیروی سے انکار کرتا ہو وہ بڑی اور اہم باتوں میں بھی ان کی پیروی نہ کرنا چاہے گا۔ مگر کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم گاندھی جی کی پیروی کرنا چاہتے ہوں تو سب آشرموں میں رہیں، گاندھی جی کے چار بیٹے تھے تو ہمارے بھی چار بیٹے ہوں، ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی تو ہم اس کو اچھا سمجھیں جس کے کوئی بیٹی نہ ہو، ان کا انگریزی کا خط بہت خراب تھا تو ہم بھی اپنا خط خراب کرلیں؟ کیا گاندھی جی یہ چاہتے تھے کہ جو اہنسا میں شردھا رکھتا ہو یا ہندوستان کو آزاد کرنا چاہتا ہو یا ہریجنوں اور ذات والے ہندوؤں کی تقسیم کو مٹانا چاہتا ہو وہ ہر بات میں ان کی نقل کرے یا ان سے اتفاق کرے؟ مولانا آزاد نے اپنی کتاب میں کئی جگہ اس کی شکایت کی ہے کہ لوگ سوچنے اور فیصلہ کرنے کی ذمہ داری گاندھی جی پر ڈال دیتے تھے اور جو کچھ کہتے اسے مان لینا شردھا اور عقیدت کا مسئلہ بنا لیتے۔ گاندھی جی خود چاہتے تھے کہ ان کی رائے پر بحث کی جائے، جسے اختلاف ہو وہ اپنا اختلاف بیان کرے، اس لئے کہ انھیں یقین نہیں ہوتا کہ ان کا خیال صحیح ہے جب تک کہ اسے خوب پرکھ نہ لیا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ جب وردھا کانفرنس میں گاندھی جی نے حرفہ کے ذریعے تعلیم دینے کی تجویز پیش کی تو شردھا والوں نے اسے ایک آسان سی [illegible]

ہوئی حقیقت مان کر قبول کیا، مگر گاندھی جی نے بنیادی تعلیم کے اصول واضح کرنے اور اس کا نصاب مرتب کرنے کا کام ڈاکٹر ذاکر حسین کے سپرد کیا، جنھوں نے بھری کانفرنس میں کہا تھا کہ حرفہ کے ذریعہ تعلیم دینے کا خیال صحیح ہے اور اچھا ہے، مگر نیا نہیں ہے، دنیا میں تعلیم کے کئی ماہر اسے آزما کر اس کی خوبیاں ثابت کر چکے ہیں، اور ہم اسے رائج کریں تو بہت مفید ہوگا۔ بنیادی تعلیم کا رشتہ گاندھی جی کی پیروی اور شردھا سے نہ جوڑا جاتا تو شاید اس کا سیاست سے بھی کوئی اصولی تعلق نہ ہوتا، اس کا چرچا تو کم ہوتا مگر اثر اور پائداری زیادہ۔

اب اسی پیروی کے مسئلے کو ایک اور نظر سے دیکھیے۔ گاندھی جی نے اپنی زندگی کے پہلے دور کا حال اپنی کتاب "تلاش حق" یا The story of my experiments with Truth میں بیان کیا ہے۔ بچپن میں وہ اور بچوں کی طرح تھے، جوانی میں بھی اور جوانوں کی طرح۔ بس ایک میلان ان میں رفتہ رفتہ پیدا ہوتا رہا کہ جو بات صحیح اور اچھی ہو اسے ضرور کریں۔ اور جو بری ہو اسے نہ کریں۔ انھیں یہ طریقہ صحیح اور اچھا معلوم ہوا کہ اپنے بال خود بنائیں تو انھوں نے اس کی مشق کی، اور دوستوں کے ہنسی اڑانے کی پروا نہ کی، انھیں یہ اصول صحیح معلوم ہوا کہ آدمی کسی کام کے لئے دوسرے کا محتاج نہ ہو تو انھوں نے خود کفیل بننے کی پوری کوشش کی۔ پھر ان کا ظلم اور زیادتی کی مختلف شکلوں اور طریقوں سے سامنا ہوا۔ وہ چاہتے تو ان کا مقابلہ نہ کرتے، مگر ان کے دل نے اسے گوارا نہ کیا کہ وہ ظلم ہوتے ہوئے دیکھیں اور کچھ نہ کریں۔ انھوں نے اپنے دل کو اپنا رہنما بنایا، دل اور دماغ کے درمیان اختلاف ہوا تو انھوں نے دل کا کہا مانا، اور دماغ کو دل کا خادم، دل کے کہے کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ بنا کر رکھا۔ حق کی تلاش نے ان کو ان کے دل تک پہنچایا، اور ان کے دل کی آواز ہے جسے انھوں نے انگریزی میں اپنی Inner Voice کہا ہے، حق کی آواز بن گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی کی جو پیروی کرنا چاہتا ہو اسے بھی اپنے دل کی تلاش میں لگ جانا چاہیے، اور اسے یقین ہونا چاہیے کہ اگر اس نے اپنے دل کو پالیا تو وہ گاندھی جی کی پیروی میں بھی کامیاب ہوگا۔

آدمی کا دل کیا ہے اور کہاں ہے یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ البتہ یہ جانتا ہوں کہ آپ کو کسی دوسرے سے یہ پوچھنا نہ چاہیے کہ میرا دل کہاں ہے، اپنے دل تک پہنچنے کا راستہ ہر ایک کے لیے الگ ہوتا

ہے، اور پہلی اور سب سے بڑی غلطی جو ہم سب کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جو خوش اور کامیاب نظر آئے اس کو سمجھتے ہیں کہ دل کی منزل تک پہنچ گیا ہے! اسی میں ہم دھوکے کھاتے ہیں اور مایوس ہوتے ہیں بھٹکتے رہتے ہیں یا کہیں تھک کر بیٹھ جاتے ہیں، کہ آگے جانے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، اپنے دل کو پانے کا مطلب دنیا کی وہ خوشیاں حاصل کرنا نہیں ہے جنھیں دوسرے خوشی اور کامیابی سمجھتے ہوں۔ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں جن سے انھیں کو تسلی ہوتی ہے جو حقیقت کو دیکھنے نہیں یا دیکھنا نہیں چاہتے۔ دل کی تلاش کسی کو گیان دھیان کی طرف لے جاتی ہے، جیسے کہ ہمارے زمانے میں گرودیو ٹیگور کو، یا حق اور انصاف کی طرف جیسے گاندھی جی کو، یا ہم جیسے چھوٹے لوگوں کو، ان کاموں کی طرف جن کو کرنے کی ہم میں صلاحیت ہے، اور جو ہماری شخصیتوں کو ان پھولوں کی طرح کھلا دیتے ہیں جنھیں اچھی زمین اور آب و ہوا نصیب ہوئی ہو۔ ہم چھوٹے ہیں مگر ایسا نہیں ہے کہ ہم کسی گنتی میں نہ آتے ہوں۔ بلکہ گنتی تو ہماری ہی ہوتی ہے ہم بگڑ جائیں تو سارے کام بگڑ جاتے ہیں، ہم اچھے گنوں سے سنور جائیں تو سماجی زندگی میں رونق پیدا ہوتی ہے۔ گاندھی جی کا دل ایسا تھا جس کی آواز سننے کے لئے ایک دنیا کان لگائے رہتی تھی ہمارے دلوں سے بھی ایسے سُر نکل سکتے ہیں جو چاہے دور تک اور بہت سے لوگوں کو سنائی نہ دیں لیکن ہماری زندگی کو حسین کیفیتوں کا مرقع بنا سکتے ہیں۔

ہم خلوص اور پکے ارادے کے ساتھ اپنے دل کی تلاش میں نکلیں تو ہمیں وہی سب کچھ کرنا ہوگا جو گاندھی جی نے حق کی تلاش میں اور اپنے دل کی آواز سننے کے لئے کیا۔ ہمیں سوچنا ہوگا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، کون سا راستہ دل کی طرف لے جاتا ہے، کون سا دل سے دور۔ ہمیں اپنی طبیعت کو اپنے مقصد سے ہم آہنگ کرنے کے لئے سدھانتوں کا ایک آشرم سا بنانا ہوگا۔ دل کی بڑی دولت حاصل کرنے کے لئے جو کچھ چھوڑنا ہوگا اسے ہم چھوڑیں گے، ہمارا کھانا پینا، ہمارا لباس، ہمارا کام اور آرام سب اس مسافر کا سا ہوگا جسے اسباب نہیں ڈھونا ہے اور تماشا نہیں دیکھنا ہے بلکہ اپنی منزل تک جلد سے جلد پہنچنا ہے ہم یہ بھی جانتے ہوں گے کہ دل کی منزل کوئی جگہ نہیں جہاں پہنچ کر آدمی بیٹھ جائے، بلکہ وہ ایک بہاؤ ہے جو دریا کو سمندر کی طرف لے جاتا ہے، ایک تڑپ ہے جو بجلی کی طرح زمین آسمان کو روشن کر دیتی ہے، ایک شوق ہے جو خوشبو کی طرح گرد و پیش کو مہکاتا ہے

دل کی تلاش میں ہم اہنسا کا سبق کسی کتاب سے، کسی دھرم سے، کسی شخص کی مثال سے نہیں سیکھیں گے، بلکہ خود ہی یہ دیکھ کر کہ غصہ ہماری آنکھیں بند کر دیتا ہے، نفرت کر کے ہم اپنے ہی منہ پر طمانچے مارتے ہیں، دکھ پہنچا کر ہم اپنے لئے دکھ کا سامان کرتے ہیں۔ اپنے لئے اہنسا کی کوئی شکل پسند کریں گے۔ دل کی تلاش میں ہم یہ بھی ضرور محسوس کریں گے کہ دوسرے بھی ہماری طرح دل کی تلاش میں ہیں، ہماری طرح ان کے قدم بھی بہک جاتے ہیں، وہ بھی کسی غلط راستے کو ٹھیک سمجھنے لگتے ہیں، اور ہمارے لئے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہوگی کہ ہم اپنی آرزو اسی وقت پوری کر سکتے ہیں جب ہم دوسروں کے دوست اور خیر خواہ ہوں، ہمارا راستہ اسی وقت روشن ہوگا جب ہم سب اپنے اپنے دیئے جلا سکیں اور کسی جلتے دیئے کو بجھنے نہ دیں۔

بات چلی تھی گاندھی جی کی پیروی کے معاملے سے، آپ چاہیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا ایک بندھا ہوا طریقہ ان کی نقل کرنے کا ہے، چاہیں تو یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی پیروی کے ہزاروں آزاد اپنی اپنی طبیعت سے مناسبت رکھنے والے طریقے ہیں، اور گاندھی جی کا اصل منشا بھی یہ تھا کہ ہم ان کی پیروی کریں تو آزاد ہو کر اور اپنے طریقے سے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے جو پابندیاں لگائیں وہ سب اپنے اوپر لگائیں، اور جو ان کے ساتھ کام کرنے پر تیار تھا اس سے انھوں نے غذا اور لباس اور زندگی کی معمولات میں اپنا خاص طریقہ اختیار کرنے کو نہیں کہا۔ وہ اپنی ہر غلطی کو ہنس کر مان لیتے تھے اور اپنے ساتھیوں کی غلطی اور کمزوری اور اختلاف کو ہنس کر ٹال دیتے تھے۔ ان کی سی رواداری اسی شخص میں ہو سکتی جو جانتا ہو کہ آدمی اپنی طبیعت کے خلاف صحیح زندگی کے کسی بنے بنائے سانچے میں ڈھالا نہیں جا سکتا، اور ہم ایک دوسرے میں ان کی پیروی کے آثار تلاش کریں تو ہم میں بھی ایسی ہی رواداری ہونی چاہیئے۔ ہم اس کی امید نہیں کر سکتے کہ ہم گاندھی جی کی طرح شہادت کا شرف حاصل کریں گے اور جان کو قربان کر کے ایک قوم کے ضمیر کو بیدار کریں گے، لیکن اس کی امید ہم بیشک کر سکتے ہیں کہ رواداری اور خیر خواہی ہم میں عام ہو جائے اور ہم کہہ سکیں کہ جس باغ کو گاندھی جی نے اپنے خون سے سینچا تھا اس کے ہم پھول ہیں۔

گاندھی جی کی یاد میں

حضرت روشؔ صدیقی

دیر و حرم کی باتیں کوئی کیا سنتا میخانوں میں
اپنے لہو سے رنگ بھرا ہے تو نے ان پیمانوں میں
حرفِ محبت جادو تیرا تیری شکتی پیت کی ریت
تو نے بسائی پیار کی بستی نفرت کے ویرانوں میں
اہلِ حرم کے دل کو تو نے بت خانوں کا سوز دیا
شمعِ یقیں کعبے سے لے کر روشن کی بت خانوں میں
تیرے ایک چراغ سے ابھرے سالِ بر کتنے خورشید
جس کو تری ہمت نے جلایا ظلمت کے طوفانوں میں

ارضِ وطن کے معماروں نے کتنے محل تعمیر کیے
تیری کٹی کا نور بھی ہوتا کاش نئے ایوانوں میں
تیرا ذوقِ جنوں بھی ہوتا کاش خردمندوں کے پاس
تیرے دل کا درد بھی ہوتا کاش ترے فرزانوں میں
اپنوں کا جو حال ہوا ہے اس کو کاش سمجھ سکتے
لے کر تیرے پیار کی دولت ہم پہنچے بیگانوں میں
کھوٹ کپٹ کے بیوپاری ہیں تیرے نام کے سوداگر
مایا کے انبار لگے ہیں جن کے خلوت خانوں میں
گرم سفر ہیں راہِ وفا میں ہم تو روزِ ازل سے روشؔ
گم نہ ہوئے ہم ویرانوں میں رک نہ سکے طوفانوں میں

مولانا آزاد کی چھٹی برسی پر کچھ خیالات

پروفیسر آل احمد سرور

ادھر کئی سال سے جب بھی مولانا آزاد کی برسی قریب آتی ہے، مجھے بہ شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ہم لوگ مولانا کو اور ان کے پیام کو بھولتے جا رہے ہیں۔ اس احساس کے تحت پچھلے سال میں نے رسالہ جامعہ میں ایک مضمون لکھا، جو کئی رسالوں میں نقل ہوا اور جس کے متعلق میرے کرم فرما گوپی ناتھ امن نے بھی اظہار خیال کیا، مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان باتوں پر جو توجہ ہونی چاہیئے تھی نہیں ہوئی۔ اس لئے پھر وہی داستان چھیڑتا ہوں۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سب سے اچھا نمونہ اور مثال مولانا آزاد ہیں۔ بلا شبہ سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی خدمت کی، انھوں نے عقلیت سکھائی اور جدید علوم کی طرف مائل کیا، انھوں نے ہماری معاشرت کی خامیوں سے ہمیں آگاہ کیا، انھوں نے اردو کو علمی زبان بنایا، انھوں نے بتایا کہ جب تک تعلیمی اور اقتصادی ترقی نہ ہو سیاست کی بات بے معنی ہے، مگر سرسید کے اثر سے مسلمانوں میں علیحدگی پسندی کا رجحان بڑھا، جس کا خمیازہ ہمیں اچھی طرح بھگتنا پڑا اور آج تک بھگت رہے ہیں۔ مولانا محمد علی کی حیثیت ایک مجذوب کی سی ہے اور سلوک کی راہ میں مجذوب کی بڑسے کام نہیں چلتا، اقبال صرف شاعر ہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہیں اور اس اور بہت کچھ نے ہی خرابی پیدا کی۔ وہ بہت بڑے شاعر تھے، مگر سیاست کی دنیا میں ان کی عقابی نظر سے کام نہیں چلتا، سرسید سے لے کر اس وقت تک جتنے لیڈر ہندوستانی مسلمانوں میں ہوئے ہیں ان میں صرف مولانا آزاد اپنی نظر کی صحت اور اپنے کارنامے کی جامعیت کی وجہ سے آج کی پر پیچ زندگی میں ہمارے سچے رہنما ثابت ہو سکتے ہیں۔ دوسروں کی عظمت میں کلام نہیں،

ہے۔ ضرورت آج صرف مولانا کی آواز کو سننے اور ان کے پیام کو سمجھنے کی ہے۔

مولانا ایسے سچے اور پکے ہندوستانی تھے کہ گاندھی جی کے بعد انھیں کا نام لیا جاسکتا ہے۔ زندگی کے سفر میں بہت سے ایسے مقامات آئے، جب اچھے اچھے ڈگمگا گئے، مگر مولانا کا قدم راہ راست سے کبھی اِدھر اُدھر نہ ہوا۔ مولانا کے ذہن میں کبھی قومیت کا کسی اور چیز سے ٹکراؤ نہیں ہوا۔ ہندوستان کی آزادی کی خاطر انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دیں اور جب انھیں نظر آیا کہ ان کے ساتھی تقسیم پر راضی ہو گئے ہیں تو اس سانحے کو روکنے کی انھوں نے بس بھر کوشش کی، لیکن جب قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہا تو ان کی زبان سے طنز کا ایک کلمہ بھی نہ نکلا۔ نادانی میں آگ سے کھیلنے والوں تک جب شعلوں کی لپٹیں پہنچیں اور وہ بدحواس ہو کر ان کے پاس پہنچے تو انھوں نے ساری کوشش آگ بجھانے میں اور زخموں پر مرہم رکھنے میں صرف کر دی۔ جب ملک آزاد ہو گیا تو انھوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس کے لئے جمہوریت کا ایک ایسا نقشہ بنایا جو اس کی روایات، اس کے مزاج، جدید ضروریات اور علمی معیاروں کے مطابق تھا۔ اس جمہوریت کو مستحکم کرنے کے لیے اور اسے سوشلزم کی طرف لے جانے کے لئے وہ مرتے وقت تک کوشش کرتے رہے۔

اور مولانا ایسے سچے اور پکے مسلمان تھے کہ اسلام کی جامع اور ہمہ گیر تعلیم کا کوئی ننھا منا سا پہلو بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ پھر وہ معمولی مسلمان نہ تھے۔ قرآن، حدیث، اسلامی تاریخ، فقہ، سب ہی کے عالم تھے۔ اسلام کی ساری تاریخ ان کی نظر میں تھی، مذہب ان کے لئے محض ایک روایت نہ تھا۔ ایک کٹر مذہبی ماحول میں پلے، ذہن بیدار اور جستجو کا شائق تھا، مذہبی لٹریچر کے مطالعے کے ساتھ گردوپیش کا مطالعہ بھی کرتے رہے، شک و انکار کی منزلوں سے بھی گزرے، سرسید سے بھی روشنی لی اور بالآخر ان میں ایک ایسی سچی مذہبیت پیدا ہو گئی، جو مذہب کی روح سے پوری طرح آشنا ہوتی ہے اور اس کی روشنی میں اپنے افکار و اعمال کا جائزہ لیتی رہے، جس میں اعتماد ہوتا ہے، خوف نہیں ہوتا،

جس میں وسعت ہوتی ہے۔ تنگی نہیں ہوتی، جو لوگوں کو ملاتی ہے جدا نہیں کرتی۔ ان کی ترجمان القرآن، جو ان کی ساری بصیرت کا نچوڑ ہے، ایک غیر فانی کارنامہ ہے۔ قرآن کی روح کو سمجھنے کے لئے آج مولانا سے اچھا شارح اور مفسر نہ ملے گا۔

پھر مولانا قدیم علوم کے پروردہ تھے، انھوں نے کس خوبی سے جدید علوم کو اپنایا، قدیم علمی درسگاہوں سے بڑے بڑے عالم نکلے، مگر ان میں سے بیشتر میں جدید علوم کی طرف سے عصبیت باقی رہی۔ شبلی اور سید سلیمان جدید علوم کے قائل تھے، مگر گھم پھر کر اسی نسل کو ترجیح دیتے تھے جس نے مدرسوں کی چٹائیوں پر تعلیم پائی تھی۔ یہ لوگ نئی نسل کا اندازہ ایم اے او کالج علی گڑھ کے فارغ التحصیل گریجویٹوں سے کرتے تھے جن میں سے بیشتر سرکاری نوکری پر جان دیتے تھے، انھیں اس نسل کی تڑپ اور جستجو اور اس کے درد و کرب اور اس کے امکانات پر غور کرنے کی فرصت نہ تھی۔ مولانا آزاد میں یہ کمزوری نہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ عشقِ بلا خیز کا قافلہ سخت جان کس منزل میں ہے۔ مولانا قصۂ جدید و قدیم کو اقبال کے الفاظ میں "دلیل کم نظری" سمجھتے تھے۔

پھر مولانا بہت بڑے مدبر تھے، مگر ان سیاست دانوں اور مدبروں میں سے نہ تھے جو سیاست کو شطرنج کی ایک بساط سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کا ایک نقشہ، قدروں کا ایک معیار اور منزلِ مقصود کا ایک تصور تھا، انھوں نے ہندوستان کے فرقوں میں اتحاد کی ساری عمر کوشش کی، ان کے مرنے پر سکھوں نے جس طرح سوگ منایا اور جس طرح اپنے ایک ہمدرد کے گزر جانے کا ماتم کیا، اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ مولانا کس طرح دوسرے فرقوں کی نفسیات کو سمجھتے تھے اور ان کے دل ہاتھ میں لے سکتے تھے۔ ان کے یہاں اخلاقی قدروں کی اہمیت تھی، وہ منزل اور ذریعہ کے مراتب کو جانتے تھے، وہ جدید علوم کی واقفیت کی وجہ سے موجودہ زندگی کی ضروریات، تقاضوں اور مسئلوں کو دیکھ سکتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ لوگ بادل دیکھ کر بارش کا اندازہ لگاتے ہیں، میں اس وقت بارش کے امکانات دیکھ لیتا ہوں جب آسمان صاف ہوتا ہے تو مولانا

کے عروج وزوال کا راز جانتے تھے، تاریخ کے تسلسل سے واقف تھے، اقتصادی مسائل کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتے تھے، زبان اور علاقے کے ساتھ جو جذباتی لگاؤ ہوتا ہے، اس کی تہ تک پہنچ سکتے تھے۔ سارا ہندوستان ان کے نزدیک ایک کھلی کتاب تھا۔ ان کے کچھ اصول تھے، جن کو وہ کسی شکل میں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، کچھ طریقے تھے جو کسی طرح چھوڑ نہیں سکتے تھے، انھیں اپنے وطن سے، اس کی تاریخ سے، اس کے سارے باسیوں، ان کی ساری خوبیوں اور خامیوں سے ان کی بلندی اور پستی سے محبت تھی، وہ صرف باغیوں کے سردار ہی نہ تھے، معماروں کے رہ نما بھی تھے۔ وہ آگ لگا بھی سکتے تھے اور انھیں بجھانے کی تدابیر بھی اختیار کر سکتے تھے، وہ قانونِ باغبانیِ صحرا سے بھی آشنا تھے اور چمن بندی کے آداب سے بھی۔

وہ بہت بڑے مصنف، بہت بڑے خطیب، بہت بڑے انشاپرداز تھے۔ انھوں نے اردو زبان کو جزالت عطا کی، انھوں نے نثر کے اسلوب میں روانگی پیدا کی۔ تحریر ہو یا تقریر رفعت و سکون اور برگزیدگی و جلال ان کے آس پاس رہے۔

مولانا نے اپنی زندگی کو جو رخ دیا، اس کے بعد یہ مسئلہ زیرِ بحث نہیں رہنا چاہیے تھا کہ اسلام اور قومیت میں کوئی تضاد بھی ہے، مگر ہماری بدقسمتی کہ اسے بار بار سامنے لایا جاتا ہے اور یہی بات یہ ہے کہ صرف مسلمان ہی نہیں لاتے بلکہ کچھ غیر مسلموں کے ذہن میں بھی یہ بات کھٹکتی رہتی ہے، اس لیے کوئی ہندوستانی قومیت کی خاطر ہندو دیوی دیوتا کو اپنا بزرگ سمجھنے پر اصرار کرتا ہے، کوئی ہندوستانی تہذیب سے ہندو تہذیب مراد لیتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ تہذیب اور مذہب کا تعلق ضرور ہے، مگر تہذیبیں مذاہب سے نہیں بنتیں۔ آزادی کے بعد ہمارے ملک میں احیاء پرستی کی تحریک نے اس طرح زور پکڑا ہے کہ بہت سے لوگ ہندوستان کے درمیانی دور کی تاریخ کو کاٹ کر پھینکنا چاہتے ہیں اور مغل دور نے جو مشترک تہذیب ہمیں بخشی ہے اس کی گوناگوں خوبیوں سے انکار پر اتر آئے ہیں، پھر پاکستان نے جس تنگ نظری، ضد اور نفرت کا اظہار ہندوستان کے متعلق اپنا شعار بنا رکھا ہے، اس کی وجہ سے ایسے جذبات و خیالات کو اور شہ ملتی ہے اور مولانا آزاد کا پیام ہندو اور مسلمان دونوں جوش اور اشتعال کی

وجہ سے بھولتے جاتے ہیں۔

اس کا علاج کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ صرف مسلمان سب کچھ نہیں کرسکتے، بلکہ سب کچھ کرنے میں بڑی ذمہ داری اکثریت کی قدرتاً ہے، مگر ہندوستانی شہریت کے جو فرائض ہندوستانی مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں، اگر پورے خلوص، جوش اور انہماک سے ادا کئے جائیں تو اس سے نہ صرف ہندوستانی مسلمان آگے بڑھیں گے، بلکہ ملک کے بھی آگے بڑھنے میں مدد کرسکیں گے، ایک ذہنی رو سے دوسری ذہنی رو پیدا ہوتی ہے۔ قطرہ قطرہ مل کر موج بنتی ہے اور موجیں دریا بن کر پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہیں اور میدانوں کو روندتی چلی جاتی ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں میں یہ مرض اب بھی ہے کہ وہ صرف تصور کا تاریک رخ دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آزادی کے بعد ہماری ذمہ داریاں پہلے سے بڑھ گئی ہیں قفس کے گوشے میں آرام تھا، ہماری پالیسی دوسرے بناتے تھے، ہم صرف اس پر عمل کرتے تھے، جنگ و صلح کے احکام دوسرے دیتے تھے، ہم ان کی پابندی کرتے تھے، اب ہماری اپنی پالیسی ہے اور ہم خود اس پر عمل کرتے ہیں۔ یقیناً ہمارے عمل میں کوتاہیاں ہیں، ہم باتیں زیادہ کرتے ہیں کام کم، ہم دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح انھوں نے محنت اور جانفشانی سے دنیا میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ ہماری آبادی اور ہمارے رقبے نے ہمیں جو اوپری بڑائی عطا کی ہے، اس کا سب سے زیادہ احساس خود ہمیں ہے۔ ہم نے ترقی کی ہے، مگر خاطر خواہ ترقی نہیں کی۔ ہماری قومی دولت میں اضافہ ہوا ہے، مگر ایسے اضافے سے فائدہ سب کو نہیں پہنچا، چند کو پہنچا ہے، ہمارا معیار زندگی ابھی بہت پست ہے، ہمارے یہاں خواندگی کی شرح ابھی قابل اطمینان نہیں۔

ہمارے یہاں جہالت اب بھی عام ہے۔ ہم ابھی قومی مفاد کی خاطر اپنا سب کچھ نثار نہیں کرسکتے، ہم نے صنعتی زندگی میں قدم تو رکھ لیا، مگر اس کے لئے جو شرطیں ہیں وہ پوری نہیں کیں، ہماری زرعی پیداوار خود ہماری ضروریات کے لئے کافی نہیں، اور آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے، ہمارے پاس سائنس دانوں، ڈاکٹروں، انجینیروں کی کافی تعداد نہیں اور

جو ہے اس سے پورا کام نہیں لے پائے۔ ہماری منصوبہ بندی قابل تعریف ہے، مگر اس میں کامیابی خاطر خواہ نہیں ہوئی، ہم اپنی جمہوریت پر فخر کرتے ہیں، مگر ابھی جمہوریت کی روح ہمارے یہاں عام نہیں۔ ہم سیکولرزم کا نام لیتے ہیں، لیکن ہماری سرکاری تقریبوں میں ایک مذہب کے رسوم ادا کیئے جاتے ہیں۔ ہمارے افسر دفتری نظام کے فکر سے نہیں نکل سکتے، ہماری یونیورسٹیاں سستی سیاست کا اکھاڑہ بنتی جا رہی ہیں، ہمارے طلبا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر قومی اشیاء کی توڑ پھوڑ شروع کر دیتے ہیں۔ قانون کا احترام کم ہوتا جا رہا ہے، جسے دیکھو اپنے حلوے مانڈے کی فکر میں لگا ہوا ہے، ذات پات کا بھید بھاؤ، مذہب کے نام پر تفریق، علاقائی پاسداری، لسانی تعصب یہ سب امراض ابھی ہمارے سماج میں موجود ہیں، ہم کام کم کرتے ہیں، اس کا پروپیگنڈا زیادہ۔ ہمارے یہاں دکھاوا زیادہ ہے اصلیت پر توجہ کم۔ ہمیں اپنی ذات، اپنا کنبہ، اپنا قبیلہ، اپنی برادری، اپنی مذہبی جماعت، اپنی زبان، اپنا صوبہ زیادہ عزیز ہے، پورا ملک اس کی ساری آبادی، اس کا مجموعی مفاد، اس کی ساری تاریخ، اس کی تہذیب کے سارے رنگ، اس کا مستقبل، اس کی بڑائی، بلندی، نیک نامی کا اتنا احساس نہیں۔

ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ جہاں آزادی کے سولہ سال کی کوتاہیوں کو نظر میں رکھے، وہاں اس کے کارنامے کو بھی۔ پھر ان کوتاہیوں کو گنانے سے کوئی فائدہ نہیں جب تک ہر فرد اپنے طور پر انھیں دور کرنے کی بھی کوشش نہ کرے۔ یہ کہاں کی ایمان داری ہے کہ خرابیوں کی ساری ذمہ داری صرف حکومت یا اکثریت پر ڈال کر، اقلیتیں صرف کوتاہیوں اور خامیوں کا رونا روتی رہیں اور اس طرح ایک بددلی اور مایوسی کا زہر پھیلائیں۔

سارے ہندوستان کو اور اس کی اقلیت کو اس پر فخر ہونا چاہیئے کہ ہمیں گاندھی جی اور مولانا آزاد جیسے رہنما ملے۔ گاندھی جی کی یہ مثال ہر وقت ہمارے سامنے رہنا چاہیئے کہ اقلیتوں کی صحت و سلامتی کی خاطر انھوں نے اپنی جان بھی نذر کر دی۔ مولانا آزاد کی طرح ہمیں فرقہ پرستی سے ہر حال میں دور رہنا چاہیئے۔ ہمیں اپنے دستور پر فخر ہونا چاہیئے اور اس فلسفۂ زندگی پر جس کا یہ مظہر ہے۔ ہمیں جمہوریت کو اس طرح اپنانا چاہیئے کہ وہ ہماری رگ و پے میں سرایت کر جائے

اور ہمارا مزاج بن جائے۔ ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں، اپنے کاموں میں، اپنے تعلیمی اداروں میں
صرف اس بنا پر لوگوں کا انتخاب نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ ہمارے ہم مذہب ہیں، بلکہ صرف ان
کی صلاحیت کو دیکھنا چاہیئے تاکہ ہمارے ہم مذہب زندگی کے لئے بہترین رہنمائی حاصل
کرسکیں۔ ہمیں یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ہم ایک سیکولر ریاست کے فرد ہیں اور جس طرح حکومت
کو مذہب کی بنا پر کسی شہری کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے کا حق نہیں، اسی طرح ہمیں بھی حق
نہیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری منزل مقصود سوشلزم ہے، جس کا مقصد سب کی صلاحیت
کو ابھارنا، سب کو یکساں مواقع فراہم کرنا اور ایک منصفانہ سماج قائم کرنا ہے۔ ہمیں اپنے منصوبوں
سے واقف ہونا چاہیئے، ہمیں چینی جارحیت کے خطرے کا ایسا احساس ہونا چاہیئے کہ ایک طرف
ہم ملک کو مضبوط اور طاقت ور بنا سکیں اور دوسری طرف اس کی ترقی کی رفتار کو بھی قائم
رکھ سکیں، ہمیں بچاؤ کے کام کو سپھل کرنے کے لئے دولت پیدا کرنی چاہیئے اور دولت
پیدا کر کے بچاؤ کے فرائض سے عہدہ برا ہونا چاہیئے۔ اس کام کے لئے اپنی تعلیم، اپنے ملک
اپنے وطن سے اس عشق کی ضرورت ہے جو عشق کو ہی عبادت اور فضیلت سمجھتا ہے، اس میں
انعام یا سود و سودا کے پہلو نہیں دیکھتا۔

اس بات کے کہنے کی اس لئے ضرورت پڑی کہ قوم کی کوتاہیوں کو خود کچھ نہ کرنے کا بہانہ بنانا خاصا عام
ہے اور ہندوستانی مسلمانوں میں بھی یہ مرض ابھی موجود ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر
ہندوستانی مسلمانوں نے ابھی تک ہندوستانی قومیت سے وہ گہری ذہنی اور جذباتی وابستگی محسوس نہیں کی جو انھیں
کرنی چاہیئے۔ ان کے دل میں یہ خلش موجود ہے کہ قومیت سے یہ ذہنی اور جذباتی وابستگی انھیں اسلام سے دور کر دے
گی۔ مشکل یہ ہے کہ در اصل وہ حقیقی اسلام سے خود خاصے دور ہیں۔ وہ رسم و رواج کے اسیر ہیں۔ ان میں سے بہت
سی چیزیں زمانے کے ہاتھوں بدل رہی ہیں اور بدلیں گی۔ حقیقی اسلام ان تبدیلیوں کے لئے خاصی گنجائش
رکھتا ہے۔ یہ ایک ترقی پسند اور عملی مذہب ہے۔ لیکن ہندوستانی مسلمان لکیر کا فقیر، تبدیلی سے
ڈرنے والا، اپنے دائرے میں سکڑا ہوا احساس کمتری کا شکار ہر نئی لہر کو ایک ایسی بلائے آسمانی سمجھنے والا ہے جو زمانہ اندری کی ناکہ
خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ملک کے ہر مسئلے کو اپنا سمجھنا، اس کی آزادی اور سالمیت کی

حفاظت کے لیے ہر حال میں تیار رہنا اس کی عزت اور شہرت کا ہر وقت خیال رکھنا، اس کی ترقی کے لئے کوشش کرنا، اس کے تمام مذہبی فرقوں کا احترام کرنا۔ اس کی تہذیب کے ہر رنگ پر فخر کرنا اور اسے اپنانا یہ ہر ہندوستانی کا فرض ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستانی شہریوں کی حیثیت سے اس فرض سے خوش دلی فخر اور اعتماد کے ساتھ عہدہ برآ ہونا ہے۔ اس معاملے میں کئی قسم کے ذہنی تحفظات، کوئی وسوسہ، کوئی دبدھا، کوئی شک، کوئی شبہ گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے قومی مسائل کے حل کے لئے دوسروں کی طرف دیکھنا، اپنی مشکلات کو دور کرنے کے لئے دوسروں کے سہارے ڈھونڈنا کسی طرح جائز نہیں۔ ہمیں اپنے مسائل گفتگو سے بحث مباحثے سے اور آئینی ذرائع اور جمہوری طریقوں سے طے کرنے ہیں۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے، کسی سے لو لگانے، کسی کا منہ تکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کہنے کی اس لئے ضرورت پڑی کہ ایک اخبار نے حال ہی میں کلکتے کے فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کو بھی باخبر کرنے کی بات کی تھی۔ دوسرے ملک کے مسلمانوں سے خالص مذہبی معاملات میں تبادلۂ خیال ہو سکتا ہے، لیکن قومی اور سیاسی مسائل میں اس قسم کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ہمارا اپنا گھریلو مسئلہ ہے اور گھر والوں سے مل کر ہی اسے سلجھانا ہے۔

(۲)

ان قومی مسائل کے علاوہ ایک مسئلہ اور بھی ہے جس پر اکثر گفتگو ہوتی ہے، یعنی مسلمان کونسی سیاسی جماعت میں شامل ہوں۔ یہاں بھی ایک بنیادی غلطی سامنے آتی ہے۔ تمام مسلمانوں کا سیاسی مفاد ایک نہیں۔ مسلمانوں میں جو سرمایہ دار ہیں ان کا مفاد غیر مسلم سرمایہ داروں کے ساتھ وابستہ ہے۔ جو ان میں مزدور ہیں، ان کا فائدہ دوسرے مزدوروں کا ساتھ دینے میں ہے۔ مسلمان راجہ اور نواب، ہندو راجاؤں کے ساتھ ایک مضبوط رشتہ رکھتے ہیں۔ مسلمان کلرک ہندو کلرکوں کے ساتھ۔ مسلمان استاد، دوسرے غیر مسلم استادوں کے ساتھ۔ اس لئے تمام مسلمانوں کو ایک سیاسی جماعت میں شامل کرنے کی بات اول تو کسی طرح صحیح نہیں، دوسرے قابل عمل بھی نہیں۔ آج بھی ہندوستان کی ہر سیاسی پارٹی میں کچھ مسلمان شریک ہیں، یہاں تک کہ

جن سنگھ میں بھی جو راشٹریہ سمبھتا کی دعوے دار ہے اور ہندو راج کا نقشہ گول الفاظ میں سہی سامنے لاتی رہتی ہے۔ اس لئے مولانا آزاد نے آزادی کے بعد مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے کی جو دعوت دی تھی وہ ایک کانگریسی کی حیثیت سے کتنی ہی بجا کیوں نہ ہو، ایک مسلمان کی حیثیت سے صحیح نہ تھی۔ رفیع احمد قدوائی اس معاملے میں زیادہ صایب رائے رکھتے تھے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو اپنی پسند کی سیاسی پارٹیوں میں شریک ہونا چاہیئے۔ اگر وہ عملی سیاست میں حصّہ نہ بھی لے تو کسی سیاسی پارٹی سے اس کی ہمدردی ضروری ہے۔ بہرحال اسے سیاسی معاملات کا شعور تو ہونا ہی چاہیئے۔ ہاں کسی مذہبی جماعت کو سیاسی جدوجہد بالکل نہیں کرنا چاہیئے، اسے صرف مذہبی معاملات اور مخصوص تہذیبی مسائل کی نگہداشت پر توجہ کرنی چاہیئے۔ مذہبی معاملات میں اور مخصوص تہذیبی معاملات میں تمام سیاسی پارٹیوں کے مسلمان ممبر مل کر کام کرسکتے ہیں اور انھیں کرنا چاہیئے۔ مسلم لیگ ہو یا ہندو مہاسبھا اگر یہ مسلمانوں کے مذہبی اور مخصوص تہذیبی مسائل کی نگہداشت کریں گے تو جائز ہے۔ اگر یہ سیاسی معاملات میں دخل دیں، جماعت اسلامی ہو یا جمعیتہ العلمائے ہند، انھیں بھی سیاسی مسائل سے بالکل کنارہ کش ہونا چاہیئے۔ جب تک یہ نہ ہوگا، غیر مسلموں میں بھی مذہبی جماعتیں، سیاسی مسائل میں ٹانگ اڑاتی رہیں گی اور اس کی وجہ سے سیاسی مسائل الجھیں گے، سلجھیں گے نہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ جمعیتہ العلمائے ہند کا ہندوستان کی جنگ آزادی میں ایک نمایاں رول رہا ہے اور آزادی کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن (مرحوم) جیسے رہنماؤں نے قومی زندگی کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کو ہم آہنگ رکھنے کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔ مگر اب حالات کا تقاضا کچھ اور ہے اور حالات کو نظر انداز کرکے ہم اپنا نقصان کریں گے کسی اور کا نہیں۔ جماعت اسلامی جس حد تک ہندوستانی مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی تعلیم سے آشنا کرنا چاہتی ہے اور انھیں سچا اور اچھا مسلمان بنانا چاہتی ہے، یہ قابلِ تعریف ہے، مگر وہ مسلمانوں کو من حیث الکل ایک سیاسی پروگرام کی طرف بلاتی ہے تو اس سے فرقہ پروری کو ہوا ملتی ہے کسی سیکولر نظام میں مذہبی بنیادوں پر سیاست کا کھیل کھیلنا خطرناک ہے اور اقلیت کے لئے تو اور بھی خطرناک ہے۔ کاش اس نکتے پر لوگ

سنجیدگی سے غور کرتے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مذہبیت فرقہ واریت ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک سچی مذہبیت تمام مذاہب کا احترام کرتی ہے اور انھیں مل جل کر رہنا سکھاتی ہے۔ ہاں مذہبی بنیادوں پہ سیاست میں حصہ لینا اور ایک مذہب کے ماننے والوں کو ایک سیاسی پروگرام کی طرف بلانا، فرقہ پرستی کو تقویت ضرور پہنچاتا ہے۔ خواہ بلانے والوں کا یہ مقصد ہو یا نہ ہو۔

(۳)

ہندوستانی مسلمانوں کے کرنے کے سینکڑوں کام ہیں جو انھوں نے اب تک نہیں کیے۔ ان کو چاہیے تھا کہ ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں میں بچوں کے لئے اور ان پڑھ بالغوں کے لئے اسلام کی بنیادی تعلیم، سیرت رسول، اسلامی تاریخ کی روشن تصویریں، اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں شائع کرتے اور ان میں کسی فرقے (شیعہ، سنّی وغیرہ) کی طرف میلان نہ ہوتا۔ کوئی اس طرف توجہ نہیں کرتا کہ ہر سال عید کے موقع پر رویت ہلال کے سلسلے میں کتنا اختلاف ہوتا ہے۔ اب کے تو علی گڑھ میں عام طور پر صبح کو لوگوں کو معلوم ہوا کہ آج عید ہے۔ اس علی گڑھ میں یونی ورسٹی کی مسجد میں ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے میں نماز کے لئے لاؤڈ اسپیکر لگانے کی تحریک ہوئی مگر اس کی شدت سے مخالفت کی گئی۔ بالآخر شاہ سعود کے عمل نے اس کے لئے دروازہ کھولا۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر جو یونی ورسٹیوں میں پڑھاتے ہیں، عام طور پر ہمارے علماء نہ صرف جدید علوم سے واقف نہیں، انھیں اس کی بھی خبر نہیں کہ مغربی ممالک میں قرآن، حدیث، سیرت رسول اسلامی تاریخ، اسلامی قوانین پر کتنی بلند پایہ تحقیق ہوئی ہے۔ مگر یہ جدید علوم اور جدید دور کے مسائل پر بے دھڑک اظہار خیال کر دیتے ہیں۔ آج کل سیاست، اقتصادیات پر منحصر ہے سیاسی مسائل پر رائے زنی کرنے والے علماء اقتصادیات سے کتنے واقف ہیں۔ انھیں کینس، پیگو، مارکس، شومپیٹر کے افکار سے کس قدر آگاہی ہے۔ اور تو اور ہندوستان کے علماء کو اسلامی ممالک کے علماء کے افکار و نظریات کا کتنا علم ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی جذباتیت اور ناسمجھی کا سب سے افسوس ناک مظاہرہ اس وقت ہوا جب حکومت کی طرف سے مسلم پرسنل لا پر غور و خوض کرنے کے لئے ایک کمیشن کی تحریک ہوئی۔ ہمارے علمائے ہند نے فوراً اسے مداخلت فی الدین قرار دیا، مگر علماء، ایسے وقت نہ معلوم کیوں

خاموش رہے جب اودھ کے متعلقہ دار رواجی قانون کی خاطر اسلامی قانون کو نظر انداز کرتے رہے اور
مذہب نے جو حقوق دیئے تھے انہیں اپنے اقتدار کو قائم رکھنے اور اپنی دولت کو محفوظ رکھنے کے لئے
دھڑلے سے پامال کرتے رہے۔ ہمارے یہاں برسوں مسجد کے سامنے باجا بجانے پر فرقہ وارانہ فسادات
ہوئے ہیں مگر دہلی میں جب کسی کے یہاں شادی ہوتی ہے تو ایسا زور شور سے فلمی ریکارڈ لاؤڈ اسپیکر کے
ذریعے نشر کئے جاتے ہیں کہ نماز بھی حرام ہو جائے اور نیند بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا
پر غور کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے کمیشن کی مخالفت کرنے والوں میں پروفیسر ہمایوں کبیر، پروفیسر
مجیب جیسے روشن خیال لوگ بھی تھے، ان کا کہنا یہ تھا کہ پرسنل لا میں اصلاح کی ضرورت ہے، مگر
حکومت کو یہ کام نہیں کرنا چاہیئے۔ حالانکہ حکومت نے اصلاح کے لئے کوئی قانون نہیں پیش
کیا تھا۔ اس نے صرف یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی
بنائی جائے، جس کی رپورٹ پہلے پبلک کے سامنے اور پھر پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہو۔ دہلی میں
مستشرقین کی جو بین اقوامی کانگریس ہوئی، اس میں ایک مباحثہ بھی اس موضوع پر ہوا اور مولانا
سعید احمد نے دین اور شریعت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے مسلم پرسنل لا میں ترمیم کی ضرورت کو تسلیم
کیا، مگر اس پر اصرار کیا کہ اس ترمیم کا حق صرف علمار کو ہے۔ مولانا نے اس بات کو نظر انداز کر دیا
کہ یہ خالص قانونی مسئلہ ہے اور اس میں ان لوگوں کی رائے کی اہمیت ہے جو مسلم لا سے اچھی طرح واقف
ہیں مسلم لا سے کوئی شخص اس وقت تک واقف نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ اس کے سرچشمے یعنی
قرآن اور حدیث اور فقہ کے چاروں مسلکوں سے واقف نہ ہو۔ پھر اس مسئلے پر غور کرنے کے
لئے یہ ضروری ہے کہ شام، مصر، ترکی، عراق، تیونس، اور خود پاکستان میں مسلم لا کی اصلاح کے
سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے یا کیا گیا ہے وہ ذہن میں ہو۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ان مسائل سے اچھی طرح
واقف ہیں انہیں اس مسئلے پر ماہرین کا درجہ رکھتے ہیں۔ خواہ وہ علمار کے طبقے سے تعلق رکھتے ہوں
یا نہیں، انہیں کی رائے زیادہ اہم ہے۔ لکھنؤ کے کچھ علما نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی
بھی بنائی ہے، مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ علما کے دوسرے گروہ ان کی رائے کو مان لیں گے۔ ہاں اگر
حکومت کوئی کمیشن مقرر کرتی اور اس میں اسلامی قانون کے ماہرین کے علاوہ، علمار کی بھی نمائندگی ہوتی

تو اس کا امکان تھا کہ چند باتوں پر اتفاق ہو جاتا۔ مثلاً تعدد ازدواج پر یہ پابندی لگائی جا سکتی ہے کہ دوسری شادی کرنے کے لئے ایک سرکاری کمیٹی سے اجازت حاصل کرنی ضروری ہوگی جس میں ایک جج اور ایک عالم شامل ہو۔ اسی طرح وراثت کے سلسلے میں باپ کی زندگی میں اس کی اولاد میں سے کسی کے مر جانے پر اس کی اولاد اپنے حق سے محروم نہ رہتی۔ یا عورت کو خلع حاصل کرنے کے لئے نان نفقہ سے محرومی کا ثبوت نہ پیش کرنا پڑتا، بلکہ شوہر کی بدسلوکی یا زوجین کے مزاجوں میں نامناسبت کافی سمجھی جاتی۔ کاش اس سلسلے میں مولانا آزاد کے اس بیان پر غور کیا جاتا جس میں شام کے علما کی تائید کی گئی تھی۔ مولانا اس معاملے میں بھی صحیح رہنمائی کی جرات رکھتے تھے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں ایک عجیب دورنگی ہے۔ وہ یہ گوارا کرلیں گے کہ وہ مسلمان سرکاری افسر جو آئی سی ایس میں ہیں، سرکاری احکام کے تحت دوسری شادی نہ کرسکیں یا رواجی قانون، اسلامی قانون کو پامال کرتا رہے، مگر مجموعی طور پر مسلمانوں کے مفاد کے لئے اپنی حکومت اور اپنی پارلیمنٹ کو کوئی ایسا قدم اٹھانے نہ دیں گے جو موجودہ زندگی کی ضروریات کے مطابق ہو اور اسلام کی بنیادی تعلیم سے ہم آہنگ۔ ظاہر ہے کہ نص صریح کے انحراف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن جن معاملات میں کوئی واضح ہدایت نہیں، یا جہاں فقہی دبستانوں میں اختلاف ہے، وہاں جس امر میں سہولت ہے اس سہولت کو اپنانے میں کیا حرج ہے۔ پھر پارلیمنٹ کے مسلم ممبران کی اکثریت اگر کسی اصلاح کے لئے تیار ہو جائے تو اس کے ماننے میں تامل کیوں ہو؟۔

(۴)

سرسید نے جب مدرسۃ العلوم کا نقشہ بنایا تھا تو اس میں علمار کی ایک جماعت تیار کرنے کا پروگرام بھی تھا جو جدید علوم سے واقف ہوں۔ مگر سرسید ایم اے او کالج کے مسائل میں ہی الجھے رہے اور یہ نقشہ کاغذ پر رہ گیا۔ شبلی نے حریت پسند اور حالات زمانہ سے باخبر علمار کی تربیت کے لئے ندوہ کی بنیاد ڈالی، مگر انہیں اتنا زچ کیا گیا کہ بالآخر وہ میدان چھوڑ کر چلے گئے۔ دیوبند قرآن اور حدیث کے عالم تو تیار کر سکتا ہے، مگر جدید علوم کی طرف کیا مائل ہوتا جبکہ انگریزی کی تعلیم کی طرف

اب جا کر اس نے توجہ کی ہے۔ اس لئے چند اشخاص کو چھوڑ کر (میرے ذہن میں اس وقت صرف تین نام آتے ہیں۔ ایک تو مولانا حفظ الرحمٰن تھے، دوسرے مولانا سعید احمد اکبر آبادی ہیں اور تیسرے مولانا ابوالحسن علی، جو جدید علوم اور جدید مسائل کا عرفان نہ سہی، احساس تو رکھتے ہیں) عام طور پر ہمارے علماء موجودہ دور کے مسائل کو حل کرنے میں ہماری زیادہ مدد نہیں کر سکتے۔ افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو ممتاز اور صلاحیت رکھنے والے افراد ہیں جو مشرقی اور مغربی علوم کے سرمائے پر نظر رکھتے ہیں اور جن کے سینے میں اسلام کا درد بھی ہے، ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین، اب نائب صدر ہو گئے۔ وہ اب پورے ملک کے رہنما ہیں اور صرف مسلمانوں کی رہ نمائی نہیں کر سکتے۔ ہمیں دراصل ایک سرسید ثانی کی ضرورت ہے جس کے سامنے گاندھی جی کی مثال ہو، جو آزادی کے وقت دہلی کے قصر و ایوان سے دور، نواکھالی اور بہار کے محشرستانوں میں تھے اور جو آزادی کے بعد حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بجائے زخموں پر مرہم رکھنے اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے میں لگے ہوئے تھے اور جو اقلیتوں کے ساتھ انصاف کے لئے جان کی بازی لگا سکتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس رہنما کو حکومت کے بام و در کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے۔ اسے ہندوستانی مسلمانوں کو سچا ہندوستانی اور سچا مسلمان بنانے کے کام میں ساری عمر صرف کر دینی چاہیئے۔ اسے سرسید کی طرح ایک نیا تہذیب الاخلاق نکالنا چاہیئے اور فضا ہموار کر کے سینکڑوں کی تعداد میں ایسے اشخاص پیدا کرنے چاہئیں جو ایک طرف اسلام پر گہری نظر رکھتے ہوں اور دوسری طرف جدید علوم کے فاضل ہوں۔ پھر اسے ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں جو علاقائی زبانوں میں مذہبی لٹریچر کے ساتھ قومی ضروریات کا بھی احساس دلائیں۔ یہ دور سائنس، ٹیکنالوجی اور صنعت و حرفت کا ہے اس میں ہندوستانی مسلمانوں کو مناسب جگہ بنانا ہے اور ان مسلمانوں کی صحیح مذہبی بنیاد اور قومی بنیاد کی نگہداشت ان اداروں کا کام ہے۔ اسلام ایک ایسا سادہ، عملی اور ترقی پذیر پروگرام رکھتا ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر ہمارا ساتھ دے سکتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس معاملے میں رسم و رواج یا سستے سیاسی مصالح یا تھوڑی سی غیر ہر دلعزیزی کو نظر انداز کر سکیں۔ یہ ہوتا آیا ہے کہ لوگ پہلے اپنے محسنوں پر پتھر پھینکتے ہیں لیکن اگر وہ خلوص اور لگن کے ساتھ اپنے مشن کو پورا کرنے میں لگے رہتے ہیں تو رفتہ رفتہ

پتھر پھینکنے والے ہی ساتھ ہونے لگتے ہیں۔

ایک طاقت ور، مضبوط، خوش حال، متحد ہندوستان کی تعمیر کا کام بڑا مقدس کام ہے۔ یہ کام ہم سے پورا خلوص، مکمل ذہنی وابستگی، پیہم عمل اور مسلسل کاوش چاہتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان اپنے مذہبی ورثے، اپنی مخصوص تہذیبی صلاحیتوں، اپنی قابل لحاظ تعداد کی وجہ سے اس مقدس کام کے انجام دینے میں بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ ملک کو اونچا اٹھانے میں وہ خود بھی اونچا اٹھتے ہیں ملک کمزور ہوتا ہے تو وہ بھی کمزور ہوتے ہیں۔ جب تک وہ سکڑے سمٹے بیٹھے رہیں گے، جب تک وہ ہر نئی تحریک اور نئی لہر سے خوف زدہ رہیں گے، جب تک وہ احساس کمتری کا شکار رہیں گے تب تک وہ خود بھی پریشانی میں رہیں گے اور ملک کے لئے بھی پریشانی کا باعث ہوں گے، جب وہ یکسوئی کے ساتھ قوم کے دکھ درد میں شریک ہوں گے، اس کے ہر مسئلے کو اپنا ذاتی مسئلہ سمجھیں گے اور ملک کو اچھے شہری، ایماندار کارکن، لائق استاد، سچے طالب علم، خدمت کے موقع پر آگے رہنے والے اور عہدوں کی تقسیم کے وقت پیچھے رہنے والے افراد دے سکیں گے۔ تو نیا ہندوستان نہ صرف ان پر فخر کرے گا، بلکہ وہ اسلام کے حیات بخش اور حیات آفریں پیام سے بھی زیادہ مانوس ہوگا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے قومی معاملات میں عمل پر ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کا بڑی حد تک انحصار ہے۔ [۵]

کانٹوں کی زبان سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادئ پر خار میں آوے

میرے مولانا

محترمہ صالحہ عابد حسین

مولانا ابوالکلام آزاد کا نام ملک کے ایک مشہور لیڈر، بہت بڑے ادیب اور جوشیلے مقرر کی حیثیت سے ہوش سنبھالتے ہی کان میں پڑا تھا اور بچپن ہی سے ان سے وہ عقیدت تھی جو نوعمری میں قومی ہیروؤں سے ہوجایا کرتی ہے۔ مگر اس روایتی احترام میں سچی عقیدت کا رنگ مولانا کی زندۂ جاوید تصنیف تفسیر سورۂ فاتحہ اور ترجمان القرآن کے مطالعہ کے بعد شامل ہوا۔ گذشتہ تیس پینتیس برس سے مولانا کی یہ تصنیف مسلسل میرے زیر مطالعہ رہی ہے۔ میں مولانا کی دوسری تصانیف کی بھی دلدادہ ہوں۔ ان کی ادبی و علمی حیثیت مسلم ہے۔ بلکہ میرے دماغ پر مولانا کی شخصیت کا جو نقش ہے وہ ترجمان القرآن سے اس طرح ملا جلا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر پاتی۔ ان کے تصور کے ساتھ ہی میرے ذہن پر مفسر قرآن کا مقدس چہرہ ابھرتا ہے جس پر فرشتوں کی سی پاکیزگی اور اولیا اللہ کا سا تقدس حلقہ کئے ہوتا۔ مگر فرشتگی کی اس معصومیت میں ان سے ملنے کے بعد انسانیت کے جو خدوخال ابھرے انھوں نے ان کی شخصیت میں غضب کی کشش بھر دی۔

مولانا آزاد جیسی عظیم شخصیت پر، جس کی زندگی کے کارناموں کے بیان کے لئے بڑے بڑے دفتر ناکافی ہوں، قلم اٹھانا آسان کام نہیں۔ ان کی بے مثال ذہانت اور غیر معمولی قابلیت، ان کا علمی اور ادبی درجہ، تعلیمی خدمات، ان کا سیاسی مقام، ملک کی آزادی کے لئے ان کی ان تھک جدوجہد اور اس کے لئے دکھ جھیلنے اور قربانیاں دینے کی بے پناہ صلاحیت، دیس کے لئے کی گئی ان کی قابل قدر کوششیں یہ سب ان کی زندگی کے وہ باب ہیں جن سے بڑے صاحبانِ علم و قلم، اربابِ سیاست اور مولانا کے قریبی دوست پوری طرح انصاف کر سکتے ہیں۔ میں اپنا یہ منصب نہیں سمجھتی کہ ان میں سے کسی پر قلم اٹھاؤں۔ ہاں ان کی ایک عقیدت مند اور ان کی عنایات و محبت کی مرہونِ منت ہونے

کے نکلتے ـــــ میں نے مولانا کو جیسا پایا اس کی چند جھلکیاں پیش کرنے کی جرأت کروں گی۔

میری پہلی ملاقات مولانا آزاد سے ۱۹۴۶ء میں ہوئی جب وہ آصف علی صاحب کے ہاں مقیم تھے۔ اس سے پہلے میں نے دور سے دو ایک بار کسی جلسے میں شرکت یا صدارت کرتے ان کی جھلک ضرور دیکھی تھی مگر ملنے کا موقع نہ ملا تھا۔ سمندر کی پہلی جھلک دیکھ کر انسان کے دل پر اس کی وسعت و گہرائی، عظمت و جلال کا ایک عجیب سا اثر ہوتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت پہلی بار مولانا کو دیکھ کر میری ہوئی تھی۔ ان کی ذہین اور سنجیدہ آنکھیں جن کی گہرائی اتھاہ تھی، کشادہ پیشانی پر غور و فکر کی گہری لکیریں، کچھ کھوئی کھوئی سی شفقت بھری مسکراہٹ اور ان سب کا ایک ملا جلا دل کش امتزاج جو ان کے سارے وجود پر چھایا ہوا سا تھا مخاطب کے دل پر سے اپنی کم مائگی کے احساس کو جو اس بڑی ہستی کے سامنے وہ محسوس کرتا، دور کر دیتا تھا۔ اور پھر سب سے زیادہ وہ ان کی فصیح و بلیغ گفتگو کے حسن سے مسحور ہوتا جس میں ہاتھوں کی با موقع حرکت اور چشم و ابرو کے مناسب اشارے اور زور، وزن وقار اور دلنشینی پیدا کر دیتے تھے۔ آج بھی اس پہلی ملاقات کا سارا نقشہ میری نظروں میں یوں گھوم جاتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ ان کو دیکھ کر عقیدت و احترام کے ساتھ ساتھ محبت اور اپنائیت کی کچھ ایسی کیفیت تھی جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مجھے اپنے کوئی کھوئے ہوئے شفیق بزرگ معلوم ہوئے جن کو میں گویا ہمیشہ سے جانتی پہچانتی ہوں۔ میرے ساتھ میرے بھائی اور شوہر بھی تھے مگر مولانا کی اس وقت پوری توجہ میری طرف تھی، شاید وہ میرے دل سے رعب و اجنبیت کو دور کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے میرے والد مرحوم اور مولانا حالی کا تذکرہ چھیڑ دیا اور بڑے احترام سے ان دونوں کے قصے سناتے رہے۔ میری ادبی دلچسپی کا حال سن کر خوش ہوئے، اپنی جو کتاب میں پیش کرنے کو لے گئی تھی اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے، سوال کرتے اور میری ہمت افزائی کرتے رہے۔ کئی بار کہا "جب تمہارا جی چاہے آجایا کرو"۔ مولانا جیسے معروف اور خلوت پسند کا کسی سے یہ کہنا بڑا اعزاز تھا اگرچہ میں نے ان کی اس عام اجازت سے غلط فائدہ نہیں اٹھایا اور مہینوں کے وقفے کے بعد، اجازت لے کر ہی حاضر ہوتی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں میں نے مولانا سے ترجمان القرآن کی دوسری جلد کے بارے میں دریافت کیا جس پر انھوں

نے فرمایا کہ جلد ہی چھپ کر آنے والی ہے۔ (تیسری اور آخری جلد کے بارے میں بھی، اس وقت بھی ــــ اور بعد میں بھی بار بار ــــ فرمایا کہ نظر ثانی وغیرہ کا کام باقی ہے جب ہو جائے گا تو شائع ہو گی۔ افسوس کہ میری طرح اور ہزاروں عقیدت مندوں کی یہ تمنا اب حسرت میں بدل چکی ہے)۔

جب پہلی جلد کا دوسرا اڈیشن چھپ کر آیا تو میری دلچسپی دیکھتے ہوئے اس کی ایک کاپی مولانا نے اپنے دستخط کے ساتھ مجھے بھجوائی۔ اور اسی طرح ایک کاپی غبار خاطر کی عنایت کی۔

اور پھر ۴۷ء کا زمانہ آیا ــــ ملک کی آزادی، ہندوستان کی تقسیم اور فسادات کے واقعات پیش آئے . . . . میں اس زمانے میں پونا میں تھی۔ جنوبی ہند میں شمالی ہند کی سی قیامت نہ تھی۔ مگر شمالی ہند خصوصاً دلی اور پانی پت میں ہونے والے حادثات اور وہاں عزیزوں اور دوستوں پر جو گزر رہی تھی اس نے انتہا سے زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔ اس زمانے میں ڈھارس مہاتما گاندھی کی پیار بھری باتوں، پنڈت نہرو کے بیانوں اور مولانا آزاد کی تقریروں سے بندھتی تھی اور یاس کے گھپ اندھیرے میں آس کی کوئی چنگاری کبھی کبھی دمک اٹھتی۔ مگر ایمان و یقین کی جو شمع دل کے کسی کونے میں جلتی رہ گئی وہ مولانا آزاد کے ترجمان القرآن اور تفسیر کی بدولت ہی تھی ــــ ورنہ خدا جانے کہ کیا انجام ہوتا۔

اس قیامت خیز زمانہ میں دلی میں مسلمانوں کے پاؤں جیسے بالکل اکھڑ چکے تھے اس وقت مولانا آزاد نے جامع مسجد میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگوں کے مجمع میں وہ تاریخی اور معرکۃ الآرا تقریر کی جو مولانا جیسی شخصیت ہی کر سکتی تھی۔ مدت کے بعد وہ مسلمانوں کے کسی بڑے مجمع کے سامنے تقریر کرنے کھڑے ہوئے تھے۔ اس لئے کہ یہ بدنصیب لوگ پہلے مولانا سے بدگمان کر دئے گئے تھے اور کوئی گستاخی نہ تھی جو مولانا کی شان میں نہ کی گئی ہو، کوئی الزام نہ تھا جو ان کی پاک و صاف زندگی پر نہ لگایا گیا ہو ــــ مگر مولانا آزاد کی عالی ظرفی دیکھئے کہ جب ان کو مصیبت و دکھ میں دیکھا تو ایک پل تامل کئے بغیر وہ ان کی سرپرستی اور مدد کے لئے کمربستہ ہو گئے، دل میں تلخی کا ایک شمہ نہ رکھا، کوئی رنجش، کوئی شکایت نہ رہی۔ اور انھوں نے کھلے دل اور صاف ضمیر

کے ساتھ پھر اپنی بدنصیب ملت کی رہنمائی اور دست گیری کا بار کندھوں پر اٹھا لیا۔ دل میں درد کی لہریں دماغ میں غم کی ٹیسیں تھیں مگر ایمان و یقین کا یہ پہاڑ جانتا تھا کہ اب بھی ان کو سنبھالا اور ہندوستان میں جمایا جا سکتا ہے۔ دلی کے اور بہت سے آدمیوں کی طرح میرے چھوٹے بھائی جان بھی اس زمانہ میں اپنا گھر بار لٹا کر مولانا کے سایۂ عاطفت میں تھے۔ وہ اس یادگار اجتماع میں موجود تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مولانا بول رہے تھے اور ایک لاکھ آدمی دم بخود سن رہے تھے۔ تقریر میں رقت تھی، ملامت تھی، محبت تھی، خلوص تھا، غلط رہنمائی پر یقین کر لینے پر سرزنش تھی اور آئندہ کے لئے سیدھے راستے پر چلنے کی ہدایت تھی۔ امید کا پیام تھا، مصائب میں صبر کرنے، کٹھنائیوں کو جھیلنے اور ثابت قدم رہنے کا وہ درس تھا جو قرآن نے مسلمانوں کو پڑھایا تھا۔ اور ساتھ ہی اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے حفاظت کا وعدہ اور یقین دلایا گیا تھا۔ خلوص و جوش، درد رقت، فصاحت و بلاغت کا ایک چشمہ ابوالکلام کی زبان سے ابل رہا تھا اور کئی لاکھ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ رہا تھا۔ دل پر سے غم و یاس کی گھور گھٹا چھٹنی شروع ہو گئی تھی اور امید و ایمان کی شمع جل اٹھی تھی۔

پہلی چیز یہی تقریر تھی جس نے مسلمانوں کے اکھڑے قدم جمانے شروع کئے اور پھر چند دن بعد مہاتما گاندھی کے تاریخی برت اور پھر ان کی شہادت نے تو حالات کا دھارا ہی بدل دیا اور سچ مچ ایک چمتکار دکھایا۔

میرا مقصد اس وقت ان تکلیف دہ واقعات کو دہرانا نہیں جو اس زمانے میں ملک کے دونوں حصوں میں پیش آئے بلکہ مولانا آزاد کی عالی ظرفی اور تدبر کی ایک جھلک پیش کرنا تھا جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑنے کا کام انجام دیا۔

۴۸ء کے شروع میں بمبئی سے واپسی پر میں دوسری بار مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئی ۴۷ء کے حادثات و واقعات کا مجھ پر بہت سخت اثر تھا۔ اپنے وطن پانی پت کی تباہی عزیزوں اور دوستوں کی مصیبت، دلی کے فسادات، مکتبہ جامعہ کی آتش زنی جس میں میری

اور میرے شوہر کی سب تصانیف نذرِ آتش ہو گئیں تھیں یا لٹ گئی تھیں ـــــ اور پھر سارے دیس میں ہونے والے واقعات، حادثات کا ایک سلسلہ تھا جس نے دل و دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ دل میں بڑی تلخی تھی۔ مولانا میری کیفیت سمجھ گئے۔ خود مولانا کے چہرے پر تکان اور بڑھاپے کے اثرات صاف نظر آرہے تھے مگر وہ حسبِ عادت بڑی شفقت سے ملے۔ اور مجھے سمجھاتے اور دلاسا دیتے رہے۔ میں نے دس کروڑ مسلمانوں کی مصیبت میں پھنسنے اور تقسیم ہند کے جو اثرات ظاہر ہوئے ان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اپنی ناسمجھی سے میں ان سب کا ذمہ دار ایک مخصوص شخصیت کو سمجھتی تھی۔ لیکن میری باتیں سن کر مولانا نے جو کہا اس کا نقش کبھی میرے دل سے نہیں مٹ سکتا۔ اس دن میں نے سیکھا کہ اپنے بدترین دشمن کو بھی کسی طرح معاف کیا جا سکتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اُس منحنی جسم کے اندر وسیع قلب اور عالی ظرف پنہاں تھا جس میں عفو اور انصاف پسندی کا بے بہا جوہر جلوہ گر ہے۔ اپنے بدترین دشمن اور بدخواہ کی (جس کی بدولت مولانا کی آفتاب جیسی روشن سیرت اور شخصیت پر خاک ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی) انھوں نے جس صفائی قلب اور وسیع النظری کے ساتھ صفائی پیش کی اور جس شرافت کے ساتھ اس کا ذکر کیا، میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ انھوں نے مجھے سمجھایا کہ تمھیں کسی کی نیت پر شبہ نہیں کرنا چاہیئے۔ انھوں نے تو اپنے نزدیک بہتری ہی کے لئے کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اور ان سے ملنے کے بعد میرے دل پر کدورت، مایوسی اور غم کے جو بادل چھائے ہوئے تھے وہ سب چھٹ گئے اور میں ان کے پاس سے ایک نئی طاقت اور حوصلے کر واپس آئی۔

اس کے بعد مولانا سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ویسے تو کسی جلسے، کسی ایٹ ہوم، کسی فنکشن وغیرہ میں بھی ملنا ہو جایا کرتا مگر سال میں دو ایک بار میں ان کے گھر جا کر بھی ضرور مل کر آتی۔ کبھی اپنی کسی نئی تصنیف کو پیش کرنے کا بہانا بنا کر جاتی۔ کبھی اپنے بھائی یا شوہر کو ان کے پاس جاتا دیکھ کر ساتھ ہو لیتی۔ کبھی عید یا نئے سال پر سلام کرنے حاضر ہو جاتی اور

مولانا ہمیشہ ہی عنایت و خصوصیت فرماتے اور میرے والد اور مولانا حالی کا ذکر اکثر کیا کرتے۔ خاص کر حالی سے انھیں بڑی عقیدت معلوم ہوتی تھی۔ اکثر کہتے "مولانا حالی متانت و سنجیدگی کی تصویر تھے"۔ میں نے مولانا حالی کی سوانح عمری یادگار حالی لکھی تو اس کا مسودہ لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ان کی مصروفیت اور بلند ادبی مقام جانتے ہوئے بھی ان سے اس کتاب پر پیش لفظ لکھنے کی درخواست کر ڈالی۔ مولانا کچھ دیر سوچتے رہے اور میں سہمی بیٹھی رہی کہ انکار نہ کر دیں۔ الٹ پلٹ کر مسودہ کو دیکھا اپنی بے حد مصروفیت کا ذکر کیا اور کہا "چھوڑ جاؤ ـــــ دیکھوں گا اگر کبھی فرصت ملی"۔ عرض کیا جلدی نہیں جب آپ کو فرصت ہو اسے پڑھ کر چند سطریں تحریر فرما دیں۔

کئی مہینے بعد اجمل خاں صاحب سے پوچھا۔ انھوں نے کہا ابھی فرصت نہیں ملی۔ پھر کچھ دن بعد خود گئی۔ مولانا نے مجھے دیکھا تو حاضری کا مقصد سمجھ گئے۔ باتیں کرتے کرتے ایک دم اٹھ کر اندر چلے گئے اور کچھ دیر بعد میری کتاب کا مسودہ اور ایک صفحہ کا پیش لفظ لا کر میرے حوالے کیا۔ یہی نہیں بلکہ دس بارہ صفحے خود حالی پر لکھ کر کتاب میں شامل کرنے کو دیے جس میں انھوں نے اپنے مخصوص دل کش انداز میں مولانا حالی کی سیرت کی کچھ جھلکیاں دکھائی ہیں۔ ان جیسی مصروف اور بڑی شخصیت کا مجھ جیسی ادب کی معمولی خادم کی فرمائش اس طرح پوری کرنا علاوہ ان کے کرم و عنایت کے اس کا ثبوت ہے کہ خود مولانا حالی سے انھیں بڑی عقیدت تھی۔

سنہ ۵ء میں میں ایک بار سخت پریشانی کے عالم میں مولانا کے پاس گئی۔ ایک ایسا مسئلہ تھا جو میرے خیال میں مولانا ہی حل کر سکتے تھے میں یہ بھی جانتی تھی کہ اس سے خود انھیں بھی دلچسپی ہے۔ میری بات سن کر اور حالات معلوم کر کے خود مولانا پریشان ہو گئے دیر تک کمر پہ ہاتھ رکھ کر کسی سوچ میں ٹہلتے رہے..... "بے شک۔ بے شک یہ کام ضرور ہونا چاہیئے۔ بہر حال۔ دیکھو پیش نظر رہے گا" ـــــ مجھ سے تو اتنا ہی کہا مگر ایک یا ڈیڑھ ہفتے کے اندر اندر وہ کام جو برسوں سے ٹل رہا تھا، مولانا نے کرا دیا۔

مولانا میرے بڑے بھائی خواجہ غلام السیدین سے بہت محبت کرتے تھے اور وہ خود ان کے

بے حد عقیدت مند تھے۔ سال میں ایک بار مولانا میرے دونوں بھائیوں، ان کے بال بچوں اور مجھے اور عابد صاحب کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا کرتے تھے۔ اس دعوت میں ہم لوگوں کے علاوہ صرف اجمل خاں کے اور مسز اروناآصف علی اور ہوا کرتی تھی۔ اس وقت مولانا نسبتاً زیادہ شگفتہ، زیادہ بے تکلف اور خوش مزاج ہوتے۔ ویسے وہ سچ مچ متانت، سنجیدگی اور وقار کی ایک مکمل تصویر تھے۔ مگر گفتگو میں ظرافت کی چاشنی ہوتی تھی اور چھوٹوں سے کچھ اس انداز سے بات کرتے تھے کہ رعب و خوف دل سے دور ہو جاتا تھا۔ دعوت میں کھانے کے بعد مولانا کے ہاتھ کی بنی، ان کی مخصوص بے دودھ و شکر کی پھیکی بے رنگ چائے پینے کی سعادت بھی حاصل ہوتی اور سوائے سید بن صاحب کے ہم میں سے کسی کی جرأت نہ ہوتی کہ اس سے انکار کر دے۔

مولانا آزاد عورتوں کا بڑا احترام کرتے تھے اور عورت کے حقوق، برابری اور مساوات کے دل سے قائل تھے۔ قرآن شریف میں اسلام نے عورت کو جو حقوق دئے ہیں ان پر انھوں نے بڑی مفصل بحث کی ہے۔ مولانا کی نظر میں، اسلام کی رُو سے عورت کا کیا مقام، درجہ، کیا حقوق و فرائض ہیں، اس پر ایک مفصل مضمون میں نے لکھا ہے۔ اس معاملے میں نہ نئے زمانے کے مغربی تعلیم یافتہ حضرات میں اور نہ پرانے قسم کے عالموں میں، میں نے ان سے زیادہ صاف دماغ اور وسیع النظر آدمی نہیں پایا۔

یکم جنوری ۵۸ء کو ہم لوگ مولانا کے پاس سالِ نو کی مبارک باد کے لئے گئے تو مجھے مولانا بہت کمزور، زرد اور تھکے ہوئے نظر آئے۔ فروری میں انجمن ترقی اردو کی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے میں علی گڑھ سے آئی۔ مولانا ڈائس پر کھڑے تقریر فرما رہے تھے، میں قریب ہی بیٹھی تھی اور جانے کیوں بار بار یہ وہم میرے دل میں پیدا ہوتا کہ اگر مولانا تقریر کرتے کرتے گر پڑے تو؟ اور میں اپنے کو ملامت کرتی کہ یہ کیسے خیالات میرے دل میں آ رہے ہیں....

مگر آہ — ایک ہی ہفتے بعد ریڈیو سے مولانا کی ابدی جدائی کی روح فرسا خبر سننے کے بعد غم سے بدحواس تیز رفتار کار میں علی گڑھ سے دلی کی طرف چلی جا رہی تھی کہ آخری بار اپنے مولانا کے مقدس چہرے

کی زیارت کر لوں ـــــ ہزاروں آدمیوں کے مجمع کو چیرتی اندھا دھند میں ۴ کنگ ایڈورڈ روڈ کے اندر داخل ہونے کی جدوجہد کر رہی تھی تو کتنے لوگوں کے بحن میں ہندو، مسلمان، سکھ سبھی لوگ شامل تھے جملے میرے کان میں پڑ رہے تھے :" ارے آزاد ۔ آزاد تو بے تاج کا بادشاہ تھا "آج ہمارا آخری سہارا چھن گیا " کسی نے کہا " مولانا آزاد سے بڑا مدبر ہم نے نہیں دیکھا " کئی سفارت خانوں کے لوگ سرخ آنکھیں کئے اندر جانے کے لئے میری ہی طرح کوشش کر رہے تھے ..... اس کم آمیز، خاموش، خلوت پسند شخصیت کی ہر دل عزیزی کا نظارہ لاکھوں ماتم داروں کے ہجوم سے لگایا جاسکتا تھا جو اپنے محبوب لیڈر کی آخری جھلک دیکھنے کے لئے بے قرار تھے ..... جانے کس طرح میں اس برآمدے تک پہنچی جہاں مخصوص ماتم دار خصوصاً عورتیں جمع تھیں کسی نے میرا بازو پکڑ کر اس اونچے برآمدے پر کھینچ لیا، کسی اور نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وسطی برآمدے میں پہنچا دیا جہاں مولانا اپنے گہوارے میں سکون کی ابدی نیند سو رہے تھے ۔ ان کا نورانی چہرہ کھلا تھا اور سارا جسم پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا ـــــ

ہندوستان کے لاکھوں آدمی دیس کے ایک جانباز سپاہی، ایک بڑے رہنما، حکومت کے دستِ راست، ایک جید مذہبی عالم، ایک مدبر و سیاست داں، ایک بے مثال ادیب، بے نظیر مفسر محی الدین احمد ابوالکلام آزاد کو خراجِ عقیدت ادا کرنے جوق جوق چلے آ رہے تھے ۔ اور میں ـــــ میں آنسوؤں کے آبشار کے درمیان ایک ٹک اپنے مولانا کو دیکھ رہی تھی ۔ اس شفقت و محبت بھرے چہرے کو جس کو دیکھ کر ہر بار دل میں امید، ایمان، روشنی اور یقین کی نئی شمعیں روشن ہو جاتی تھیں ۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

خطبۂ افتتاحیہ

پروفیسر رشید احمد صدیقی

جناب صدر، شرفائے ادب، خواتین و حضرات

آپ نے طلب فرمایا، میں حاضر ہوگیا۔ عذر و معذرت میں شاعرانہ کسر نفسی تک کے آداب ملحوظ رکھے۔ اب وسوسہ ہو رہا ہے کہیں ہم دونوں نے غلطی تو نہیں کی عجلت میں، ایجاب و قبول، اکثر مہنگا پڑتا ہے۔ بہرحال اب تو اس افتاد کو خوش و ناخوش انگیز کرنا ہی پڑے گا۔ شریفوں میں یہی دستور چلا آرہا ہے۔ عام طور پر ایسی تقریبوں میں، جن سے ہم آپ آج گذر رہے ہیں، ایک طرف مہمان اپنی نا اہلی و معذوری اور دوسری طرف میزبان کے لطف و کرم کا اعتراف کرتا ہے بیقین مانئے زبان حال سے میں بھی کر رہا ہوں لیکن اس وقت میرا حال اس حبشی طالب علم کا سا ہو رہا ہے جس کا پرتپاک خیر مقدم انگلستان کی ایک مشہور دانش گاہ کی انجمن اتحاد میں کیا گیا تو اس نے شکریے کی جوابی تقریر میں کہا "صاحبو، آپ کے احسان و عنایت سے میرا عجیب عالم ہے۔

I am blushing all over; only you cant see it

میرا بھی یہی حال ہے۔ اس لئے آپ مجھے بھی اس حبشی کی مانند سمجھیں، صرف اتنے سے فرق کے ساتھ کہ مجھے ہندوستان کا حبشی سمجھئے، جنوبی افریقہ کا نہیں! یہ اس لئے کہنا پڑا کہ آج کل دنیا کی غیر صالح گزرگاہ میں "ایں ہم بچہ شتر است" کا ٹھپا بہت جلد لگا دیا جاتا ہے۔ کہیں میں نہ اس زد میں آجاؤں۔

صاحبو، جس منصب پر اور جس تقریب میں اس وقت آپ مجھے دیکھ رہے ہیں وہ صرف آپ کے حکم کی تعمیل میں ہے ورنہ غالب کی زبان میں جام و سبو کب کا توڑ چکا تھا، آسمان سے بادۂ گلفام گو برستا تو خاطر میں نہ لاتا لیکن کیا کیجئے، آسمان سے "بادۂ گلفام" برسے یا نہ برسے، برق بے اماں گرا کرتی ہے۔ "روسیاہ" ہونے نہ ہونے کے علی الرغم روئے سخن مشاعرہ کمیٹی کے کرتا دھرتا، آپ سے ... مرے کرم، گوپی ناتھ امن کی طرف ہے۔ موصوف خود تو امن سے رہتے ہیں لیکن دوسرے کے

بے مثال ہیں۔ اس پر ستم یہ ہے کہ تعلقات عامہ کو خوشگوار اور استوار رکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔
بہرحال، ستم ہو یا کرم "می بَرَد ہر جا کہ خاطر خواہِ اُوست"

حضرات، یہ جانتا ہوں کہ اس عظیم الشان مشاعرہ میں شعرائے کرام کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے آپ نے زحمت اٹھائی اور جلسے کو رونق بخشی ہے۔ ایسے میں میرا حائل ہو جانا کوئی قابلِ فخر بات نہیں لیکن امید کرتا ہوں کہ جس طرح آپ ان دنوں ٹھنڈ اور مہنگائی برداشت کر رہے ہیں مجھے بھی انگیز کرنے کی کوشش کریں گے۔ شکر نہیں تو صبر سے کام لیجئے۔ تفریح میں تکلیف بھی کبھی کبھی مزا دے جاتی ہے۔ پھر بھی آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جو فرض مجھے سونپا گیا ہے اس کی جلد سے جلد خانہ پری کر کے، اربابِ شعر و سخن کے لئے جگہ خالی کر دوں گا لیکن ایسا کرنے میں کچھ دیر ہو جائے تو آپ آزردہ نہ ہوں، یہ فائدہ بھی کچھ کم نہیں کہ آپ کو ایسے شخص سے ایسا کلام سننے کی مشق ہو جائے گی جو پسندِ خاطر نہ ہو! یہ مشق آسان نہیں۔ آتے آتے آتی ہے لیکن جب آ جاتی ہے تو جمہور اور جمہوریت کے درمیان جو تفاوت ہے (اور کبھی کبھی یہ بہت زیادہ ہوتا ہے)، وہ رفتہ رفتہ کم ہونے لگتا ہے اور دلسوزی اور دانش مندی، احتیاط و انتظار سے کام لیا جائے تو بالآخر دور ہو جاتا ہے اس لئے یہ مشق ہر قیمت پر ارزاں ہے۔

صاحبو، یہ جشنِ جمہوریہ کا سالانہ اردو مشاعرہ ہے، احباب جمع ہیں التفاتِ دل دوستاں میسر ہے "دردِ دل" نہ کہہ سکوں یا مناسب پیرائے میں نہ کہہ سکوں اور جمہور و جمہوریت کے متشابہ کا شکار ہو جاؤں تو قابلِ عفو ہوں۔ ذاتی طور پر جو بات صحیح اور مناسب سمجھتا ہوں اسے کہہ ضرور دیتا ہوں یہ نہیں دیکھتا کہ اس کا اثر ہوا یا نہیں۔ البتہ اس کا اطمینان کر لیتا ہوں کہ پولیس یا پریس کی زد پر تو نہیں ہوں! تو کہنا یہ ہے کہ ہم جتنے "جمہور" ہیں، ہم میں ابھی اتنی "جمہوریت" نہیں آئی ہے! حکومت یقیناً جمہور کی یا جمہوریہ ہے جس کے لئے ہم آپ قابلِ تہنیت ہیں لیکن حکومت کے ساتھ جمہور کا بھی "جمہوریت نہاد" ہونا ازبس ضروری ہے، تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، آج کی اس مبارک تقریب میں اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے جمہور میں جمہوریت کا تصور کیا اور کتنا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اجتماع اتنا مشاعرہ نہیں ہے جتنا آزمائش!

صاحبو، اگر آپ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں تو امید ہے آج شب وہ آداب ملحوظ رکھے جائیں گے جو ایسی تقریبوں میں قلعۂ معلی اور "حضرت دہلی" میں بھی رکھے جاتے تھے جس کی بازیافت کے لئے ہم ہر سال اس موقع پر اکٹھا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، کبھی یہ مشاعرے مخصوص حلقوں میں مخصوص آداب کے ساتھ منعقد ہوتے تھے۔ شعراء اور سامعین بھی منتخب ہوتے تھے۔ مشاعرے ایک طرح کی آموزگاہیں ہوتی تھیں جہاں ہم حفظِ مراتب سیکھتے اور برتتے تھے ان سے ہمارے ملی و تہذیبی وقعت و وقار میں قیمتی اضافہ ہوا۔ استادی شاگردی کے رشتے قائم ہوتے جو تمام عمر اور نسلاً بعد نسلٍ شرف و سعادت کا سرچشمہ بنے رہتے!

لیکن دوستو اور بزرگو "زمانہ دگر گونہ آئین نہاد"۔ اب سلطانیٔ جمہور کا زمانہ ہے اس لئے مشاعرے بھی اسی انداز کے ہونے لگے۔ لیکن بات تو پھر وہیں پہنچ گئی جہاں سے شروع ہوئی تھی یعنی مشاعرہ میں جمہوریت کی فضا بھی قائم رکھنا پڑے گی۔ بات صاف صاف ہی کیوں نہ کہی جائے کہ آپ کو ہر شاعر کا ہر طرح کا کلام تحمل سے سننا پڑے گا، چاہے وہ شاعر یا اس کا کلام آپ کو پسند آئے یا نہ آئے۔ دوسری طرف شعرائے عالی مقام سے عرض کروں گا کہ وہ "بازار مصر" میں آئے ہیں تو اس کے لئے بھی تیار رہیں کہ کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے گا چلن ہیں"۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ نے کلام کی تصنیف پر تو ریاض نہ کیا ہو اور حاضرین سے تحسین نہ پانے پر آزردہ بھی ہوں۔ کھلے بازار میں متاعِ کاسد کو فروغ نہیں ہوتا۔ شعر و ادب میں نہ Fair Price Shops ہوتی ہیں نہ بلیک مارکیٹ!

حضرات، اب ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں جو ذرا تلخ ہے۔ اس پر شکر بھی نہیں چڑھا سکتا، اس لئے کہ سنتا ہوں اس نواح میں ان دنوں شکر رنجی تک کے لئے شکر مشکل سے ملتی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ اتنا شاندار مشاعرہ جیسا کہ چند برسوں سے اسی لال قلعہ میں منعقد ہوتا ہے کسی اور جگہ نہ ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اس وقت میرے تصور میں ماضی کے وہ تمام تاریخی، علمی، تہذیبی اور سماجی مناظر ابھر رہے ہیں جن سے یقیناً آپ بھی نا آشنا نہیں ہیں، کتنے حسین و حزیں مناظر! ان کا تقاضا ہے کہ اس تقریب کے شایانِ شان ہمارے شعراء اپنی بہترین اور تازہ ترین تخلیق شعری جن پر پورا سال اور بہترین توجہ صرف کی گئی ہو، پیش کیا کریں۔ آپ یقیناً مجھ سے زیادہ اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں

کہ ایسے کلام سے اردو شاعری کس درجہ وقیع ہوجائے گی۔ اور شعر و ادب پر ان شعرا کا کتنا بڑا احسان ہوگا۔ دوسری طرف یہ مجھ میں نہیں آتا کہ ایسے معرکے اور آزمائش کی تقریب میں کوئی شاعر اپنا پرانا یا معمولی کلام سنانے کی جرأت کیونکر کرتا ہے اور سامعین سننا کیسے گوارا کرتے ہیں۔ کیسے مان لوں اور خاموش رہوں کہ شاعر ہوتے ہوئے وہ ایسا کرسکتا ہے۔ شاعر تو ملک اور قوم کی حمیت و آبرو ہوتا ہے۔ آخر وہ موقع کب آئے گا جب وہ اپنی بہترین شخصی و شعوری صلاحیتوں کو بر سر کار لائے گا۔ تکلف برطرف اگر اسے اس کا احساس نہیں ہے تو اس کی جگہ اس محفل میں نہیں!

صاحبو، مجھے شاعر کی صحیح یا غلط شہرت سے شاعری کی منزلت زیادہ عزیز ہے۔ کوئی شاعر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، شاعری اور سامعین کے ساتھ بے تکلفی برتنے کا حق نہیں رکھتا۔ بالخصوص ایسے مشاعرے میں جیسا کہ آج منعقد ہے اور ہر سال ہوتا رہتا ہے۔ یہ اتنا مشاعرہ نہیں ہے جتنا معرکہ ہے۔ اگر شعرا نے اس موقع پر جی چرایا یا سہل انگاری سے کام لیا تو میرے نزدیک انھوں نے ہمارے اور ہمارے شعر و ادب کے ساتھ غداری کی جس کو نہ ہم کبھی معاف کرسکتے ہیں، نہ آنے والی نسلیں! میری اس بے باکی کو معاف کردیجیے، غلط آدمی کو ایسے موقع پر انتخاب کرنے سے اسی طرح کی باتیں سننی پڑتی ہیں!

اب ایک بات جناب صدر سے بھی کہنی ہے وہ یہ کہ ان کے فرائض میں ایک نا قابلِ رشک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ شاعر کو سامعین کی اور سامعین کو شاعر کی بے تکلفی سے بچاتے رہیں۔ دونوں کو ایک لطیفہ بھی سنانا چاہتا ہوں! ایک مشہور لیکن کسی وقت غیر متمدن ملک میں ایک قاعدہ سا بن گیا تھا کہ وہاں کوئی گانے والا ہنر دکھانے اور روزی کمانے کے لئے آئے تو سامعین بڑے شوق سے اس کا گانا سننے آتے لیکن گانا پسند نہ آتا یا اکتا جاتے تو بے تکلف اسے گولی مار دیتے! بالآخر تقریب کے مہتمم کو جلی حرفوں میں یہ کتبہ ڈائس پر لگانا پڑا، جس کے پہلو میں کھڑا ہوکر گانے والا "عرضِ ہنر" کرتا! Gentlemen, Don't Shoot the Singer, He is trying his best, کتبہ تو اس وقت فراہم نہیں ہوسکتا۔ امید ہے کہ اس گذارش کا سامعین لحاظ ضرور فرمائیں گے۔

صاحبو، کچھ ایسا محسوس کرنے لگا ہوں کہ آپ اب تک مجھ سے اکتائے نہیں۔ اس لئے اپنے اور آپ دونوں کے بارے میں کچھ شبہے میں پڑ گیا۔ بہرحال جب آپ کا عفو و کرم اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ مزید مجھے بے تکلف ہونے کی جرأت ہو رہی ہے، کسی اور سے اتنی نہیں جتنی بانیان مشاعرہ سے وہ یہ کہ یہ مشاعرہ ہمارے ملک میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس لئے اس سے ہم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ تجویز یہ ہے کہ ہر سال کے مشاعرے کی سرگزشت نہایت معروضی طریقہ پر شرح و بسط سے، کسی مستند اہل قلم سے مرتب کرائی جایا کرے، مثلاً کون کون سے شاعر کہاں کہاں سے آکر شریک ہوئے۔ ان کا فوٹو، ان کی زندگی کی مختصر روداد، کلام کا نمونہ، اس پر تبصرہ، سامعین پر کلام کا ردعمل، اس کے علاوہ مقتدر ادبی شخصیتوں کا جو شریک بزم ہوئے، ان کے اسماء گرامی اور مناسب تعارف، محفل مشاعرہ کی ترتیب و تزئین، دوستانہ و منصفانہ طور پر، دلچسپ اور ادبی رنگ میں مرتب اور محفوظ کر لئے جایا کریں اس پر یقیناً دو چار ہزار روپے صرف ہوں گے جس کا فراہم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا لیکن اس کے مقابلے میں اس نفع کا اندازہ کیجیئے جو امتداد زمانہ سے اردو شعر و ادب کی سمت رفتار کے سمجھنے میں حاصل ہوگا۔ اردو کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اردو کے قدیم ناقص اور نامکمل تذکرے بھی آج کتنے کمیاب لیکن مفید ہیں، اس لئے اس مشاعرہ کی مکمل یادداشت آئندہ ہمارے لئے بڑا قیمتی سرمایہ ثابت ہوگی۔ اس پروگرام پر مناسب رد و بدل کے ساتھ ضرور عمل کیا جائے۔ اس طرح کی دستاویزوں سے قوم، ملک اور شعر و ادب کی ساکھ قائم ہوتی ہے۔

آخر میں اس دعا کے ساتھ سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں کہ آئندہ میری وجہ سے آپ اُس آزمائش میں نہ مبتلا ہوں جس میں آج شب ہونا پڑا۔

اس اعتذار و اعتراف کے بعد، نہایت خوشی اور فخر سے آپ کے حکم کی تعمیل میں، اس مشاعرے کے افتتاح کا اعلان کرتا ہوں، خدا ہماری مدد فرمائے۔ آمین!

"بتقریب جشن جمہوریہ ۱۹۶۴ء"

نیازمند
رشید احمد صدیقی

"داراشکوہ"

ڈاکٹر محمد یٰسین ۔ اُستاد جموں اور کشمیر یونیورسٹی

تاریخ ہند میں بہت سے المناک ابواب ہیں۔ خلجی شہنشاہیت کی جگہ تغلق رجعت پسندی کا دور دورہ ہندوستانی سیکولرزم کا بہت بڑا المیہ ہے۔ وہ منظر بڑا ہی اندوہناک تھا۔ جب شہزادہ خسرو کو اپنے باپ جہانگیر کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اگر خسرو تخت نشین ہوتا تو اکبری عہد کی روایات کو یقیناً بڑھاوا ملتا۔ لیکن ہندوستانی تاریخ کا سانحہ عظیم اس وقت رونما ہوا جب شہزادہ داراشکوہ تخت نشینی کی جنگ میں اورنگ زیب عالمگیر سے مات کھا گیا۔

یہ بھی ایک تاریخی تضاد ہے کہ داراشکوہ نے شہنشاہیت کے گہوارہ میں آنکھ کھولی۔ وہ اپنی زندگی اور مقصد میں زیادہ کامیاب رہتا اگر اس نے ایک جھونپڑے میں جنم لیا ہوتا کیونکہ ذوق، مزاج اور کردار کے اعتبار سے وہ شاہانہ تزک و احتشام اور سیاسی حکمت عملیوں کے بمقابلہ فقر و فاقہ، عزلت نشینی اور بے نیازی کی زندگی کے لئے زیادہ موزوں تھا۔

شاہ جہاں کی رائے داراشکوہ کے بارے میں بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ داراشکوہ اپنی خوبیوں کے باوجود اچھے انسانوں کا دشمن اور بُرے لوگوں کا دوست ہے۔ واقعات اس رائے پر دلالت کرتے ہیں۔ داراشکوہ نے وقت کے عظیم ترین مدبر اور شاہجہانی سلطنت کے ستون علامی سعد اللہ خاں سے خواہ مخواہ جھگڑا مول لے لیا۔ ایک مرتبہ شہزادہ نے شاہ جہاں سے پہاڑ سنگھ بندیلہ کی جان بخشی کی سفارش کی لیکن بندیلہ سردار تخت نشینی کی جنگ میں اورنگ زیب کے ہمرکاب تھا۔ ملک جیون، جسے ہاتھی کے پیر تلے روند ڈالنے کے احکام صادر ہوئے تھے، داراشکوہ کی کوششوں سے موت کے پنجے سے بچ سکا لیکن جب اورنگ زیب کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد دارا سر چھپانے کی جگہ

کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا اس نے ملک جیون کے یہاں پناہ لی اور ملک جیون نے شکرگزاری کا حق دارا کو اورنگ زیب کے حوالہ کرکے ادا کیا۔

دارا شکوہ اور اورنگ زیب دو مکتبۂ خیال کی نمائندگی کرتے ہیں اورنگ زیب آرتھوڈوکس اسلام کا ہیرو تھا اور دارا شکوہ اسلامی روحانیت کا علم بردار۔ اورنگ زیب شریعت سے مکمل وابستگی کا حامی تھا اور اس سے ذرا بھی انحراف کو گناہ عظیم تصور کرتا تھا لیکن دارا طریقت کا دلدادہ تھا۔ وحدت الوجود اس کا مسلک تھا۔ اورنگ زیب کی تمنا تھی کہ سارا ہندوستان اسلام کا حلقہ بگوش ہو جائے لیکن دارا ہندو دھرم اور اسلام کے ملاپ کا خواہاں تھا۔

غیر ملکی سیاحوں کی رائے دارا شکوہ کے بارے میں دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ منوچی جو شہزادہ کا دوست تھا اس کی خوبیوں کو سراہنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ دارا احساس برتری کا شکار تھا اور دوسروں کے مشوروں کو سننے کی تاب اس میں نہ تھی۔ برنیئر بھی دارا پر "بد دماغ" ہونے کا الزام رکھتا ہے۔ اورنگ زیب نے دارا شکوہ کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ اسے سیاست میں سازش اور مذہب میں ڈھونگ رچانے والا سمجھتا تھا۔ یہ غالباً غلط نہیں ہے کہ دارا کو اپنے بارے میں تھوڑی بہت خوش فہمی ضرور تھی اور تنک مزاج واقع ہوا تھا لیکن دارا کی گھن گرج سے اورنگ زیب کی ہلکی سی مسکراہٹ زیادہ خوفناک تھی۔

دارا شکوہ کے مذہب کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ برنیئر کا قول ہے کہ دارا مسلمان پیدا ہوا اور زندگی بھر راسخ الایمان رہا لیکن وہ مسیحیوں کے ساتھ مسیحی اور یہودیوں کے ساتھ یہودی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ دارا مسلمان تھا لیکن وہ اس نظریہ کا پیرو تھا جس کی داغ بیل اکبر اعظم نے ڈالی تھی۔ وہ آزاد منش اور صوفیانہ رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ اسے دہریہ اور لامذہب خیال کرتے ہیں جو کہ بالکل غلط ہے۔ دارا کے خلاف الحاد اور بے دینی کا فتویٰ جو اس کی وفات کے بعد جاری کیا گیا تھا اس کی وقعت اس فتوی سے زیادہ نہیں ہے جو عالمگیر کے خلاف شہزادہ اکبر کی بغاوت کے دوران دیا گیا تھا۔

دارا شکوہ کے علمی اور ادبی کارنامے اظہر من الشمس ہیں۔ دارا خاندان تیموریہ کا سب سے زیادہ مہذب

لکھا پڑھا لکھا شہزادہ تھا۔ اس نے مذاہبِ عالم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا تاکہ وہ ازلی اور ابدی حقیقت کا سراغ پا سکے۔ اس نے بہت سے رسائل لکھے اور رسالہ حق نما تصوف پر اس کی گرانقدر تصنیف ہے۔

دارا کو صوفیاء اور درویشوں کی صحبت سے انس تھا۔ میاں میر اور سرمد کا نام اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔ وہ قادریہ سلسلہ کا پیرو تھا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دارا اپنی زندگی اور اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے وہ یقیناً ناکام رہا۔ لیکن دارا شہزادہ سے زیادہ فلسفی تھا اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا شائق۔ سترھویں صدی عیسوی میں مذہبی تضاد اور اختلافات کے دھاروں کو ملانے کی جو کوشش دارا شکوہ نے کی وہ لائق تحسین و ستائش ہے اور ہندوستانی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

دارا شکوہ ابدی نیند سو رہا ہے لیکن اس کا پیغام اب بھی زندہ ہے اور ہندوستان کی حقیقی منزل کی نشان دہی کر رہا ہے ــــ وہ پیغام جسے نانک اور کبیر نے سنایا، جسے اکبر اعظم نے حقیقت کا جامہ پہنایا اور جس کے لئے مہاتما گاندھی نے اپنی جان عزیز قربان کی۔ ہندوستان کے درخشاں مستقبل کی تعمیر کا کام وہیں سے شروع کیا جانا چاہیئے جہاں دارا شکوہ کے خون کا آخری قطرہ گرا تھا۔

اعلیٰ شاعری میں ڈرامائی عنصر کی اہمیت

جناب انور علی خاں سوز

شیکسپیئر۔ سوفوکلیز اور کالیداس تین ایسے نام ہیں جن کی طرف اعلیٰ شاعری کا نام لیتے ہی ہر پڑھے لکھے آدمی کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ تینوں اصلاً ڈرامہ نگار اور صرف ضمناً شاعر تھے۔ کیا اس کا مطلب یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم ان فنکاروں کی صحیح حیثیت سے بے خبر ہیں میرا خیال یہ ہے کہ ایسا نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اعلیٰ شاعر کی حیثیت سے ان کا نام لینے والے صرف معمولی پڑھے لکھے لوگ ہی نہیں بلکہ اونچے درجے کے نقادانِ فن بھی ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کوئی اختلافی مسئلہ نہیں بلکہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔

تو پھر کیا ہم یہ سمجھیں کہ یہ لوگ ایک ہی وقت میں اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے اور اونچے درجہ کے ڈرامہ نگار بھی؟ جی ہاں۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ ہر اعلیٰ درجہ کا ڈرامہ نگار لازماً اعلیٰ درجہ کا شاعر بھی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس دعوی کو تسلیم کرنا محض لوگوں کو اس لئے دشوار معلوم ہو کہ آج کل منظوم ڈراموں کا رواج تقریباً ختم ہوتا جا رہا ہے انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے عظیم ترین ڈرامہ نگار ہنرک آبسن اور برنارڈ شاہ جن کی عظمت علی الاعلان طور پر مسلّم ہو چکی ہے۔ نثر ہی میں ڈرامہ نگاری کرتے تھے۔ لیکن میں عرض کروں گا کہ ان کے مشہور ڈراموں کی حیثیت وہی ہے جو آج شعر کی ہے۔ ابسن اور برنارڈ شاہ نے شعر کی ہیئت کو ضرور ترک کر دیا تھا مگر روحِ شعر ان کے ہر ہر مکالمے میں جلوہ گر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ڈرامے کا دل چیر کر دیکھا جائے تو اس میں سے وہی خون نکلے گا جو شعر کی رگ و پے میں گردش کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعر اور ڈرامہ کو دو ایسی بہنوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو کتنی ہی لڑیں جھگڑیں مگر زیادہ دیر تک ایک دوسری سے الگ نہیں رہ سکتیں عصرِ حاضر کے عظیم ترین

انگریزی شاعر ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی منظوم ڈرامہ کے احیاء وتجدید کی کوششیں اس کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔

ڈرامہ اور شعر کی اس وحدت الوجود کو تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ صرف یہی نہیں ہے کہ ہر بڑا ڈرامہ نگار لازماً بڑا شاعر بھی ہوتا ہے۔بلکہ اسی سے یہ بات بھی نکل آتی ہے کہ ہر بڑے شاعر کے لئے کسی نہ کسی حیثیت سے بڑا ڈرامہ نگار ہونا بھی ضروری ہے۔مجھے اندیشہ ہے کہ یہ دوسرا دعویٰ بہت سے لوگوں کو بدیع النظر میں ناقابل قبول معلوم ہوگا۔اور فوراً ایک طویل فہرست ان عظیم شاعروں کی پیش کر دی جائے گی جنہیں کسی طرح بھی ڈرامہ نگار نہیں کہا جا سکتا۔مگر میں عرض کروں گا کہ ٹھہریئے جس طرح ڈرامہ میں روح شعر کی جلوہ گری کے لئے ہیئتِ شعر کا التزام ضروری نہیں ہے اسی طرح فن شعر میں روحِ تمثیل کا رقصِ دوام بھی ہیئتِ تمثیل کا محتاج نہیں۔"انا الحق" کہنے والے منصور یا "اہم برہم" کہنے والے شنکر اچاریہ کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ وہ باعتبارِ ہیئت عین خدا ہیں وجود کی وحدت سے مراد روح کی وحدت تھی نہ کہ اجسام و اشکال کی وحدت۔

مگر مشکل یہ ہے کہ جب ہم "روحِ شعر" کا ذکر کرتے ہیں تو فوراً ہمارے ذہن میں اس کا ایک مبہم سا تصور آجاتا ہے۔مگر "روحِ تمثیل" کی اصطلاح بظاہر عجیب اور غیر مانوس سی لگتی ہے۔آیئے اس روح کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کریں۔اس روح تک پہنچنے میں مذکورہ بالا تینوں اساطینِ تمثیل ــــ سوفوکلیز۔کالیداس۔اور شیکسپیئر ــــ جو ائمہ شعر بھی ہیں ہماری سب سے زیادہ مدد کر سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تینوں فن کار اپنے اپنے مخصوص دور یعنی یونانِ قدیم۔ہندوستانِ قدیم۔اور ملکہ الزبتھ (اول) کے زمانے کے انگلستان سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔ان کے ڈراموں میں ان کے مخصوص عہد اور ماحول کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔وہ اپنے ذاتی عقائد اور افکار کو بھی بالکل ان ڈراموں سے الگ نہیں رکھ سکے۔مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جس بے پناہ معروضیت کے ساتھ انھوں نے کردار نگاری کی کوشش کی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے انھوں نے چھوٹے پیمانے پر خود خالق کائنات کے عمل کو دہرایا ہے جس طرح

ہم سب ایک شعورِ واحد کی مخلوق ہونے کے باوجود اس درجہ انفرادیت اور آزادی سے نوازے گئے ہیں کہ کبھی کبھی خود خالق کا وجود مشتبہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح ان عظیم فنکاروں کے تخلیق کردہ کردار انفرادیت اور آزادی سے اس درجہ بہرہ ور ہیں کہ شاید ہی کہیں فنکار کی ذات یا اس کے مخصوص رجحانات کی غمازی کرتے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ کسی کردار میں جان ڈالنے کے لئے بیٹھتے ہیں تو اپنی ذات کو فنا کر کے خود ہی اپنی مخلوق کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ان کے اندر اپنی ہر مخلوق سے ـــــ خواہ وہ نیکوکار ہو یا بدکار ـــــ نہ صرف محبت پائی جاتی ہے بلکہ جب وہ اس کے جذبات کی عکاسی کرنے بیٹھتے ہیں تو ہر کردار زبانِ حال سے پکار اٹھتا ہے کہ "واللہ اس سے بہتر اپنی ترجمانی میں خود بھی نہیں کرسکتا تھا"۔ غور کیجئے کیا شائیلاک اپنی ترجمانی شیکسپیئر سے بہتر کرسکتا تھا۔ کیا میکبتھ اپنی تصویر اپنے خالق سے بہتر بنا سکتا تھا۔ اور کیا اُتھیلو کا دشمنِ اعظم اور مکر و ریا کا مجسمہ ایاگو (Iago) یہ کہہ سکتا ہے کہ شیکسپیئر نے اُتھیلو کے ساتھ جانبداری اور اس کے ساتھ ناانصافی سے کام لیا ہے۔ اس مافوق الفطرت قسم کی الوہی غیر جانبداری ہی کا نتیجہ ہے کہ شیکسپیئر کے ہر اہم کردار کو سمجھنے میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ وہی شائیلاک جسے دو سو برس تک شرِ محض سمجھا جاتا رہا۔ یکایک انیسویں صدی میں مظلوم اور قابلِ رحم سمجھا جانے لگا۔ جس طرح حقیقی انسان میں شیطنت اور فرشتگی دونوں پہلو بہ پہلو موجود ہیں بلالحاظ اس کے کہ وہ ولی ہے یا ڈاکو۔ اسی طرح بڑے ڈرامہ نگاروں کے کردار بھی نہ شرِ محض ہوتے ہیں نہ خیرِ محض۔ جس طرح زندہ انسانوں کے بارے میں نہ صرف مختلف انسانوں کی رایوں میں فرق ہوتا ہے بلکہ ایک ہی آدمی کی رائے یا مجموعی رائے مختلف زمانوں میں مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح اعلیٰ تمثیلی کرداروں کے متعلق نقادانِ فن کی رائیں ان کی شخصیت کے نئے نئے گوشوں کے بے نقاب ہونے کی وجہ سے کم و بیش بدلتی رہتی ہیں۔

اسی کے ساتھ اعلیٰ کردار نگاری کا ایک دوسرا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ہر اعلیٰ تمثیلی کردار نہ صرف ایک مکمل انفرادیت اور تشخص کا حامل ہوتا ہے بلکہ ہزار در ہزار دوسری منفرد شخصیتوں

کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جب "شکنتلا" یا "انتی گنی" یا "شاہ لیئر" پڑھنے بیٹھتے ہیں تو ہم نہ صرف ایک گزرے ہوئے عہد کے گزرے ہوئے انسانوں کو اپنے سامنے چلتا پھرتا دیکھتے ہیں بلکہ اکثر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم خود بھی ان میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔ کسی نہ کسی کردار کی آواز ضرور ہمیں اپنی ہی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی ان فنکاروں کا شعور خالقِ کائنات کے شعورِ اعلیٰ کی تقلید میں زمان و مکان کی حدود سے باہر نکل گیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس پوری بحث کو اگر ہم دو لفظوں میں سمیٹنا چاہیں تو معروضیت اور آفاقیت سے بہتر الفاظ نہ مل سکیں گے۔ اور یہی میرے نزدیک اعلیٰ ڈرامہ نگاری کی روح ہیں۔ صرف اتنا اور عرض کر دوں کہ آفاقیت سے میری مراد محض مکانی ہی نہیں بلکہ زمانی آفاقیت بھی ہے۔

کیا روحِ تمثیل کے اس تجزیہ کے بعد بھی اس میں کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ اعلیٰ شاعری میں لازماً اعلیٰ تمثیل کی روح کارفرما ہوتی ہے۔

انگریزی ادب میں جن شعراء کے نام ہمیں سرفہرست نظر آتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے یہاں آپ کو یہی روحِ تمثیل کارفرما نظر آئے گی۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ چاسر (Chaucer) کا سب سے بڑا کارنامہ کنٹربری کی کہانیوں کے رنگارنگ کرداروں کی ایسی تخلیق ہے جسے دیکھ کر چودھویں صدی عیسوی کے انگلستان کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اور ہر کردار کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے چاسر اپنی ہستی کو فنا کر کے خود اپنی مخلوق کا دل و دماغ بن گیا ہے؟ کیا اسپنسر کی اہم ترین تخلیق "ملکہ پرستان" (Fairy Queen) کے کرداروں کے بارے میں بھی یہی کہنا درست نہ ہوگا؟ کیا ملٹن کو لافانی بنا دینے والی فردوس گم کردہ (Paradise Lost) میرے اس قول کی تصدیق نہیں کرتی؟ سچ بتلائیے اگر شیطان خود اپنے کردار کا نقشہ کھینچتا تو کیا وہ اس سے بہتر کوئی نمونہ ہمارے سامنے پیش کر سکتا تھا جو ملٹن نے اس کی طرف سے پیش کر دیا ہے۔ کیا ایوان الشیاطین (Pandemonium) میں شیطان نے جو تقریر کی تھی اس کی

جتنی اچھی اور ہمدردانہ رپورٹ ہمارے سامنے ملٹن نے پیش کی ہے اس سے بہتر رپورٹ خود شیطان یا اس کا کوئی بھی لفٹیننٹ پیش کر سکتا تھا۔ کیا ورڈزورتھ شیلی کیٹس اور بائرن کی کردار نگاریوں میں اسی روحِ تمثیل کی جھلکیاں نہیں دکھائی دیتیں؟ اور ان رومانی شعراء کی کردار نگاری سے میری مراد صرف وہ کردار نگاری نہیں ہے جو ان کے کامیاب یا ناکام ڈراموں میں ملتی ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ان کی وہ شاعری بھی جس میں ہئیت تمثیل نہیں پائی جاتی روحِ تمثیل ہی کے باعث عظیم ہے۔ ورڈزورتھ جب بچے کی ذہنی کیفیت بیان کرتا ہے تو کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ اگر واقعی ایک طفلِ شیر خوار اپنی ذہنی کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے تو شاید اس سے بہتر کچھ نہ کہہ سکتا۔ رہا عصرِ حاضر کا عظیم ترین انگریزی شاعر ٹی۔ ایس۔ الیٹ تو اس کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت یوں نہیں ہے کہ اس نے باقاعدہ منظوم ڈرامے لکھے ہیں اور شعوری طور پر ایک بار پھر شعر اور ڈرامہ کو ایک جان و یک قالب کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر الیٹ کے منظوم ڈرامے ہی نہیں اس کی غیر ڈرامائی شاعری بھی اس کی ڈرامائی عظمت کی گواہ ہے۔ مسٹر الفریڈ پروفروک کا نغمۂ عشق (The Love Song of Mr. Alfred Prufrock) صرف ایلیٹ کے دماغ کی اُپج نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آج کا ہر وہ عاشق جو اپنے دور سے بھی آگاہ ہو اور اپنی ذات سے بھی اس کو پڑھ کر بے اختیار چلا پڑے گا کہ ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

میں نے اس مصرع کو استعمال کرنے سے دانستہ اب تک احتراز کیا تھا۔ حالانکہ میں اس مضمون میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس مصرعہ کے ذریعہ غالب نے اسی کو مجھ سے بہت پہلے انتہائی سادہ و بلیغ انداز میں بیان کر دیا ہے۔ فی الواقع تقریر کی لذت "اسی میں ہے کہ سامع بے ساختہ "میں نے یہ جانا" کہنے پر مجبور ہو جائے اور غالب نے صرف اس کلیہ کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ حقیقت میں کہ اس کی پوری شاعری اس کی مصداق ہے۔ غالب کا ہر شعر

غالب کا ترجمان نہیں بلکہ چند اشعار کو چھوڑ کر باقی تمام اشعار کو آپ شکسپیئر کی تمثیلی خود کلامیوں (soliloquies) سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غالب نے بولنے والوں کے نام نہیں لکھے ہیں۔ کیونکہ اس نے جس ہئیت یعنی غزل کو ذریعہ اظہار بنایا تھا۔ اس میں ایسا کرنا ناجائز اور ناممکن تھا۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ غالب کے مطالعہ کے وقت ہمیں صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ عموماً اپنی نہیں بلکہ اپنے دوسرے لاتعداد ہم جنسوں کی ترجمانی کر رہا ہے اور ایسی آفاقی شان سے کر رہا ہے کہ بلاقید زمان و مکان کسی نہ کسی شعر پر ہر پڑھنے والے کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ "میں نے یہ جانا ....." میرے نزدیک یہی غالب کی عظمت کا بڑا راز ہے۔ اور چونکہ یہ صفت اس کے برابر اردو کے اور کسی شاعر میں نہیں پائی جاتی اسی لئے میں اسے اردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔

غالب کے بعد میرے نزدیک اردو کا سب سے بڑا شاعر اقبال ہے۔ اور اس پہلو سے اس کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل میرے نزدیک یہ ہے کہ ملٹن کی طرح اس نے بھی شیطان کی کردار نگاری بلکہ جذبات نگاری ایسی بے پناہ معروضیت کے ساتھ کی ہے کہ ملٹن کی طرح اس پر بھی ابلیس کی عزت افزائی کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ درانحالیکہ اس کے مذہبی افکار و عقائد کے پیش نظر اس کے مرید ابلیس ہونے کا شبہ اتنا ہی بے بنیاد بلکہ احمقانہ ہے جتنا ملٹن کے بارے میں ولیم بلیک کا یہ خیال کہ وہ لاشعوری طور پر ابلیسی گروہ کا ہم نوا تھا"۔

اور اقبال کا کمال صرف اسی پر ختم نہیں ہو جاتا کہ اس نے ابلیس کی انتہائی ہمدردانہ تصویر پیش کر دی ہے بلکہ وہ جہاں لینن کی تصویر کشی کر رہا ہو یا طالسطائی کی خواہ سوامی رام تیرتھ کی عکاسی کر رہا ہو یا مہاتما بدھ کے ہاتھ پر توبہ کرنے والی رقاصہ کی جہاں ابوبکرؓ کو سامنے لا رہا ہو یا ابوجہل کو ان میں سے کوئی بھی اگر اقبال کی کھینچی ہوئی اپنی تصویر کو دیکھے تو اس پر حیرت و استعجاب کی وہی کیفیت طاری ہو جائے گی جس کا ذکر کالرج (Coleridge) نے اپنی مشہور نظم "قبلا خاں" میں کیا ہے۔ اور بے خودی میں ان کے منہ سے نکل جائے گا "ان من البیان لسحرا"۔

اس کے بعد مجھے اردو کے صرف ایک اور شاعر کا ذکر کرنا ہے اور یہ شاعر وہ ہے جس کے معتقد نہ ہونے کو غالبؔ و ناسخؔ نے متفقہ طور پر "آپ بے بہرہ" ہونے کے مترادف ٹھہرایا ہے میرؔ کی بے پناہ داخلیت کے سبب بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شاعری میں معروضیت اور آفاقیت کی تلاش بے سود ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو میرؔ کی داخلیت میں صاف طور پر ان دونوں عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بے شک میرؔ عشق اور غم کی داخلی کیفیات کی عکاسی کر رہا ہے مگر کس کی کیفیات! کیا صرف اس کی اپنی؟ کیا آج ہزاروں ہزار انسان ایسے نہیں بلکہ کیا ہر دور میں ہزاروں انسان ایسے نہیں ہوں گے جو میرؔ کا کلام پڑھ کر غالبؔ کا مذکورہ مصرعہ دہرانے پر خود کو مجبور پائیں گے۔ غالبؔ و میرؔ میں اس نقطۂ نظر سے بلاشک فرق ہے اور بڑا اہم فرق ہے۔ غالبؔ نے شیکسپیئر کی طرح انسانوں کے ہر طبقہ اور ہر گروہ کی تصویر کشی کی ہے (بلکہ غالبؔ کے بے نام کرداروں کی رنگا رنگی شاید شیکسپیئر کی تخلیقی ہمہ گیری سے کچھ زیادہ ہی ہے) لیکن میرؔ نے اپنے دائرہ فن کو محدود رکھا ہے۔ اس کا کلام اکثر و بیشتر کسی عشقیہ ٹریجیڈی کے اہم کرداروں کی خود کلامی (Soliloquy) معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس محدود دائرے میں اس نے جس تمثیلی فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے اس کو دیکھ کر وہ ہمیں غالبؔ سے بھی زیادہ عمیق نظر کا حامل معلوم ہونے لگتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ چاول کے ایک دانے پر سورۂ اخلاص لکھ دینا پورا قرآن لکھ ڈالنے سے زیادہ مشکل ہے۔ انگریزی ناول نگار جین آسٹن نے اپنا دائرہ فن کتنا محدود رکھا ہے مگر اس کی عظمت کی قسم سر والٹر اسکوٹ (Sir Walter Scott) ہی نہیں ہر ادیب و نقاد کھانے کے لئے تیار ہے۔ میرؔ نے بھی صرف ایک خاص قسم کے انسانوں کی ترجمانی کی ہے مگر اس ترجمانی میں اپنا خونِ جگر اس طرح بھر دیا ہے کہ خود روحِ تمثیل رقص میں آجاتی ہے۔

سید ظہیر الدین علوی مرحوم

جناب سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

اردو کے محسنوں میں کشمیر سے لے کر راس کماری تک جن لوگوں کا شمار ہے، ان میں گزشتہ صدی (۱۸۹۸ء) میں پیدا ہونے والی ایک شخصیت سید ظہیر الدین احمد علوی کا نام بھی ہے۔ علوی صاحب کا اصل وطن جون پور ہے۔ جہاں کی خاک نے علم و دانائی کی مایۂ ناز شخصیتیں پیدا کیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم جون پور اور فتح گڑھ وغیرہ میں حاصل کی، مسلم یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں ایم اے کیا۔ اسی دوران میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ لیکن طبیعت کا رجحان اس پیشہ کے خلاف تھا۔ اس لئے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ جہاں سے تشنگان علم کی سیرابی کرنے۔ اور انسان دوستی کا سبق دینے، جس کا سلسلہ زندگی کے آخری لمحات تک باقی رہا۔ مگر افسوس ۱۲ جنوری ۱۹۷۴ء کی دوپہر کو زندگی کا یہ آفتاب گہن میں آگیا۔

علوی صاحب ماہر قانون، ماہر نفسیات، یا ماہر تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کئے جائیں یا نہ کئے جائیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ صدق دلی اور ایمانِ محکم کے درجۂ یقین پر فائز تھے یہی سبب ہے کہ علی گڑھ میں آپ سر سید اور شبلی منزل سے چند قدم کے فاصلے پر جامعہ اردو کی جو عالی شان، دو منزلہ عمارت دیکھ رہے ہیں اور جسے ہم "علوی منزل" بھی کہہ سکتے ہیں وہ آپ کے سوز باطن کی دلیل ہے۔ جامعہ اردو جو ایک خاموش ادارہ ہے اور جس کے ذریعہ اردو ملک گیر بن سکی ہے۔ بلکہ اس آفاقی دور میں آفاقی بن گئی ہے۔ جس نے اپنی بقا کے لئے کسی لمحہ بھی پروپیگنڈا یا اشتہار بازی سے کام نہیں لیا، اس کی شہرت و عروج کی ضامن علوی صاحب کی ذات تھی۔ جامعہ اردو نے اپنی پچیس سالہ زندگی میں آفات ارضی و سماوی کا جس بلند حوصلگی سے مقابلہ کیا اور اردو کی بقا کے لئے اردو کا پیغام دور و نزدیک پہنچانے کے لئے، جس جس راہ سے

سفر کیا ہے، اس سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں۔ ایک وقت ایسا تھا، جب علوی صاحب رجسٹرار جامعہ اردو بھی تھے۔ کلرک، چپراسی اور ممتحن بھی ــ گرمی کی حدت اور سردی کی شدت سے بے نیاز ہوکر، انھوں نے اپنی زندگی کا سودا جامعہ اردو سے کرلیا تھا۔ اور اس کے صلے میں اس کی وسعت چاہتے تھے، ویسے وہ جہاں کام کرنا چاہتے تھے، وہاں کام لینا بھی جانتے تھے۔ وہ پابند رہنا اور پابند کرنے دونوں گُر سے واقف تھے۔

بزم اقبال کی یہ شمع جامعہ اردو آگرہ سے ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ منتقل ہوئی، میں ۱۹۴۴ء سے علی گڑھ سے وابستہ ہوں۔ احسن مارہروی مرحوم اور علوی صاحب مرحوم کا گھر "اردو گھر" تھا۔ اس لحاظ سے یہ گھرانہ میرا اپنا گھر تھا اور ہے، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک جامعہ اردو کے امتحانات میں شرکت کرنے والوں کی تعداد علوی صاحب کے حسن سلوک سے جس حد تک بڑھی، اس کا اندازہ اس امر سے کیجیے کہ ۱۹۴۹ء کے آخر میں علوی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ "جامعہ کے کام میں میرا ہاتھ بٹاؤ" چنانچہ جامعہ اردو کے سب سے پہلے ملازم ہونے کا شرف مجھے حاصل ہے۔ اگرچہ یہ مدت بہت ہی کم رہی لیکن مجھے اس نسبت پر بھی فخر ہے۔ اس کے بعد جامعہ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے روز افزوں ترقی پاتا رہا حتیٰ کہ امسال اس ادارے سے ساڑھے سات ہزار طلبا رکی جماعت "شریک امتحانات اردو" ہوئی ہے۔ اس طرح اردو کام کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں ایک مرکز پر جمع ہوگئے ہیں۔ جامعہ اردو نے اپنی وسعت کے لحاظ سے ہندوستان تک ہی اپنا پھیلاؤ نہیں رکھا ہے۔ آپ اگر جزیرہ "ماریشس" کے سنٹر سے بھی اس کے امتحان میں شریک ہونا چاہتے ہیں تو بخوشی شرکت کیجیے۔ اس تنزیہی اور تہذیبی کام کے پھیلاؤ کی واحد ذمہ دار علوی صاحب کی تن دہی، لگن، محنت شاقہ اور بے لوث خدمت ہے۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا تھا علوی صاحب کام کرنا اور کام لینا دونوں جانتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ کام کے تابع نہ تھے۔ کام ان کا تابع تھا۔ سری نگر سے راس کماری تک اردو کا کام کرنا تھا۔ اس کام کے لئے ایک شخص کیا کرسکتا تھا۔ لہٰذا انھوں نے کام کرنے والے بھی پیدا کئے اور اس طرح

کام کی ایک انجمن بنا ڈالی۔ ممکن ہے میری اس بات پر آپ کو ہنسی آئے لیکن آپ جامعہ اردو کی سالانہ رپورٹ اٹھا کر دیکھئے گا تو کام کرنے والوں کی ایک طویل فہرست پایئے گا۔ اس میں سنٹر کے نگراں اور امتحان کے نگراں حضرات بھی شریک ہوں گے۔ اور معاونین و مددگار بھی۔ پھر جامعہ اردو کا کام جس شوق سے اور عبادت سمجھ کر علوی صاحب انجام دیا کرتے تھے۔ اس سے ہمارے دلوں میں ایک نیا جذبہ ابھرتا اور ہمارے ایمان کو نئی تقویت ملتی ہے۔ اور یقین کامل ہوتا ہے کہ اردو کے کاز کو اس محسن کے جذبۂ حقیقی کی بدولت ابدیت حاصل ہوگی۔

آخری دو ملاقاتیں

میں حسب پروگرام ۵ جنوری ۱۹۶۴ء کو علوی صاحب کے حضور گیا تھا۔ جامعہ اردو کے مسائل سلور جوبلی کے پروگرام، اپنی صحت، اپنے مکان اور اپنے بچوں کے بارے میں بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ پُر امید اور سدا بہار باتیں، نہ خوف نہ ہراس، نہ یاس نہ ناامیدی۔ چلتے وقت فرمایا۔ "دیکھو بیٹے، ۱۱ جنوری کو کراچی سے صالحہ آرہی ہے، تم ایسا انتظام کردو کہ وہ جہاز سے اترتے ہی کسٹم وغیرہ سے فرصت پالے اور اپر انڈیا سے روانہ ہوکر ساڑھے گیارہ بجے شب تک علی گڑھ پہنچ جائے"۔ میں نے یقین دلایا کہ حسب سابق اس بار بھی ایسا ہی انتظام ہوجائے گا۔ لیکن ۱۰ جنوری کو کراچی سے تار ملا کہ "صالحہ نہیں آرہی ہے"۔ ۱۱ جنوری کی شب کو میں علی گڑھ گیا۔ ۱۲ جنوری کو سوا دس بجے (صبح) علوی صاحب کی زیارت کے لئے گیا تو بیگم علوی نے بتایا کہ "رات سے طبیعت غیر ہے۔ سانس کا زور ہے، نہ بیٹھے سکون مل رہا ہے نہ ہی ایک لمحے کے لئے لیٹ سکے ہیں۔ ابھی ابھی ڈاکٹر انصاری گئے ہیں۔ ضمیر (سب سے بڑے صاحب زادے) آکسیجن پلانٹ اور ضروری ادویہ لینے گئے ہوئے ہیں۔ تم یہیں بیٹھو"۔ میں نے سب سے پہلی دفعہ بیگم علوی کے آنسو دیکھے، آنسو جو ایک مقدس تحفہ ہے، آنسو جو پلک کے اندر رہے تو خون کا قطرہ ہے اور پلک سے ڈھلک کر باہر آئے تو نیر کہلائے۔ تعجب بھی ہوا اور ان کی بے لوث خدمت اور مشرقی خاتون ہونے کا احساس بھی۔ بیگم علوی کا ایک پیر کمرے میں اور دوسرا دالان میں تھا وہ جس لمحہ تک دالان میں رہتیں ان کی آنکھ سے آنسو جاری رہتے۔ مگر جب کمرے میں جاتیں تو خشک ہوجاتے۔ کمرے

میں علوی صاحب کی ہر آہ کے ساتھ وہ بے قرار ہو کر پہنچ جاتیں۔ اس درمیان میں کئی بار خیال آیا، کیا کل تک علوی صاحب صالحہ کی آمد کے منتظر تھے اور جب یہ امید ختم ہو گئی تو "طلب الٰہی" کے منتظر ہیں۔ صالحہ ان کی محبوب بیٹی ہے، ان کی جگر گوشہ ہے، کیا اس کا انتظار نہیں کریں گے۔ اس کے بچوں کو پیار سے محروم کر دیں گے؟ ساڑھے دس بجے ضمیر صاحب آکسیجن پلانٹ اور کمپاؤنڈر محمود کے ساتھ آ گئے۔ گلوکوز کا انجکشن اور ضروری ادویہ بھی ساتھ لائے اب میں بھی ساتھ ہی کمرے میں گیا۔ چہرے پر انتہائی کرب کے آثار ہویدا تھے۔ مگر زبان پر اللہ اللہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ آکسیجن کے لئے کہا تو فرمایا "اب آخری اسٹیج ہے۔ سانس اکھڑ گئی ہے۔ نہ دوا کی ضرورت ہے، نہ کسی اور بات کی۔" بہت کچھ کہنے پر آکسیجن لینے پر آمادہ ہوئے۔ اور سب سے پہلی بار پندرہ منٹ کے لئے آکسیجن لیا۔ لیکن اس سے ذرا بھی افاقہ نہ ہوا قلب کی حالت درست تھی، نبض کی رفتار بے ڈھب تھی، اور موت کا پسینہ جاری تھا۔ ہم لوگ اپنی کم فہمی سے اسے کمزوری سمجھتے رہے۔ اور شدید سردی کے باوجود پنکھا جھلتے رہے۔ تولیے سے پسینہ خشک کرتے رہے، مگر ان کی بے چینی اور تعب میں کمی نہ آتی تھی۔ آخر گلوکوز کا انجکشن اور طاقت کی دوائیں دی گئیں۔ اس سے بھی افاقہ نہیں ہوا۔ اور زبان سے بار بار فرماتے رہے "کوئی فائدہ نہیں، اللہ اللہ سانس اکھڑ رہی ہے"۔ میں نے کہا۔ آپ کیا فرماتے ہیں۔ خدانخواستہ سانس اکھڑنے والے کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ سب کچھ سُنے انجکشن کی شیشی لے کر پڑھے، اور بتائیے کہ کس کمپنی کا ہے۔ میری اس بات پر خاموش ہوئے اور کہا "نہیں بیٹے، سخت اذیت ہو رہی ہے میری سانس اکھڑ گئی ہے۔ آخری اسٹیج ہے، قبر کا انتظام کرو"۔ میں نے ان کی اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بیگم علوی سے کہا "سنترے کا عرق نکال کر دیجئے"۔ وہ چند ہی لمحے میں تازہ عرق نکال لائیں، علوی صاحب نے "ایک گھونٹ لے کر پیا۔ دوسرا گھونٹ لیا مگر کلی کر دیا"۔ پھر پانی مانگا۔ دو تین گھونٹ پانی کے پیئے، لیکن ان کی حالت غیر ہو رہی تھی، کسی پہلو سکون نہیں تھا لیٹنا تو ممکن ہی نہ تھا۔ ایک ماہ پہلے قلب کا شدید دورہ پڑا تھا، اس عارضہ میں مبتلا تھے لیکن حالت قطعی سکون پذیر ہو چکی تھی، ڈاکٹر نے بھی خدشے سے باہر ہونے کا اعلان کر دیا تھا لیکن اچانک رات کو گیارہ بجے تنفس تیز ہوا۔ اس کے بعد سے لیٹنا محال ہو گیا۔ بس بیٹھے رہتے۔ بارہ گھنٹے مسلسل اس

عالم میں گزر چکے تھے۔ جسم ٹھنڈا تھا مگر آس تھی۔ یاس کا خیال تک نہ تھا، میں کمرے سے باہر آیا اور میں نے کمپونڈر سے کہا "علوی صاحب کی حالت ٹھیک نہیں ہے، کسی ڈاکٹر کو دکھانا چاہیئے" چنانچہ منیر صاحب کو بھی باہر بلایا اور وہ محمود کمپونڈر کے ساتھ ڈاکٹر لانے کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس وقت پونے بارہ بجے تھے، ضمیر صاحب جا چکے تھے، میں علوی صاحب کے پاس ہی تسلی، تشفی، اور سکون خاطر کی باتیں کرتا رہا، مگر انھیں آگاہی ہو چکی تھی اور مرد مومن کی طرح زندگی کے سارے رشتے منقطع ہونے سے واقف ہو گئے تھے، اس لئے وہ ہر بار یہی فرماتے "بیٹھے، اب کچھ نہیں ہے، سانس قطعی بے ربط ہو چکی ہے، قبر کا انتظام کرو"۔ بارہ بجکر پانچ منٹ پر میں نے بیگم علوی سے چند منٹ کے لئے گھر تک جانے کی اجازت طلب کی۔ مگر افسوس کیا جانتا تھا کہ موت کا وہی لمحہ ہے میرے ہٹتے ہی ایک سید کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے گی۔ غالباً بارہ بجکر دس منٹ پر علوی صاحب نے ہم سب سے ترک تعلق کیا اور اپنے اللہ کے حضور پہنچ گئے، مجھے بلانے فوراً آدمی گیا۔ کف افسوس ملتا ہوا واپس آیا اور گھر کے ہر فرد کو گریاں پایا۔

علوی صاحب ایک حیاتی بزرگ تھے، خوش اخلاق، پاک باطن، مومن نفس، عالی مرتبہ اور ہمدرد قوم بزرگ تھے، ان کا اخلاق سب کے لئے یکساں تھا، ہر مذہب و ملت کے فرد کے واسطے ان کے دل کے دروازے وا تھے۔ اس لئے ان کے جنازے میں ہر ہی ملت کا فرد موجود تھا، جنازہ ساڑھے چار بجے شام کو وزیر منزل سے روانہ ہوا۔ پانچ بجکر چالیس منٹ پر مسلم یونیورسٹی کے قبرستان پہنچا۔ نماز مغرب کا وقت ہو گیا تھا، سب نے فریضہ خداوندی ادا کیا۔ اس کے بعد مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے نماز جنازہ پڑھائی اور سوا چھ بجے تک یونیورسٹی کے قبرستان نے اس ہستی کو اپنی آغوش میں لے لیا جو ایک ادارہ تھی۔ جنازہ میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر ضیا احمد بدایونی، مسٹر نقوی پرنسپل میڈیکل کالج مسلم یونیورسٹی و پرنسپل ٹریننگ کالج اور بیشمار حضرات شریک تھے۔ سب کے دل گریاں اور ہر آنکھ اشک بار تھی۔

یہ مختصر داستان اس شخص کی ہے جو اردو کے لئے پیدا ہوا تھا اور اردو کے لئے مر گیا۔ جس کی ذات انجمن تھی اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ایک ادارے کی حیثیت رکھتا، آیئے ہم آپ مل کر اس عظیم اور بزرگ شخصیت کے لئے دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر نذر عقیدت پیش کریں اور یہ عہد کریں کہ علوی صاحب کے اس ادارے "جامعہ اردو" کا کام اور زیادہ لگن، شغف، توجہ اور دلی خلوص سے کریں گے۔

حافظ صاحب کی وفات اور تعزیتی جلسہ

۲۲ اور ۲۳ فروری (سنیچر اور اتوار) کی درمیانی شب میں کوئی ساڑھے بارہ بجے جامعہ کے جیالی رکن اور مخلص کارکن جناب خواجہ حافظ فیاض احمد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حافظ صاحب کی عمر کوئی ۷۷ سال تھی اور ایک طویل عرصے سے تنفس کے مریض تھے، مگر جامعہ کے لوگ اس غیر متوقع اور اچانک خبر کے لئے تیار نہیں تھے، جس نے بھی اس افسوسناک خبر کو سنا غم اور رنج سے نڈھال ہوگیا۔ سہ پہر میں نماز جنازہ ادا کی گئی، جس میں امیر جامعہ اور نائب صدر جمہوریہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے علاوہ، مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا محمد میاں اور بہت سے معززین شہر نے شرکت کی، اس کے بعد جامعہ کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔

۲۵ فروری کی صبح کو قرآن خوانی کے بعد دعائے مغفرت کی گئی اور سہ پہر میں جامعہ کے کارکنوں اور طالب علموں کا ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا، جس کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے کی، اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مرحوم کی خدمات پر ایک مختصر سا تقریر کی۔ سب سے پہلے ناظم شعبۂ دینیات مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے قرآن کی [illegible] [illegible] دکھ کے موقع پر صبر و تحمل کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید [illegible] پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال کا یہ شعر

[illegible] سمجھے جاتے ہیں
[illegible] ےدوام لے ساقی
[illegible] ہوتا تو یہ سمجھا جاتا کہ جواں کے پرانے ساتھی

تھے وہ ایک ایک کرکے رخصت ہو رہے ہیں اور شاعر چاہتا ہے کہ کہیں سے آبِ حیات مل جائے تو ان کو مرنے سے بچا لیا جائے۔ مگر اقبال کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسی دعا نہیں کر سکتے جو قانونِ فطرت کے خلاف ہو۔ غالباً ان کا مقصد یہ ہے کہ کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیئے کہ جن لوگوں نے اچھے کام کئے ہیں اور ملک و قوم کی خدمات انجام دی ہیں ان کے نام دنیا میں باقی رہنے چاہئیں، ان کی مثال لوگوں کی نظروں کے سامنے ہونی چاہیئے۔

میں نے یہ شعر اس لئے پڑھا کہ خواجہ حافظ فیاض احمد صاحب، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے جامعہ کے ان پرانے اور مخلص خادموں میں سے تھے، جنھوں نے جامعہ کے پودے کو خونِ جگر سے سینچا اور اس کو نشو و نما دی۔ جو لوگ بالکل ابتداء سے ان کے ساتھ تھے ان میں اب کوئی باقی نہیں رہا، البتہ ایسے چند خادم ابھی موجود ہیں، جو بہت عرصے سے ساتھ کام کر چکے ہیں۔

"بادہ کشوں" سے میری مراد ان لوگوں سے ہے، جنھوں نے جامعہ کی بنیاد رکھی، پھر وہ لوگ ہیں جنھوں نے بہت مشکل حالات میں جامعہ کو چلایا یعنی ۲۰ء سے ۴۰ء تک کا زمانہ جامعہ کا ابتدائی زمانہ ہے۔ ۴۰ء میں حالات ایسے پیدا ہوئے کہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ جامعہ زندہ رہے گی، مگر اس سے قبل بڑی مشکلات کا دور تھا۔ میرے دوست اور آپ سب حضرات کے دوست اور بزرگ خواجہ فیاض صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے نہ معلوم کس کس ہمت سے ان مشکلات میں جامعہ کو چلایا اور اس کی جڑوں کو مضبوط بنایا۔

۲۶ء میں جب میں جامعہ میں آیا تو اس وقت حافظ صاحب [illegible] اس کے بعد کچھ عرصے تک نائب خازن رہے۔ مگر تدریس [illegible] تعلق حافظ صاحب سے تھا۔ اس وقت جامعہ کی مالیات کیا تھی؟ [illegible] کے چلایا جائے اگر حافظ صاحب نے [illegible] ہے، کہیں نہ کہیں سے رقم لاتے تھے۔ یہ تمام رقمیں [illegible] ایک مرتبہ بڑی بڑی رقمیں بھی آئیں، سب سے پہلے [illegible] مدراس وغیرہ سے بڑی رقم آئی [illegible]

تقریباً ایک لاکھ، ان تمام رقموں کا حساب کتاب حافظ صاحب ہی کے پاس ہوتا تھا۔ قومی اداروں کے حسابات کے متعلق عام طور پر جو رائے ہے وہ آپ سب کو معلوم ہے، مگر حافظ صاحب کی دیانت امانت کی بدولت جامعہ کے حساب وکتاب پر کبھی دشمنوں نے بھی کسی طرح کی بدعنوانی کا الزام نہیں لگایا۔ ان کے ساتھیوں اور دوستوں کو ان پر کامل اعتماد تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب کبھی میری بیوی کو ان کی پانی پت کی جائداد سے رقم وصول ہوتی تو وہ حافظ صاحب کے پاس رکھوا دی جاتی، اور ہم تھوڑی تھوڑی کرکے ان سے لے لیا کرتے۔ وہ پیسے پیسے کا حساب رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہم اسے کبھی کبھی جانچ لیا کریں، مگر ہمیں کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

مرحوم کو ملکی اور ملی درد بھی بہت تھا۔ آزادی کی خاطر جیل گئے، وطنیت اور قومیت کے لئے بدنامی مول لی، ملی کاموں کے لئے دل کھول کر چندہ دیتے اور مذہب وملت کی حمایت کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہتے۔ ان کی ایک بڑی صفت صاف گوئی تھی۔ وہ جس ادارے میں کام کرتے تھے جس سے ان کا بہت گہرا اور قلبی تعلق تھا۔ اس پر سختی سے نکتہ چینی بھی کرتے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم سے ان کے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ مگر ان پر سختی سے اعتراضات بھی کرتے، اور خود حسن نظامی صاحب ہی کے رسالوں میں اس طرح کے مضامین لکھتے۔ اس کی وجہ سے حسن نظامی صاحب نے حافظ صاحب کو "مخلص نکتہ چیں" کا خطاب دیا تھا۔

غرض ملک وقوم کی سچی محبت اور خدمت خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرنا، خلوص اور صاف گوئی، دیانت اور امانت وہ صفات تھیں جنھوں نے ان کو اپنوں میں محبوب اور غیروں میں محترم بنا دیا تھا۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین کی اس موثر تقریر کے بعد جیر کی طرف سے حسب ذیل تعزیتی تجویز پیش ہوئی، جسے حاضرین جلسہ نے کھڑے ہوکر منظور کیا۔

" جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارکنوں اور طالب علموں کا یہ جلسہ خواجہ حافظ فیاض احمد کی وفات پر اپنے شدید رنج والم کا اظہار کرتا ہے اور مرحوم کی قومی اور ملی خدمات کا، خصوصاً اس قابل قدر اور پر خلوص خدمت کا جو انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قومی تعلیم کے پودے کو لگانے، ناسازگار

آپ دہوا میں اپنے خون جگر سے سینچ کر پروان چڑھانے میں انجام دی، تہہ دل سے اعتراف کرتا ہے، نیز مرحوم کے بیٹوں اور دوسرے عزیزوں سے سچی اور گہری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے خدائے تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، ان کے ماتم داروں اور سوگواروں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ہم سب کو ملک وملت کی محبت اور خدمت کی راہ میں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آخر میں صدر جلسہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے مرحوم کی شخصیت اور ان کی خدمات پر تقریر کی۔ جس میں مرحوم سے ذاتی تعلق اور ان کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ افسوس کہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے پوری تقریر شائع نہیں کی جا سکی۔ انشاء اللہ اگلے پرچے میں شائع کی جائے گی۔

جامعہ کالج کے اساتذہ اور طلباء کا بھی ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا تھا۔ ۲۳ فروری کی صبح کو جب حافظ صاحب کی وفات کی خبر ملی تو اسی وقت جامعہ کے تمام ادارے بند کر دئے گئے۔ کالج کے اساتذہ اور طلبہ نے فوری طور پر تعزیتی جلسہ منعقد کیا، مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا اور مغفرت کی دعا کی، اس کے بعد سب لوگ مرحوم کے مکان پر تشریف لے گئے۔

اوکھلا گاؤں کی مسجد سے حافظ صاحب کو خاص تعلق تھا، مکان قریب ہونے کی وجہ سے پنج وقتہ نماز وہیں ادا کرتے، اخیر عمر میں، کمزوری کی وجہ سے، عیدین کی نماز بھی جامعہ کے بجائے وہیں ادا فرماتے، اس کی تعمیر اور مرمت وغیرہ کے کاموں میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے اس تعلق خاص کی وجہ سے ۲۸ فروری کو بعد نماز جمعہ حافظ صاحب کی وفات پر رنج وغم کا اظہار کیا گیا اور دعائے مغفرت کی گئی۔

(ع ل ا)

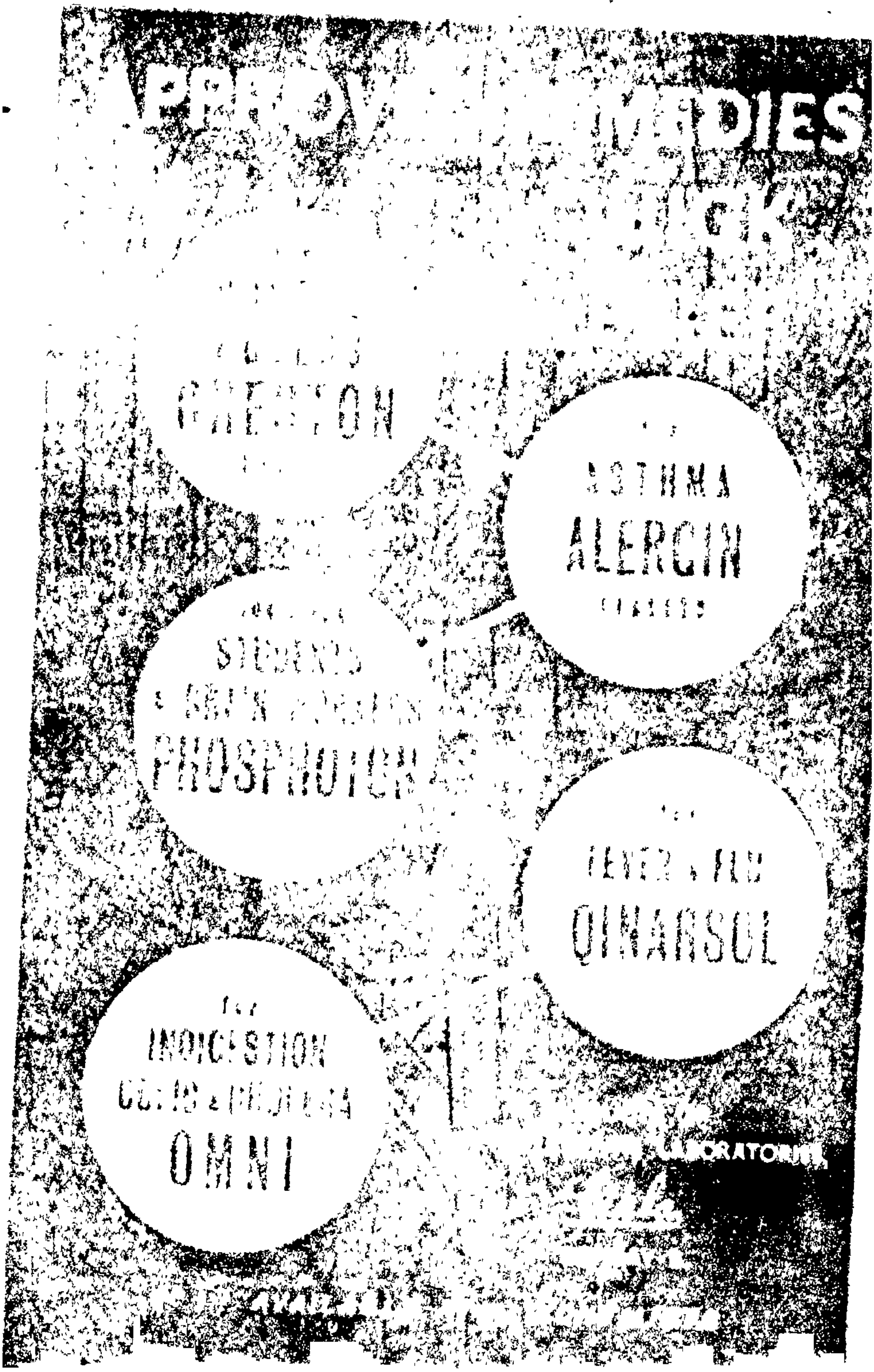
بیان بابتہ ملکیت رسالہ و دیگر تفصیلات

۱۔ فارم نمبر ۴
۲۔ مقامِ اشاعت : جامعہ نگر۔ نئی دہلی نمبر ۲۵
۳۔ وقفۂ اشاعت : ماہانہ
۴۔ پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کا نام : عبداللطیف اعظمی
۵۔ قومیت : ہندوستانی
۶۔ پتہ : جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
۷۔ ملکیت : جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

میں عبداللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر: عبداللطیف اعظمی
۲۵ فروری ۱۹۶۴ء

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پریس دہلی   ٹائیٹل: دیال پریس دہلی


ALERGIN
QINARSOL
INDIGESTION
OMNI

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ ۶ رُوپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۵۰ | بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۶۴ء | شمارہ ۴

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

فلسفۂ تعلیم اور قومی زندگی

جناب سعید انصاری

تعلیم کے مسئلہ پر آج مختلف علمی حلقوں میں مختلف رایوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اور ہر حلقہ اپنی ہی رائے کو ملک کے لئے مفید اور ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ شکوہ نہیں، شکر کی جگہ ہے۔ اس سے کم سے کم یہ تو پتہ چلتا ہے کہ آج ہر شخص اس مسئلہ پر سوچ رہا ہے، گو اس میں کوئی ہم آہنگی اور یک جہتی نظر نہ آتی ہو۔ لیکن یہ اختلافِ آراء اور تنوعِ خیال کچھ ہمارے اسی زمانہ کی خصوصیت نہیں، بلکہ اب سے کوئی ڈھائی ہزار برس پہلے یونان کے ایک چھوٹے سے ملک کے سامنے بھی بعینہٖ یہی کیفیت تھی اور اس زمانے کے ایک بڑے حکیم ارسطو نے اپنے ملک کی ان کیفیات کا اپنی کتاب "سیاست" میں ان لفظوں کے ساتھ ذکر کیا ہے:

> "حالات جیسے کہ ہیں ..... لوگ اس پر کسی طرح متفق نہیں کہ کیا چیزیں سکھانی چاہئیں، خواہ ہم نیکی کو دیکھیں یا بہترین زندگی کو۔ نہ یہ بات صاف ہے کہ آیا تعلیم کا تعلق ذہنی نیکی (زندگی) سے زیادہ ہے یا اخلاقی سے۔ موجودہ عمل (اور) پریشان کن ہے: کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ ہمیں کس اصول پر چلنا چاہیئے — آیا ہماری تربیت کا مقصد وہ چیزیں ہونی چاہئیں جو زندگی میں کارآمد ہیں، یا نیکی ہونا چاہیئے، یا اعلیٰ تعلیم ہونا چاہیئے (اس لئے کہ، ان تینوں خیالات کا اظہار کیا گیا ہے)۔ پھر جہاں تک ذرائع کا تعلق ہے، اس پر بھی اتفاق رائے نہیں، اس لئے کہ مختلف لوگ جو نیکی کی نوعیت کے متعلق خیالات رکھتے ہیں، قدرتاً اس کے عملی پہلو پر بھی اختلاف رکھتے ہیں۔[1]"

ارسطو کے زمانے میں تعلیم اور اس کے مقاصد کے بارے میں سطورِ بالا سے جو اختلافِ آراء

---

[1] ارسطو: "سیاست" کتاب ہشتم، باب ۲۔

نظر آرہا ہے، اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اس وقت کے حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ یونان ایک اشرافیت سے نکل کر جمہوریت میں قدم رکھ رہا تھا، تجارت اور کاروبار کی یکبارگی وسعت نے اسے مشرقی بحر روم میں ایک قیادت کا درجہ دے دیا تھا۔ قومی طاقت نے اسے دوسری بڑی بڑی اقوام کے بالمقابل لاکھڑا کر دیا تھا، اور اس طرح دوسری تہذیبوں اور قوموں کے اتصال نے یہ مسئلہ پیدا کیا کہ آیا موجودہ تعلیم اور تعلیم کے مقاصد ان نئے حالات کا ساتھ دے سکیں گے یا نہیں؟

آج ہمارے ہندوستان میں بھی بعینہٖ یہی حالات رونما ہیں۔ ایک طرف دو سو برس کی سیاسی غلامی اور اس سے قبل کی شہنشاہیت اور جاگیردارانہ نظام سے ہمیں چھٹکارا ملا ہے۔ دوسری طرف ملک کی سیاسی اور معاشی زندگی کے جدید تقاضوں اور بین الاقوامی حالات سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ ایسی صورت میں قدرتاً ہمارے سامنے بھی یہی سوال اٹھتا ہے کہ آیا ہماری موجودہ تعلیم اور اس کے مقاصد ہمارے نوجوانوں کی ذہنی تربیت اور ہماری قومی زندگی کی تشکیل میں کہاں تک ان جدید حالات کا ساتھ دے سکیں گے؟

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے تغیر پسند حالات کے اندر تعلیم کا مقصد ترقی پسندانہ ہونا چاہیئے، یعنی بچّہ کے ذہن کی ایسی تربیت ہونی چاہیئے کہ وہ نت نئی تبدیلیوں کا ساتھ دے سکے اور تعلیم کا مقصد ان نت نئے تجربات کی تشکیل نو ہو۔ اس کے مقابل میں دوسرے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جب زندگی نت نئی تبدیلیوں کا نام ہے تو پھر ایسی چیزوں کی تعلیم دینی چاہیئے جو مستقل اور پائدار اقدار رکھتی ہوں۔

ان دو متضاد نقطہ ہائے نظر سے جو تعلیمی لوازم پیدا ہوتے ہیں، وہ بھی غور کے قابل ہیں اگر ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کو لیجیئے تو اس کے مطابق نصاب تعلیم میں ہر آن اپنی افادیت اور ضرورت کے لحاظ سے تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر دوسرا نقطہ خیال سامنے ہے تو پھر نصاب کو اس کی مستقل قدروں سے ناپا جانا چاہیئے۔ یہ مسئلہ اگر یہیں تک ہوتا تو کوئی مضائقہ

نہ تھا۔ لیکن جیسا کہ خود ارسطو نے ان سطور بالا میں ذکر کیا ہے، اصل پریشانی کا باعث طریقہ اور عمل کا اختلاف ہے۔ اگر ایک شخص تعلیم میں مستقل قدروں کا حامل ہے تو اس صورت میں اس کا طرزِ عمل بچّوں کے ساتھ زیادہ حاکمانہ ہوگا، بہ نسبت اس صورت کے جبکہ اس کا نقطۂ نظر تجربی ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص ترقی پسندانہ میلان رکھتا ہے تو وہ بچوں کی دلچسپی اور ان کے شوق کا زیادہ لحاظ رکھے گا اور اسی بنیاد پر وہ نصاب کی تشکیل بھی کرے گا جو اس وقت کی ضروریات کا ساتھ دیتا ہو۔

یہ صحیح ہے کہ فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ تعلیم کوئی دو الگ الگ چیزیں نہیں، بلکہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں لیکن ہر ایک رُخ کو دیکھنا اور اسے متعین طور پر سمجھنا بھی علمی نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔ تعلیم اب ایک مستقل علم بن گیا ہے اور ہر علم کی طرح اس کے اپنے اصول اور ضوابط مرتب ہوتے جا رہے ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہر شخص تعلیم کے مسئلہ پر اظہار خیال شروع کردے اور لوگ وجد میں آکر جھومنے لگ جائیں، بلکہ اب اس کا ایک مستقل فلسفہ بنتا جا رہا ہے جس کا بے شک فلسفہ زندگی سے ایک گہرا تعلق ہوگا اور وہ تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر موادِ تعلیم سے لے کر جماعت کے نظم و نسق پر اپنا مخصوص رنگ ڈالے گا۔ اس فلسفۂ تعلیم کی حقیقت علیحدہ سے جاننے اور سمجھنے کی یوں بھی ضرورت ہے کہ بعض لوگ اپنی سادہ لوحی میں تعلیم کے ایک جزوی پہلو یا کسی ایک طریقہ کو اختیار کر لیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ وہ کسی ایک فلسفۂ زندگی کی تائید یا تغلیب کر رہے ہیں۔ یا اس کے برعکس ایک فلسفۂ زندگی کے قایل یا حامی ہوتے ہوئے یہ نہیں سمجھتے کہ روزمرہ کی تعلیمی زندگی میں یا اس کے عملی پہلوؤں پر اس کے کیا نتائج اور اثرات مرتب ہوں گے۔

آئندہ سطروں میں وضاحت کے طور پر ہم دو مختلف بلکہ متضاد فلسفہ زندگی کو لے کر اس کے تعلیمی پہلوؤں پر نظر ڈالیں گے اور دیکھیں گے کہ ان سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک آمرانہ فلسفۂ زندگی لیجیے اور دوسرا جمہوری۔ اس آمرانہ فکر کی ہمیں اس دورِ جدید کی تاریخ میں کئی ایک نمایاں مثالیں ملتی ہیں۔ ہٹلر، جو پہلی عالمی جنگ کے

بعد اپنی قوم کو دوبارہ زندہ کر کے جرمنی میں ایک نیشنل سوشلسٹ پارٹی کا قاید اعظم بنا، اس نے نہ صرف ایک نئے فلسفہ حیات اور ایک نئے فلسفۂ زندگی کی داغ بیل ڈالی بلکہ ایک نئے فلسفۂ تعلیم کو بھی جنم دینا چاہا۔ اس کے اور کارناموں سے تو ہمیں یہاں بحث نہیں، تعلیم سے متعلق اس کے خیالات ہمارے اصل موضوعِ بحث سے قریب ہیں، اس لئے ہم انھیں نقل کرتے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے :

"سب کی تعلیم وہ خطرناک اور مہلک زہر ہے جو لبرلزم نے خود اپنی ہلاکت کے لئے ایجاد کیا ہے .... لہٰذا ہم کو اپنی مستقل راہ پر قائم رہنا چاہیئے اور اس ارذل طبقہ کے جمہور عوام کو جہالت کی برکتوں سے مستفید ہونے دینا چاہیئے۔"

اس نے اسی طرح کہیں ان نوجوانوں کے بارے میں بھی کہا ہے جنھیں اس نے اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے منتخب کیا تھا :

"میں انھیں کوئی ذہنی تربیت نہیں دینا چاہوں گا۔ علم میرے ان نوجوانوں کے لئے تباہی کا باعث ہے۔"

جس طرح حضرت موسیٰؑ نے دس احکام شریعت اپنی قوم بنی اسرائیل کے لئے دئے تھے اس دشمن اسرائیل نے اپنے نازی نوجوانوں کے لئے بارہ احکامات پر مشتمل ایک لائحۂ عمل پیش کیا تھا۔ ہم ان میں سے چند بطور نمونہ یہاں پیش کرتے ہیں :-

۱- "فیورر (قائد اعظم) کبھی غلطی نہیں کرتا۔"

۵- "یہ لائحۂ عمل تمھارے بنیادی عقائد ہیں۔ ان کا تقاضہ ہے کہ تم ان کی بے چوں وچرا تعمیل کرو۔"

۱۲- "جس چیز سے تحریک کے مفاد کو فائدہ پہنچے، اور اس کے ذریعہ جرمنی اور جرمن قوم کو، وہ صحیح ہے۔"

یہ تو فیورر کے افکار وخیالات تھے، ان کے حواریین ان سے کچھ کم نہ تھے۔ فیلڈ مارشل گوئرنگ، جنھیں ہٹلر کا دست راست کہا جاتا تھا، ایک موقع پر جرمن مزدوروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"تمہیں فیورر کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلنا چاہیئے، خواہ وہ ہمیں جہاں چاہیں لے جائیں"۔

اسی طرح آٹو دیترش جو نازی محکمۂ اشاعت کا افسرِ اعلیٰ تھا، برلن یونیورسٹی کے طلباء کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے:

"فرد کی کوئی آزادی نہیں، صرف لوگوں کی، قوموں کی اور نسلوں کی آزادی ہو سکتی ہے"۔

اس مکتبِ خیال کے ایک اور ہم عصر اور شاید اس سے بھی زیادہ متشدد آمر بینی ٹو مسولینی نے اس فلسفہ کو اس سے زیادہ شدت کے ساتھ اپنے ملک میں پیش کیا ہے۔ آزادی کے متعلق اس کا ایک نہایت حقارت آمیز فقرہ نقل کیا جاتا ہے، جو اس نے کسی موقع پر کہا تھا اور وہ یہ تھا: "میں آزادی کی لاش پر تھوکتا ہوں"۔ معلوم نہیں عملاً ایسا ہوا یا نہیں، لیکن اس کی شرمناک موت کے بعد اس کی لاش پر یہ عمل بے شک صادق آیا۔

اس کے زمانے میں اس کا جو وزیرِ عدلیہ تھا، اس کا بھی ایک اسی قسم کا قول نقل کیا جاتا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "فرد ریاست کے مقاصدِ اعلیٰ کے حصول کے لئے محض ایک ذریعہ ہے"

اسی مسولینی کے عہدِ حکومت میں ایک درسی کتاب کے اندر یہ الفاظ ملتے ہیں:

"مذہبی عقائد پر صرف اس لئے بحث نہیں کی جا سکتی کہ وہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی الہامی حقیقتیں ہیں۔ فاشستی اصولوں پر بھی بحث نہیں ہو سکتی ہے، اس لئے کہ وہ ایک مافوق البشر انسان بینی ٹو مسولینی کے فکر کا نتیجہ ہیں"۔

ان دونوں فلسفۂ زندگی یعنی آمری اور جمہوری کے مزید فرق کو اور واضح کرنے کے لئے ہم ایک ہی زمانہ کی دو بڑی شخصیتوں کو لیتے ہیں جن کے فلسفہ زندگی اور فلسفہ تعلیم میں زمین آسمان کا فرق دکھائی دے گا۔ نپولین بوناپارٹ، جو انقلاب فرانس کے بعد — وہ انقلاب جس کا نعرہ تھا، آزادی، مساوات اور اخوت — فرانس کا سب سے پہلا شہنشاہ ہوتا ہے اور جس کی سپہ گری اور فتوحات ملکی کا سکہ چار دانگ عالم میں بیٹھ گیا تھا، وہ تعلیم کا مقصد معلموں کی ایک جماعت قائم کرنے کے سلسلہ میں ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"میرا خاص مقصد معلموں کی جماعت قائم کرنے سے یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سیاسی اور

اخلاقی آرا کی تربیت ہو تمام سیاسی مسئلوں میں یہ مسئلہ (تعلیم کا) سب سے زیادہ اہم ہے
کوئی متعین ریاست اس وقت تک نہیں بن سکتی، جب تک متعین اصولوں کے ساتھ
کوئی معلمین کی جماعت نہ ہو۔ جب تک کسی شخص کی بچپن سے یہ تربیت نہ ہوگی کہ وہ
جمہوریت پسند ہوگا یا شاہ پسند، کاتولیکی ہوگا یا لادین، اس وقت تک کوئی ریاست
قوم نہیں بن سکتی ہے۔"

اس بچپن سے تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر نپولین نے سیاسی عقائد پر ایک کتاب شائع
کی تھی، جس میں شہنشاہ نپولین اول کے بارے میں رعایا کے فرائض کی تعلیم سوال وجواب کی
شکل میں اس طرح دی گئی تھی :

سوال: ہم اپنے شہنشاہ کے فرائض کیوں بجا لاتے ہیں ؟

جواب : اول اس لئے کہ خدائے تعالیٰ جس نے یہ تمام مملکتیں پیدا کیں اور اپنی مرضی کے مطابق
انھیں تقسیم کیا، ہمارے شہنشاہ کو امن اور جنگ دونوں میں بیش از بیش انعامات
سے نوازا ہے اور اسے ہمارا حاکم اور اس سرزمین پر اپنی قوت اور جلال کا وکیل بنایا ہے
اس لئے شہنشاہِ معظم کی خدمت اور عزت خود خدائے عزوجل کی خدمت اور عزت ہے۔"

پھر جہاں تک طریقہ اور عمل کا تعلق ہے، ان عقاید کی روشنی میں نپولین کے ان
مدرسوں میں "ہر چیز فوجی طریقہ پر ہوتی تھی۔ نقارے کی چوٹ پر یہ اسکول چلتے تھے
مدرسوں کے اندر فوجی قوانین کے مطابق کام ہوتا تھا۔ جماعتوں کی تنظیم کمپنیوں کی شکل میں کی
جاتی تھی جن کے ساتھ ان کے کپتان، لفٹننٹ، سارجنٹ اور کارپورل ہوتے تھے۔ مدرسہ
کے گوشہ گوشہ سے فوجی روح کی کارفرمائی نظر آتی تھی ..... ان مدرسوں میں چھوٹی سے چھوٹی
ہر چیز مرکزی حکومت کی طرف سے نافذ ہوتی تھی، حتیٰ کہ قانون کے استادوں کو ہدایت ہوتی
تھی کہ وہ اپنے اسباق کا کتنا حصہ املا کرائیں اور کتنا زبانی پڑھائیں۔"

آپ کو یاد ہوگا کہ گزشتہ سطروں میں ہٹلر نے عام تعلیم کا کتنا خاکہ اڑایا ہے اور اسے
قومی زندگی کے لئے سم قاتل بتایا ہے۔ اور اسی کے ساتھ نپولین نے استادوں کی جماعت

صرف اپنے سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے ہیبہ اکرنی چاہی تھی اور تعلیم کا تمام نظام عسکری بنیاد وں پر رکھا تھا، لیکن اب سے کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے جمہوریہ امریکہ کے ایک صدر ٹامس جیفرسن نے اپنی نئی جمہوریت کی تعمیر و تشکیل کے لئے اس کی اسی قدر اہمیت اور ضرورت پر زور دیا ہے۔ جنوری ۱۸۱۸ء میں وہ ایک خط میں لکھتا ہے کہ

"اگر ان دونوں میں سے یہ سوال ہو کہ ابتدائی تعلیم چھوڑی جائے یا یونیورسٹی کی تعلیم، تو میں آخر الذکر کو چھوڑنا زیادہ پسند کروں گا، اس لئے کہ یہ زیادہ بہتر ہے کہ پوری قوم کو تعلیم کی روشنی پہنچے۔ بہ نسبت اس کے کہ تھوڑے سے لوگ تو علم کی روشنی سے بہرہ ور ہوں اور زیادہ تر لوگ جہالت کی تاریکی میں گھرے ہوں۔ یہ آخر الذکر حالت جس میں کوئی قوم مبتلا ہو، بہت زیادہ خطرناک ہے۔ یورپ کی قومیں اور حکومتیں اس کا زندہ ثبوت ہیں"

جمہوریہ امریکہ کا یہ صاحب نظر صدر صرف قومی تعلیم کا ایک فلسفہ پیش کرکے چلا نہیں گیا بلکہ اس نے پوری قومی تعلیم کی اسکیم مع اپنی تمام جزئیات کے اپنی مجلس قانون ساز کے سامنے ایک مسودۂ قانون کی شکل میں ترتیب دیا تھا جس کا مطالعہ تعلیم کے طالب علم کے لئے آج بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"اس مسودہ قانون کا منشا یہ ہے کہ ہر کاونٹی (ضلع) پانچ یا چھ مربع میل کے چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان میں سے ہر ایک میں پڑھانے لکھانے اور حساب سکھانے کے لئے ایک مدرسہ کھول دیا جائے جس کی کفالت اس حلقہ کے ذمہ ہوگی۔ اس حلقہ کے ہر شخص کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ تین برس تک اپنے بچوں کو مفت اس مدرسہ میں بھیجے، اور اس کے بعد بھی جب تک چاہے، بھیجتا رہے بشرطیکہ اس کی تعلیم کا خرچ اٹھانے کو وہ تیار ہو۔ یہ مدرسے ایک نگراں کی ماتحتی میں ہوں گے جس کا فرض ہوگا کہ ہر سال مدرسہ سے سب سے ذہین بچہ آگے کی تعلیم کے لئے منتخب کرے جس کے والدین غریبی کی وجہ سے اس بچے کو مزید تعلیم نہ دے سکتے ہوں اور اسے آگے کسی گرامر اسکول

ہیں نہ بھیج سکتے ہوں۔ یہ گرامر اسکول مختلف حصوں میں ۲۰ کی تعداد میں کھولے جائیں اور اور ان میں یونانی، لاطینی، جغرافیہ اور ریاضی کی اعلیٰ شاخوں کی تعلیم دی جائے گی۔ اس طرح ایک سال میں جتنے لڑکے ان اسکولوں میں آئیں گے اور ایک سال تک بطور آزمائش ان میں رکھے جائیں گے، پھر ان میں سے بہترین چن لئے جائیں گے جو چھ سال تک برابر رہیں گے اور بقیہ رخصت کر دیے جائیں گے۔ اس طرح ہر سال جو بچے بھی آئیں گے، ان میں سے ۲۰ چھانٹ لئے جائیں گے اور پھر ان کو سرکاری خرچ پر تعلیم دی جائے گی، جہاں تک گرامر اسکولوں کے تعلق ہے۔ چھ سال کی تعلیم کے بعد نصف تعداد اپنی تعلیم ختم کر دے گی۔ (جن میں سے غالباً گرامر اسکولوں کے آئندہ استاذ نکلیں گے) اور بقیہ نصف تعداد جو اپنے مزاج اور استعداد کے لحاظ سے منتخب ہوگی، وہ تین سال کے لئے اپنے حسب منشا علوم کی تحصیل کے لئے ولیم ومیری کالج میں بھیجی جائے گی جس کا دائرہ اور وسیع کیا جا رہا ہے تاکہ اس میں اور علوم مفیدہ شامل ہو سکیں۔

"اس قانون کے بارے میں جتنی رائیں ہیں، ان میں سے کوئی اس سے زیادہ اہم اور مناسب نہیں، جتنی یہ کہ لوگ محفوظ رہیں، اس لئے کہ وہی اپنی آزادی کے سب سے بڑے نگہبان اور محافظ ہیں۔"

کسی ملک کی قومی زندگی کا دارومدار زیادہ تر اس ملک کے فلسفۂ تعلیم پر ہوتا ہے۔ اگر کہیں حکومت آمری ہے اور وہ لوگوں کو ایک شخص کا تابع اور محکوم بنا کر رکھنا چاہتی ہے، اس ملک کا نظام تعلیم اس قسم کے فلسفہ سے متاثر ہوگا۔ اور اگر کہیں حکومت جمہوری ہے اور لوگوں میں آزادی اور ان کی انفرادیت کو نشو ونما دینا ہے تو وہاں کی تعلیم پر اس قسم کے فلسفہ کا اثر ہوگا۔

پھر جو فلسفہ تعلیم اس ملک میں رائج ہوگا، اس کی جھلک اس کے مقصد، نصاب تعلیم، طریقہ تعلیم، انتظام مدرسہ، غرض تعلیم کے ہر پہلو پر نظر آئے گی۔ نپولین کے سلسلہ میں آپ نے

دیکھا کہ اس کا مقصد پڑھانے والوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا تھا جو لوگوں کی سیاسی اور اخلاقی رائیں جیسی وہ چاہتا تھا تیار کریں۔ اس کی درسگاہوں کا تمام نظام اور ان کی روزمرہ کی زندگی کسی فوجی بارک کی زندگی سے کم نہ تھی۔

برعکس اس کے جیفرسن کو دیکھا کہ وہ ابتدائی تعلیم کے نظام کو حکومت کے سپرد کرنے کی بجائے خود والدین کا اس میں بہت عمل دخل رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ہاں تعلیم کے مواقع ہر ایک کے لئے یکساں موجود تھے اور ہر ایک نیچے سے لے کر اوپر کے زینے تک پہنچ سکتا تھا، بشرطیکہ اس کے میلانات اور استعداد اس کا ساتھ دیتے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے آگے کی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا جو اصول مقرر کیا تھا، آج ہم ڈیڑھ سو برس گزرنے کے بعد بھی اس سے بہتر جمہوری طریقہ پیش نہیں کر سکے ہیں۔

فلسفہ تعلیم کے دو بڑے مکتبۂ خیال کہے جا سکتے ہیں: ایک قدامت پسند اور دوسرا ترقی پسند۔ قدامت پسند مکتبِ خیال میں بچہ کی انفرادی حیثیت کوئی حق نہیں رکھتی بلکہ اسے سماج یا ریاست کا ایک آلۂ کار سمجھا جاتا ہے۔ اس کی اپنی ذاتی حیثیت اسی سماج یا ریاست کے مفاد میں مدغم ہوتی ہے۔ برعکس اس کے ترقی پسند مکتبِ خیال میں بچہ کی انفرادی حیثیت مسلّم سمجھی جاتی ہے، اور اسی بنیاد پر ہر بچہ دوسرے سے مختلف مانا جاتا ہے۔ یہ اختلاف نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی اور فکری اعتبار سے بھی ہوتا ہے۔ اس ترقی پسند مکتبِ خیال کا یہ عقیدہ سچ پوچھئے تو حیاتیاتی ارتقاء کے مسئلہ پر مبنی ہے۔ اس مسئلہ کے طریقۂ فکر کے مطابق باوجود اس کے کہ نوع میں وحدت اور یکسانیت ہوتی ہے، لیکن اس کے اجناس میں خوب تنوع ہوتا ہے۔ یعنی ہر ایک اگرچہ نوعِ انسانی سے تعلق رکھتا ہے، لیکن حیاتیاتی اصول کی بنا پر اس کا ہر فرد دوسرے سے جدا اور مختلف ہو سکتا ہے۔ اس انفرادیت کا اثر بچے کے نصاب، طریقۂ تعلیم اور مدرسہ کی تمام زندگی پر پڑتا ہے۔ اس بنا پر اگر بچہ کی انفرادیت کا ضامن کوئی طریقۂ زندگی ہو سکتا ہے تو وہ جمہوری ہے۔

ہم نے گزشتہ سطروں میں آمری اور جمہوری طرزِ فکر پر مبنی دو طرح کے نظامِ تعلیم

پیش کرنے کی کوشش کی تھی اور اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ہر ایک فلسفہ تعلیم کس قسم کی قومی زندگی کی تشکیل و تعمیر کرنا چاہتا ہے اور بالواسطہ ہماری اپنی قومی زندگی کی تشکیل کے لئے کونسا طریقہ زیادہ صحیح اور مناسب ہوگا ۔ تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں جمہوریت نہایت مضبوطی اور استحکام کے ساتھ ہر جگہ قائم تھی، لیکن رفتہ رفتہ دنیا کے حالات نے کچھ اور پلٹا کھایا کہ بعض ملکوں میں جمہوریت ناکام رہی اور اس کی جگہ آمریت نے لے لی ۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا جمہوریت کسی مستقل طریقہ زندگی کا نام ہے یا یہ صرف ایک سیاسی مصلحت کی خاطر اختیار کرلی جاتی ہے اور بقیہ زندگی جس راستے پر جا رہی ہے چلتی رہے۔ جہاں جہاں جمہوریت ناکام رہی ہے ، اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں صرف مصلحت وقت کی خاطر اختیار کی گئی تھی اور پوری قومی زندگی کی تشکیل میں اس سے کوئی کام نہ لیا گیا تھا ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کرکے اسے فلسفہ تعلیم کا جزو بنا دیا جائے اور پھر اس کے ذریعہ قومی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں مدد لی جائے ۔

۱۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ انسان کی شخصیت کے نشوونما کا بہتر موقع فراہم کرتی ہے، اور اس کے مقابل میں آمریت ایک خارجی معیار کو سامنے رکھ کر اسے دبانا چاہتی ہے ۔ جمہوریت میں ہر فرد کو اپنی صلاحیت اور منشا و خواہش کے مطابق ترقی کا یکساں موقع ملتا ہے ، آمریت میں دوسروں کے منشا اور خواہش کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے ۔

۲۔ دوسری بڑی بات یہ ہے کہ جمہوریت میں ہر طرح کے اختلاف اور تنوع کی گنجائش ہے : یہ اختلافات نہ صرف سیاسی اور سماجی مسائل ہی سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ ان کا تعلق تہذیب اور قومی زندگی کے ہر پہلو سے ہوسکتا ہے ۔ مثلاً جمہوریت زبانوں کے اختلاف تہذیبوں کے فرق، رنگ و نسل کے امتیاز غرض ہر چیز کو گوارا کرسکتی ہے ، بشرطیکہ وہ قومی زندگی کی تشکیل اور تعمیر میں خارج نہ ہو ۔ وہ ہر ایک فرق اور امتیاز کو اپنے مزاج اور حیثیت

کے مطابق پھلنے پھولنے اور ترقی کا یکساں موقع دیتی ہے، وہ قومی زندگی کا ایک ایسا چمن آراستہ کرنا چاہتی ہے جس میں رنگ بہ رنگ کے پھول ہوں، اس لئے کہ چمن کی زینت اسی رنگا رنگی سے ہے، بشرطیکہ اس کی مجموعی زندگی سے چمن کا حسن آشکارا ہو۔ ہندوستان کی جیسی قومی زندگی میں نہ صرف سیاسی ضرورت اور مصلحت وقت کی خاطر اس رنگارنگی کی ضرورت ہے بلکہ اس کے اپنے وجود اور بقا کا انحصار اسی پر ہے۔

کوئی بھی فلسفہ زندگی ہو، خواہ آمری ہو یا جمہوری، ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے بنیادی اصولوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو، اور نہ صرف اس کا خارجی انتظام بلکہ خود تمام نظام تعلیم و تربیت کی بنیاد اسی پر ہو۔ ذیل میں بہ طور مثال، ہم چند اصول کی وضاحت پیش کریں گے اور اسی پر اس مضمون کو ختم کریں گے۔

سب سے پہلی چیز یہ کہ بچوں میں سماجی انصاف کا جذبہ پیدا کرنا۔ ان میں شروع ہی سے اس بات کا احساس پیدا کیا جائے کہ ہماری سماجی اور معاشی زندگی میں یہ اونچ نیچ کا فرق کیوں نظر آتا ہے۔ ان میں اس بات کی لگن پیدا کی جائے کہ اس فرق و امتیاز کے ناگوار اثرات کو دور کرنے کے لئے ان کے بس میں جو کچھ ہے، وہ اس سے دریغ نہ کریں گے۔ وہ ابتدا ہی سے اس بات کو سمجھیں کہ جو چیز وہ اپنے لئے چاہتے ہیں، وہ دوسرے سب لوگوں کو بھی میسر ہو۔

دوسری بڑی چیز جو ہمیں بچوں کے اندر پیدا کرنی ہے، وہ رواداری اور سالمیت ہے: رواداری اور سالمیت صرف مذہبی عقائد اور خیالات ہی کے معاملہ میں نہیں، بلکہ وسیع دائرہ زندگی میں اور اس سے زیادہ لسانی، تہذیبی، نسلی اور قومی رواداری کی ضرورت ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں جو قومی تعصب اور تنفر پیدا ہے، اسے دور کرنا ہے۔ اور انھیں ایک صالح اور متحدہ قومیت کا ہراول اور علمبردار بنانا ہے۔

تیسری بات جو بچوں میں پیدا کرنی ہے، وہ ماضی کے احترام کے ساتھ حال اور مستقبل کی ضروریات

کا خیال بھی ہے وہ اپنے علم کی روشنی کی عینک سامنے آنکھوں کی بجائے پیچھے سر پر نہ لگائیں ۔ جو قوم صرف ماضی کی، روایات اور آبا و اجداد کے پرانے کارناموں پر اپنی نئی نسل کی پرورش کرنا چاہتی ہے، وہ سمجھ لے کہ دنیا کی تیز گام قوموں میں وہ ہمیشہ پسماندہ، غریب، مفلوک اور نادار رہے گی۔ زندگی کے موجودہ مسائل اور آئندہ ترقی پذیر مستقبل کے مطالبات کا خیال اور لحاظ نہ رکھا گیا تو اندیشہ ہے کہ ماضی کی روشنی بھی ہمارے نوجوانوں تک نہ پہنچ سکے گی۔

چوتھی اور آخری چیز ہمیں اپنے بچوں میں ہاتھ سے کام کی عادت اور ہاتھ سے کام کرنے والوں کی عزت اور ان کا احترام پیدا کرنا ہے۔ ہمارے مدرسوں کی زندگی ایسے کاموں سے بھرپور ہونی چاہیئے جو نفع بخش ہوں، تخلیقی ہوں اور انھیں اپنی قومی زندگی سے ہم آہنگ رکھنے کا ذریعہ ہوں۔

غزل

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

نہ رنگ و بو۔ نہ طراوت نہ دلکشی۔ نہ پھبن
خزاں بدوش ہے اے ہم نفس بہارِ چمن

بدل سکا ہے بھلا کب مزاجِ چرخِ کہن
بہ خاکداں ہے ابھی تک اسیرِ رنج و محن

یقین رکھ کہ تباہی کی زد میں ہے وہ چمن
بنے ہیں جس کے ہوادار بوم و زاغ و زغن

اگر ہو یورشِ باطل تو غم نہیں ہم کو
قدم قدم پہ سجائیں گے بزمِ دار و رسن

نہ پوچھ کتنا سہارا ہے زندگی کے لئے
سوادِ غم میں وہ امید کی سنہری کرن

خرد نے کارنمایاں کئے بہت لیکن
جنوں کی دین ہے دنیا میں رسمِ دار و رسن

چلے ہیں زیست کی راہوں میں روشنی کرنے
جو اپنے گھر کے اندھیرے نہ کر سکے روشن

خلوصِ اہلِ وفا کو نہ آزما اے دل
جبیں پہ میرے رفیقوں کے آ نہ جائے شکن

ہزار تیرہ گئی شامِ غم سہی لیکن
کسی کے عکس سے بزمِ خیال ہے روشن

وہی ہیں ہم کہ ہیں کانٹے بھی ہم سے رُو گرداں
کبھی گلوں سے بھی ہم نے بچائے تھے دامن

اِدھر ہے خوگرِ بیدادِ عشق عربدہ جو
اُدھر ہے مائلِ تخریب حسن توبہ شکن

ہماری وضعِ وفا میں نہ فرق پائیں گے
ظہیر لاکھ ہمیں آزمائیں اہلِ وطن

علومِ اسلامیہ ہندوستان میں

ڈاکٹر عابد رضا بیدارؔ

آزاد ہندوستان میں علوم اسلامیہ (اسلامک اسٹڈیز) کا جدید معنی میں آغاز علی گڑھ سے ہوا جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے زمانے میں شعبۂ عربی و علوم اسلامیہ کے ملحق ایک تحقیقی ادارہ علوم اسلامیکا قیام بھی عمل میں آیا۔ یہ دس سال پہلے کی بات ہے۔

علوم اسلامیہ پر مختلف اعتبار سے کام کرنے والے ادارے اور اشخاص اس سے پہلے بھی موجود تھے۔ حیدرآباد کا "دائرۃ المعارف" جو ابتدائی اسلامی صدیوں کے عربی متن شائع کرنے میں درجۂ اختصاص حاصل کر چکا ہے، دارالمصنفین جو لگ بھگ پچاس سال سے مشہور علمی رسالہ "معارف" کی اشاعت کے ساتھ (جس کا ہر پرچہ علوم اسلامیہ پر کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کرتا ہے) علوم اسلامیہ کی متعدد شاخوں میں اہم اور اعلیٰ معیار کی اردو کتابیں شائع کرتا رہا ہے، دہلی کا ندوۃ المصنفین جو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی رہنمائی میں ۲۵ سال سے دارالمصنفین کی جیسی سہولتیں میسر نہ ہونے کے باوجود ہر سال پابندی کے ساتھ تین چار ٹھوس علمی کتابیں شائع کرتا رہا ہے، جنھیں علوم اسلامیہ کے عالمی ماہرین کے یہاں بھی درجۂ استناد حاصل رہا ہے اسی طرح اس ادارے سے سعید احمد اکبرآبادی صاحب کی ادارت میں "معارف" جیسا بلند پایہ رسالہ بھی "برہان" کے نام سے ۱۹۳۸ء سے شائع ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معارف اور برہان ان دونوں رسالوں کا پایہ اتنا بلند ہے کہ ان کے مضامین کے اشاریے یکجا مضمون وار ترتیب دے دیئے جائیں تو انگریزی کی مشہور کتاب "انڈکس اسلامیکس" جیسی اعلیٰ درجہ کی خدمت ہو گی اور ہزاروں طلبا اور تشنگانِ علم کی دردسری کو ختم کر دے گی۔

افراد میں ان مذکورہ اداروں سے منسلک مشاہیر مصنفین سے ہٹ کر کلکتہ میں قاضی عبدالودود (پٹنہ کے بیرسٹر ہیں) اور ڈاکٹر زبیر صدیقی اور ان کے ساتھ حیدرآباد کے متعدد صاحبان (کہ حیدرآباد ریاستی دور میں غیر منظم طور سے علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت کا اچھا خاصا مرکز تھا) ڈاکٹر عبداللطیف ابن یار جنگ، سید حسن بلگرامی اور سید علی بلگرامی، مولانا مناظر احسن گیلانی، وغیرہ نے بڑا ٹھوس کام کیا اور ان میں سے جو خدا کے فضل سے زندہ ہیں وہ اب بھی اس خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

علی گڑھ میں ادارہ علوم اسلامیہ والوں سے ہٹ کے پروفیسر خلیق نظامی نے اس میدان میں بہت اہم کام کیا ہے اور ہندوستانی تصوف پر استنادی کام کر ڈالا۔

دیوبند میں جو کام ہوا وہ اس لئے قابلِ ذکر نہیں ہے کہ اس سے علوم اسلامی میں واقعی کوئی ٹھوس اضافہ نہیں ہوا۔ البتہ مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے ڈابھیل کے کچھ لوگوں نے حدیث کے نادر عربی متن کی اشاعت میں اچھا خاصا کام کیا اور کر رہے ہیں۔

ندوۃ العلماء میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے تبلیغ اسلام کے سلسلے میں تو اچھا خاصا تحریری اور تقریری کام کیا لیکن ہمارے زیر بحث موضوع پر علمی قسم کی کوئی خاص چیز سامنے نہ آسکی سوائے ایک سرسری جائزہ کے جو انھوں نے "ہندوستانی مسلمان" کا لیا ہے اور این ہم غنیمت است۔ اگرچہ ندوہ کا آرگن "الندوہ" ایک عہد میں اچھی خاصی خدمت کر چکا ہے۔ (دیکھئے الندوہ کا اشاریہ "ادیب" شبلی نمبر) اب حال میں فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین اور موجودہ زمانے کی ضروریات کے پیش نظر اس کی تجدید پر غور و فکر کے لئے ایک کمیٹی ضرور ندوۃ کی سرکردگی میں بنی ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

جماعت اسلامی کی طرف سے جو لٹریچر بھی پیش کیا جاتا رہا ہے اس میں علم میں تبلیغ کی ملاوٹ ساتھ ساتھ چلتی ہے جو اچھی بات ہے لیکن ہمارے زیر بحث موضوع میں نہیں آتی مولانا مودودی کی چند کتابیں مثلاً پردہ، سود، یا خود تفہیم القرآن۔ اور مولانا صدرالدین اصلاحی کا ترجمۂ قرآن مجید اور افادات شاہ ولی اللہ اس ذیل میں ایک حد تک ضرور آسکتی ہیں تبلیغی جماعت کے یہاں اتنا سوال بھی نہیں اٹھتا۔

احمدی جماعت میں بھی زیادہ تر تبلیغ کا زور رہا۔ ایک لے دے کے مولوی محمد علی مرحوم کا نام ہے جنھوں نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کرکے اسلام اور علم اسلامی دونوں کی اہم خدمت کی ہے۔ انگریزی ترجمہ قرآن کے ذیل میں پکتھال، عبداللہ یوسف علی، مرزا ابوالفضل اور مرزا حیرت کے نام بھی آتے ہیں۔ اور اردو ترجموں میں تو مولانا نذیر احمد، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عثمانی وغیرہ معروف نام ہیں ہی۔ اس ذیل میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ جنھوں نے اگرچہ کوئی اہم علمی کارنامہ انجام نہیں دیا لیکن خود ترجمان القرآن انھیں "علوم اسلامیہ" میں ایک اہم اور موقر مصنف کی جگہ دینے کے لئے کافی ہے۔

اسی جگہ مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام بھی یاد آتا ہے کہ ان کا ترجمہ قرآن ان کے بلند مرتبہ علمی کے لحاظ سے کافی نہیں ہے۔ انھیں 'صدق' کے صحافتی حلقہ میں اسیر ہونے کے علاوہ اور بہت کچھ کرنا تھا۔ اردو ادب میں وہ ایک اہم مصنف کی حیثیت سے معروف ہیں۔ مگر علوم اسلامیہ پر ان کے جو واقعی احسانات متوقع تھے وہ نہیں کرسکے۔ پروفیسر آصف فیضی کا نام ہندستان ہی نہیں بیرونی دنیا کے علوم اسلامیہ کے ماہر عزت اور احترام سے لیتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی زبان میں لکھنے والوں میں فیضی کے سوا کسی نے علوم اسلامیہ میں اختصاصی رتبہ حاصل نہیں کیا۔ فیضی کا خاص میدان قانون و فقہ اسلامی اور فرق اسلامی (خاص کر اسمٰعیلی فرقے) رہا ہے۔ لیکن دوسرے شعبوں میں بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اہمیت ہے۔ ابھی حال میں "فقہ اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت" کے موضوع پر وہ بڑے زور شور سے ایک مشن لے کر اٹھے تھے لیکن اس کی ہم نوائی زیادہ نہیں ہو پائی۔ لے دے کے ایک ان کے ہم خیال اجمل خاں صاحب (دہلی) ہیں جو قرآن اور سیرت پر برسوں سے کام کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ بعض ناقابل قبول جدتوں کے باوجود ان (اجمل خاں) کے ذہن کی رسائی، ان کی محنت اور اسلام اور علم دونوں کے ساتھ ان کے خلوص کی داد دینی پڑتی ہے۔ اردو میں شاید پہلی بار انھوں نے انگریزی طرز فکر اور مستشرقانہ طرز تحریر پیش کیا ہے۔

اس موقع پر ایک نام مولانا اسلم جیراجپوری کا یاد آیا اور ان کے ساتھ جامعہ ملیہ

مولانا کا کام بھی اہم ہے اور ان کا طرز فکر بھی کہ اس نے مقبول احمد (کبھی منکر حدیث)، غلام احمد پرویز، غلام جیلانی برق وغیرہ متعدد اسی انداز پر سوچنے اور لکھنے والے پیدا کیے۔

ویسے اب تک علوم اسلامیہ پر میرے نزدیک (اور شاید آپ سب کے نزدیک بھی) اہم ترین کام علامہ اقبال کا ہے۔ ان کے "اسلامی مذہبی افکار کی تجدید و تعمیر نو" پر سات لیکچر (جو پہلے ۶ تھے) علمی، فلسفیانہ، اور مبلغانہ تینوں پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں اور شاید ہمارے شدت پسند 'جدیدیوں' اور 'قدیمیوں' دونوں کے لئے ایک نمونہ بن سکتے ہیں۔

اقبال ہی نے (اور ان کے حلقہ احباب ہی سے کچھ علم دوستوں نے مل کر) اپنے آخری دنوں میں ۱۹۳۶ء میں "ادارہ معارف اسلامیہ" کے نام سے ایک باضابطہ ادارہ کی بنیاد رکھی تھی۔ جس کی سالانہ یا غالباً دو برسی کانفرنس لاہور میں دو بار ہوئی ایک ان کی زندگی میں دوسری شاید ان کے بعد۔ لیکن یہ کوئی متحرک اور فعال ادارہ نہ بن سکا اور کچھ لوگ شریک ہو کے اپنے مقالے پڑھ دیتے تھے جو بعد میں کتابی شکل میں چھپ جاتے تھے۔ اس کی صحیح اور زیادہ مناسب صورت اب علی گڑھ کی رہنمائی میں بنتی نظر آتی ہے جس کا ذکر ابھی ہوگا۔

سر سید نے کیا کام کیا ان کے ساتھیوں میں شبلی وغیرہ نے علوم اسلامیہ میں کیا کیا اہم اضافے کئے ان لوگوں سے پہلے شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ نے علم و فضیلت کے بلند پایہ معیار قائم کئے اور ان سے بھی پہلے مغل عہد، عہد سلاطین، اور مسلمانوں کی آمد کے بعد سے مختلف جگہوں پر علوم و تحریکات اسلامی نے درجہ بدرجہ کیسے منزلیں طے کیں اس کا ذکر تفصیل سے ہندستانی علوم اسلامیہ" کے ایک اور ماہر شیخ محمد اکرام آب کوثر، چشمۂ کوثر، کوثر اور رود کوثر میں کر چکے ہیں اور بلاشبہ ان کی کتابیں کسی بھی اہم تحقیقی کام کی اچھی بنیاد بن سکتی ہیں۔

ادھر آزادی کے بعد پاکستان میں "اقبال"، "ثقافت" اور "پاکستانی ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل" نامی رسالوں میں اور ان ہی رسالوں کے ناشر اداروں میں علوم اسلامیہ پر اچھا خاصا کام ہوا مگر ایسا نہیں جس کی امید کی جا سکتی تھی۔ ان میں اہم ترین کام خلیفہ عبدالحکیم کی نگرانی میں

قائم شدہ" ادارہ ثقافت اسلامیہ" لاہور کا ہے۔ لیکن وہ بھی "اہم ترین" ان میں کسی حد تک
ہے ورنہ علمیت کا اس کام میں بھی بڑی حد تک فقدان ہے۔ تاہم اردو میں ان موضوعات
جن پر کتابیں ہی نہ تھیں اب اس کی بدولت آگئیں، معیار آگے بنتا رہے گا۔ پاکستان میں اسـ
مملکت" کے دعوی کے سبب ناشرین کو بالعموم اسلامی کتب سے دلچسپی رہی اور ایسی کتابوں
کھپت بھی اچھی خاصی رہنے کے سبب دلچسپی میں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ عربی اور فارسی کی متعد
اہم کتابوں کے تراجم شائع ہو گئے جن میں حدیث، تفسیر، اور تصوف کی کتابیں شامل ہیں

اب پھر میں اپنے نقطہ آغاز پر آتا ہوں کہ آزاد ہندوستان میں علوم اسلامیہ پر جدید معنی
میں کام کی نشر و اشاعت، ذاکر صاحب کے علی گڑھ سے ہوئی جہاں ڈاکٹر عبدالعلیم کی نگرانی میں
۱۹۵۴ء میں ادارۂ علوم اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔ ادارہ کے فائل سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر
علیم اور خود ذاکر صاحب نے ایک دو سال تک اس کے لئے ماہرین کی تلاش اور ان کے
مشوروں کے حصول کے لئے کتنی تگ و دو کی، ڈاکٹر تاراچند اس زمانے میں ایران میں سفیر
تھے اور نواب علی یاور جنگ مصر میں۔ ان دونوں سے ذاکر صاحب نے مراسلت کے بعد
اور اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کے بعد وہاں کے ماہرین کو ہندوستان آنے کی دعوت دی
مصر سے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو بلانے کا ارادہ تھا جس میں ناکامی ہوئی۔ تہران سے پروفیسر
سعید نفیسی آگئے اور ترکی سے پروفیسر نیازی برکیبر۔ ذاکر صاحب نے ان لوگوں کو اپنے
خطوط میں ادارہ کے مقاصد بھی لکھے تھے۔ ادارہ کے مقاصد قیام کے وقت یہ تھے اور غالباً
اب بھی ہیں) :-

(۱) اسلامی تہذیب و تمدن، دینی، علمی، ثقافتی رجحانات کا مطالعہ۔

(۲) ممالک اسلامیہ کے جدید سیاسی، سماجی اور تہذیبی رجحانات کا مطالعہ۔

(۳) عربی، فارسی اور ترکی زبان اور ادب کا مطالعہ بالخصوص جدید اسالیب سے
واقفیت حاصل کرنا۔

ڈائرکٹر پروفیسر عبدالعلیم کے بقول اس میں کمی یہ ہے کہ "جنوبی مشرقی ایشیا یعنی ملایا،

انڈونیشیا اور چین اور وسطی ایشیائی تہذیب پر اسلام کے جو اثرات پڑے ہیں"۔ ان کے مطالعہ کا کوئی انتظام نہیں رکھا گیا۔ علیم صاحب کے بقول" اسلام کا اثر شمالی چین سے جنوبی افریقہ تک اور انڈونیشیا سے مراکش تک پھیلا ہوا ہے۔ ان اثرات کے گوناگوں مظاہر ہیں۔ عمل اور ردعمل کی بے شمار صورتیں ہیں، بہت سے ایسے نازک مسائل ہیں جن سے ہم پورے طور سے واقف نہیں۔ کس طرح اسلام نے دوسروں کا اثر قبول کیا اور کس طرح اثر ڈالا۔ جدید علمی معیار سے ان کا مطالعہ ایک گراں قدر کام ہے۔ خود ہندوستان میں اسلامی تحریکیں یا اسلام سے متاثر جو تحریکیں پیدا ہوئیں ان کا بھی ابھی تک کما حقہٗ مطالعہ نہیں ہوا ہے۔ یہاں مختلف علوم اسلامیہ مثلاً حدیث، تفسیر اور فقہ پر جو تصنیفات ہوئی ہیں ان کی قدر و قیمت کو اچھی طرح نہیں جانچا گیا ہے"۔

کسی قدر اس طویل اقتباس سے علوم اسلامیہ کن پہلوؤں کو احاطہ کرے اس کا ایک زاویۂ نظر، اور علی گڑھ میں کیا کام ہونے جا رہا ہے اس کا ایک اندازہ آپ کو ہو گیا ہوگا۔ مجموعی طور سے علی گڑھ کا ادارہ مشرق وسطیٰ (یعنی مشرق اوسط) پر کام کرنے والا ادارہ بننے جا رہا ہے۔ جہاں سے حال ہی میں ڈاکٹر اکمل ایوبی کی ایک اردو کتاب "ترکی" شائع ہوئی ہے۔ اس سے پہلے ایران کے معاصر فارسی گو شعرا کا ایک تذکرہ تین جلدوں میں ڈاکٹر منیب الرحمٰن مرتب کر چکے ہیں اور اب ڈاکٹر محمود الحق کی کتاب "عراق" پر بھی شائع ہونے والی ہے۔ مشرق وسطیٰ پر جس قدر کام ہوا ہے "عرب لیگ" (ڈاکٹر اقبال انصاری) اور مصر میں قومی تحریک کا ارتقا ۱۸۶۹ء — ۱۹۱۴ء"۔ اور اخوان المسلمون" (مولانا فضل الرحمٰن گنوری) قابل ذکر ہیں۔ ادارہ کی طرف سے انگریزی میں کوئی سو صفحے کا ایک مختصر سا بلیٹین بھی سال کے سال شائع ہوتا ہے (کبھی دو سال بھی لگ جاتے ہیں) اس کا موضوع بھی بڑی حد تک مشرق وسطیٰ ہی رہتا ہے۔ البتہ ادھر دو تین سال سے ایک چھماہی "مجلۂ علوم اسلامیہ" اور نکلنے لگا ہے جو ہندوستان کا اورنٹیل کالج میگزین سمجھنا چاہئے۔ لیکن اس میں "علوم اسلامی" پن زیادہ ہے۔ اب تک اس کے پانچ چھ پرچے شائع ہو چکے ہیں

جن میں ادب اور جزئی تحقیق زیادہ ہے علوم اسلامی کو فعال بنانے اور اس میں کوئی واقعی اضافہ کرنے والی بات نسبتاً کم ہے نسبتاً سے مطلب یہ ہے کہ توقع سے کم ہے۔

اس میں ملک اور بیرون ملک کے اہم ماہرین کے مقالے شائع ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں میں "اسلامک کلچر" (حیدر آباد) کا نام رہ گیا تھا جو تنہا اپنی جگہ اتنی خدمت انجام دے چکا ہے جتنی مذکورہ بالا سارے ادارے اور افراد۔ وہ اس لئے اس وقت یاد آگیا کہ "مجلہ" بجا طور پر اردو میں "اسلامک کلچر" بن سکتا ہے اگر اس میں جزئی تحقیق اور کتابیت، کم ہوجائے اور علم کے اضافے کی طرف توجہ زیادہ ہوجائے۔

دو رسالے اس ضمن میں اور یاد آئے ایک "اسلامک لٹریچر" لاہور جو بند ہوگیا ہے دوسرے "اسلامک تھاٹ" (علی گڑھ) جس میں جماعت اسلامی کا غیر سرکاری آرگن ہونے کے سبب "ترجمان القرآن" کے انداز ہی کا رہا اور تبلیغ اور علم کے بین بین کام کرتا رہا!

ذکر ادارہ کے کام کا تھا۔ اس میں آج کل نگران اعلیٰ پروفیسر عبدالعلیم ہیں جو فرق آج پر کام کر رہے ہیں۔ اسلام کے ۷۳ فرقے ان کا اختصاصی موضوع ہے۔ ڈاکٹر سید مقبول (جو ادارہ میں نہیں لیکن ان کی وجہ سے ادارہ کو افتخار حاصل ہے) تنہا وہ اتنا کام کر رہے ہیں جتنا سب مل کے، شعبۂ عربی و اسلامک اسٹڈیز کے ریڈر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں "جغرافیا" پر ایک طویل تحقیقی مقالہ لکھ چکے ہیں۔ "المسعودی" کی ہزار سالہ یادگار کتاب پیش کر چکے ہیں اور مسلمان جغرافیہ دانوں پر متعدد اہم مقالے لکھ چکے ہیں ادریسی نے ہندوستان پر جو کچھ لکھا ہے وہ شعبہ کی طرف سے شائع کرا چکے ہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی آزاد بلگرامی پر کام کر رہے ہیں اس سے پہلے وہ سبحۃ المرجان ایڈٹ کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر حامد علی خاں "ہندوستان میں عربی شاعری" پر کام کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر مختار الدین متعدد عربی متن شائع کر چکے ہیں اور ڈاکٹر منیب الرحمٰن آج کل فیضی کا دیوان ایڈٹ کر رہے ہیں۔

توقع ہے کہ ادارہ علوم اسلامیہ پر اگر پچھلے دنوں کی سی ڈھیل ڈھال، نہ چھائی رہی تو یہ ایک نمونے کا ادارہ بن جائے گا۔ اس کا سب سے اہم کام یہ بھی رہا ہے کہ وہاں کے ہر دو سال پر ایک آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس بھی منعقد کرے جو خوبی قسمت سے ۱۹۵۸ء سے تین بار علی گڑھ ہی میں منعقد ہوئی ہے۔ اس کانفرنس میں بڑے اہم مقالے پیش ہوئے ہیں اور اس سے ملک بھر میں علوم اسلامیہ کا چرچا ہوا ہے۔

اس چرچے کی ایک شکل نئی دہلی میں' ہمدرد' کا علوم اسلامیہ کا تحقیقی مرکز کا قیام ہے جس نے اس سال سے (سنہ ۱۹۶۴ء سے) تیزی کے ساتھ کام شروع کر دیا ہے۔ اس سال مستشرقین کی کانگریس کے موقع پر اس کا ایک سہ ماہی رسالہ "اسٹڈیز ان اسلام" بھی جنوری میں نکل آیا (ص ۹۶)، اس رسالہ میں مسلم آرٹ اور علوم ــــ اور ــــ اسلام و مسلمانانِ ہند پر مضامین کو ترجیح دی جائے گی۔ اس کے پہلے پرچے کے مضامین یہ ہیں۔

ہندوستان میں اسلام شاہ ولی اللہ سے پہلے (ایبٹ)

الحارث بن سعید الکذاب: عہد عبد الملک میں نبوت کا مدعی (ڈنلپ)

اسلامی قانون کے مآخذ کی حیثیت سے حدیث کی اہمیت (زبیر صدیقی)

رومی کی رمزیاتی زبان (شیمیل)

سید احمد اللہ شاہ کا ۵۷ء میں رہنما کا رول (معین الحق)

کلچر اور سویلزیشن اسلامی نقطۂ نظر سے (عبد اللطیف)

توحید (اردنگ) ــــ اور ــــ تبصرے۔

مضمون نگار اور مضامین دونوں اہم ہیں صرف اس بات کا آئندہ خیال رکھا جائے کہ مطبوعہ مضامین کو دوبارہ جگہ نہ دی جائے اور اگر ایسا کیا جائے تو اداریہ میں اس مضمون کے بارے میں توضیح کر دی جائے مثلاً اسی اشاعت میں ڈاکٹر لطیف کا مقالہ جو ان کی کتاب "اسلامک کلچرل اسٹڈیز" (شائع کردہ اشرف، لاہور، ۱۹۵۳ء) سے تین چوتھائی سے زیادہ حد تک لفظ بہ لفظ منقول ہے۔ یہ مضمون اچھا ہے اور اپنی کتاب ہی سے لیا گیا ہے

کوئی ہرج نہیں لیکن وضاحت زیادہ بہتر تھی۔

تو یہ ہمدرد کا ادارہ جو گذشتہ ایک سال سے کام کر رہا ہے اس کے مقاصد یہ ہیں:

۱۔ اسلامی کلچر اور سولیزیشن کا مطالعہ

۲۔ اداروں اور افراد کے درمیان تعلقات قائم کرانا جو اسلامک اسٹڈیز پر مختلف ممالک میں کام کر رہے ہیں۔

۳۔ ہندوستان پر اسلام نے جو اثر ڈالا اور ــــ (ب) ہندوستان نے علوم اسلامیہ میں جو اضافہ کیا اس پر ریسرچ کے لئے سہولتیں پیدا کرنا اور ریسرچ کرانا۔

ان مقاصد کے لئے چار شعبوں کی تنظیم و تعمیر کی جانے والی ہے۔

ایک کالج ــــ مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے لئے

ایک ــــ قرآنی علوم کے لئے

ایک ــــ سوشیالوجی اور کلچر کے لئے

اور چوتھا ــــ اسلامی فقہ کے لئے

ہمارا خیال ہے کہ ایک الگ شعبہ اسلامیان ہند، کے بارے میں ضروری ہے علی گڑھ کا ادارہ تاریخ عہد قرون وسطیٰ اگرچہ مغل عہد اور اس سے قبل کی تاریخ پر اچھا کام کر رہا ہے اور نئی اسکیم کی منظوری ہو جانے سے اس میں مزید وسعت آگئی ہے لیکن وہاں پھر بھی اصل موضوع تاریخ ہی رہے گا۔ اسلام اور علوم اسلامیہ کے لئے، ہمدرد نے چونکہ اپنے مقاصد میں ہندوستان کو ایک الگ ممتاز جگہ دی ہے اس لئے بجا طور پر یہ ایک الگ شعبہ ضروری ہے۔ میرے نزدیک تو یہ شعبہ اتنا اہم ہے کہ ایک الگ انسٹی ٹیوٹ محض یہی کام کرنے کے لئے بننا چاہیئے اور اس کا موضوع ہونا چاہیئے "انڈو اسلامکس"۔

نئی دہلی میں ایک ادارہ سپرو ہاؤس میں انڈین اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز کے نام سے کام کر رہا ہے جس میں دو شعبے ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔ ایک وسطی ایشیا کا شعبہ

جو عملاً صفر رہا ہے اور دوسرا مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کا شعبہ جس کے صدر ڈاکٹر محمد شفیع اگوانی اور ان کے مددگار۔ شام، مراکش، عراق، اسرائیل، لبنان وغیرہ عرب ملکوں پہ ببلیوگرافی (اشاریات) - مقالات اور کتابیں پیش کرتا ہے - یہ ادارہ پانچ چھ سال سے کام کر رہا ہے، دہلی یونیورسٹی نے اسے پی ایچ ڈی کے لئے تسلیم کر لیا ہے اور اس طرح یونیورسٹی کا حصہ ہے جہاں عرب دنیا پر ریسرچ ہو رہی ہے -

ایک اہم ادارے کا ذکر بالکل رہا جاتا ہے جو عیسائی مشن کی طرف سے علی گڑھ ہی میں قائم ہے اور انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے نام سے آزادی سے بہت پہلے سے کام کر رہا ہے۔ اس میں پروفیسر ولفریڈ کینٹول اسمتھ جیسے لوگ ڈائرکٹر رہ چکے ہیں اس کے بعد غالباً مسٹر مارٹن ڈائرکٹر رہے اور میں نے جب اسے کوئی دس سال ہوئے دیکھا تو اس کے نگراں کار پادری حق کے صاجزادے ڈاکٹر حق کام کر رہے تھے۔ معلوم نہیں اب وہ کہاں ہیں اور یہ کام کس کے سپرد ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ادارہ علوم اسلامیہ کی لائبریری سے کمیت اور کیفیت کسی میں کم نہیں ہے۔ دونوں میں لگ بھگ ۳۰، ۴۰ ہزار کتابیں ہوں گی۔ دونوں میں دنیا کے سارے مشہور رسالے جو اسلامی علوم کے بارے میں ہیں خریدے جاتے ہیں -

ادارہ علوم اسلامیہ کی طرح یہاں بھی ریسرچ ہوتی ہے۔ ساتھ ہی کچھ طلبا کو عربی اور متعلقہ علوم بھی سکھائے جاتے ہیں تاکہ وہ اسلام کو کماحقہ سمجھ کر اس کے مقابلہ میں عیسائیت کی افضلیت ثابت کر سکیں عام رجحان وہی ہے جو اس وقت تمام مستشرقین کا ہے یعنی ہمدردانہ رویہ اور ہمدردانہ مطالعہ۔ ڈاکٹر حق کہہ رہے تھے کہ ہم لوگ تو اکثر یہ سوچا کرتے ہیں کہ اسلام کو عیسائیت کا ایک فرقہ کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے اور محمدؐ کو مصلح کا درجہ دے کر CHRISTIANIZE کیوں نہ کر لیا جائے!!

اس سرسری اطلاعاتی مضمون کے آخر میں مجھے اتنا اور کہنا ہے کہ علوم اسلامیہ کا میدان مقصد اور منہاج، مختلف لوگوں کے نزدیک اپنے اپنے زاویہ نظر کے لحاظ سے مختلف

ٹھہرے گا لیکن ہر ایک معاملہ میں اصول ہم آہنگی ایک ہی ہونا چاہیئے جبھی اختلافات کم ہوتے ہیں اور وہ اصول وہی ہے۔

تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا و بینکم

اسلامک اسٹڈیز کا مفہوم اسلام بھی لیجیے اور مسلمان بھی کہ دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہیں اسلام میں اسلامی علوم قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، اسماء الرجال، سیر، تذکرہ علم کلام اور دوسرے مذاہب کا مطالعہ اور اس کے ساتھ مسلمانوں نے عام علوم میں جو اضافے کئے اور جواب تاریخ کا جزو ہیں کیمیا طبیعیات، مابعد الطبیعیات، نفسیات، معاشیات، سیاسیات عمرانیات سائنس کے دوسرے شعبے، زراعت، انجینیری، فوجی تعلیم و تربیت، عام تعلیم، تجارت تاریخ علم الآثار، سب کے سب علم، ان میں مسلمان مصنفین یا محققین نے جو اضافے کئے ہیں ان کو نکھار کے سامنے لانا یہ سب کچھ کرنا ہے۔

پھر اسلام میں اسلامی فنون بھی آتے ہیں مگر یہاں اسلام سے زیادہ مسلمان کا حلقہ شروع ہو جاتا ہے کہ سوائے مسجد کی سیدھی سادی تعمیر کے اسلام میں کسی فن کی اصولی طور سے ہمت افزائی نہیں کی گئی ہے کہ بعض جگہ اسراف ہوگا اور اکثر جگہ محض خدا کی نافرمانی۔ مسجدوں کی زیب و زینت تک جو آرٹ کی حدود میں آجائے، روح اسلام کے منافی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا مسلمان اور اسلام ایک دوسرے سے گتھے ہیں اس لئے مسلمانوں نے ممنوع، مکروہ، مباح اور مستحسن چاروں عنوانوں کے تحت جو فنون آسکتے ہیں ان سب میں کچھ نہ کچھ اضافہ کیا ہے ان سب کا مطالعہ ناگزیر ہے مسلمانوں نے موسیقی میں اضافہ کیا ہے اسے آپ مانیں یا نہ مانیں مسلمان بڑے اعلیٰ معیار کے مصور رہے ہیں۔ آپ گناہ گار ٹھہرائیں یا بخش دیں، مسلمان ماہر صناع اور اعلیٰ درجے کے ڈیزائنر ساز ہوئے ہیں۔ فن تعمیر میں ان کا ایک درجہ ہے۔ مسلمانوں نے ظروف سازی، قالین بافی باغبانی اور عام زیبائی پر بھی کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کیا ہے۔ نقش و نگار، فن خوشنویسی۔ فن تذہیب مرصع کاری۔ یہ سارے فن تو گویا مسلمانوں ہی کی دین ہیں۔

پھر کھیل کود میں انھوں نے جو کچھ کیا ہے شطرنج، گوٹے چوگان، کبوتروں کو سدا کے ان کے ہاتھ فوجی اور خانگی پیام رسانی دوسرے جنگلی جانوروں کو پالنا، ـــــ پھر عام درباری کی عشرت و کامرانی اور شعر و شراب کی محفلیں ـــــ اور رقص و سرود اور موسیقی وغیرہ ـــــ یہ سب کچھ آپ نظر انداز کر دیں گے تو دنیا میں آنکھیں اور دماغ صرف آپ ہی کو ودیعت نہیں ہوئے ہیں! دوسروں سے پہلے آپ خود کیوں ان سب پر کام نہیں کرتے۔

ایک نبوت پر کام کریں گے تو ساتھ ہی آپ کو نبوت کے جھوٹے مدعیوں پر بھی کام کرنا ہوگا۔ مورخ کا ذہن مہدوی تحریک، یا کسی اور تحریک کو غیر اسلامی سمجھ کر نہیں چھوڑ دے گا۔ مورخ تو ضعیف حدیثوں کو بھی اتنی ہی دلچسپی اور جستجو سے پڑھے گا جیسے صحیح حدیثوں کو، کیونکہ ان میں بھی ایسے رجحانات ملیں گے" تاریخ ملے گی "اسلامک اسٹڈیز میں بڑا درجہ رکھنا ہوگا تاریخی تحقیق کا"

اسلام کی طرح مسلمانوں کی بھی کام ناگزیر ہوگا۔ یہ مسلمان سنی مسلمان بھی ہوں گے، شیعہ بھی، اسمٰعیلی بھی، بوہرے بھی یہاں تک کہ دروز اور قادیانی یا بہائی بھی! ایک فرقہ کے نزدیک بعض جگہ دوسرا فرقہ کافر تک ٹھہرے گا لیکن اسلامک اسٹڈیز کا طالب علم صرف اس روشنی میں اپنا سفر طے کرے گا کہ ہر فرقہ جس نے اپنے آپ کو اسلام کا نام لیوا کہا ہے یا جسے مسلمان اپنا جزو سمجھتے ہیں یا جسے عام طور سے ماہرین مذاہب مسلمانوں میں ہی گنتے ہیں ان سب کو اس مطالعہ کا جزو بننا لازمی ہے۔

یہ مسلمان جو شمالی چین سے جنوبی افریقہ تک پھیلا ہوا ہے جو انڈونیشیا سے مراکش تک منتشر ہے جو صرف پاکستان یا سعودی عرب ہی میں نہیں ہندوستان میں بھی ہے کمیونسٹ روس میں بھی ہے ان میں کیا تحریکیں اٹھتی رہیں مختلف علوم اسلامیہ پر ان لوگوں نے کیا کچھ اضافہ کیا، ان کے معتقدات عام سکہ بند اسلام کے معتقدات سے کسی حد تک ہٹے ہوئے یا کسی حد تک موافق ہیں یا رہے ہیں ـــ ان کے ادارے، ان کے افراد،

ان کے افکار، ان کے اخبار، سب کچھ اسلامک اسٹڈیز کے دائرے میں آتا ہے۔ اور اگر ادبیات لسانیات کے ماہرین اجازت دے دیں تو ان ملکوں کے ادبیات کا مطالعہ بھی اس حد تک ضرور علوم اسلامیہ کے دائرے میں آتا ہے جہاں تک ادب معاشرہ کو عمل اور ردعمل کو، ذہنوں کی کش مکش کو، تہذیبی ارتقا اور زوال کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے اور اس حد تک اسے علوم اسلامیہ کا جزو شمار ہونا رہا ہے۔ (اس پر مفصل گفتگو پھر کبھی!)

آصف فیضی نے پہلی اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے جو کچھ کہا تھا اس کا خلاصہ یہاں آخر میں پیش کرتا ہوں علوم اسلامیہ پر کام کرنے والوں کو مشورہ دیتے ہوئے فیضی نے کہا تھا:

"ہمیں مستشرق بنا ہے۔ لفظ مستشرق اپنے اندر ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔ ایک مستشرق پروپیگنڈسٹ نہیں ہوتا وہ صرف حقیقت اور حق کا متلاشی ہوتا ہے"

پھر انھوں نے کہا تھا:

"کتنے جانتے ہیں کہ عہد جدید میں مذہب کا سائنٹفک مطالعہ کرنے والے کے لئے اہم مذاہب کا علم، علم الانسان، اور تاریخ پر عبور اور ان معتقدات و نظریات کے ساتھ ہمدردانہ رویہ جن سے ہم دور ہیں اور جن پر ہم ایمان نہیں رکھتے، کتنا ضروری ہے۔ خود اسلام بھی اسی وقت سمجھ میں آسکتا ہے جب آپ سامی مذاہب کے عہد موسیٰ سے یہودیت تک پورے ارتقا تک، عیسائیت تک اور پھر عہد اسلام تک ایک مربوط مطالعہ کریں۔ مذہب کا مطالعہ آپ تاریخ، معاشیات، فلسفہ اور علم الآثار سے بے نیاز ہو کر نہیں کر سکتے۔ خود قانون بیک وقت تاریخ سے، معاشیات سے، تہذیب سے اور مذہب سے متعلق ہے۔ جب تک ان متعلقہ علوم، ان کے عمل اور ردعمل کو نہ سمجھا جائے، اس وقت تک شریعتوں کو بھی نہیں سمجھا جا سکتا!!

رام پور میں صولت پبلک لائبریری سے ملحق ایک ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز پچھلے ایک دو سال سے کچھ کام کر رہا ہے اس کے کارکنوں کو رضا لائبریری، صولت لائبریری اور قاضی شہر سید احمد شاہ کے بیش بہا مخطوطات اور مطبوعات سے اخذ و مطالعہ کی سہولتوں کے پیش نظر اس کا امکان ہے کہ یہ بھی جلد ہی ملک کے اہم اداروں میں اپنی جگہ بنالے۔ ادارے کے مقاصد میں "ہندستان میں اسلام"

کا مطالعہ ـــــ اور سرحدی پاکستان، افغانستان، ایران، اور وسط ایشیا کے ادبیات، تاریخ اور کلچر کا مطالعہ ہے۔

رام پور میں مخطوطات کے جو اہم کلیکشن ہیں صولت کلیکشن، قاضی احمد شاہ کلیکشن وغیرہ، ان کا کیٹلاگ انسٹی ٹیوٹ تیار کر رہا ہے پہلی جلد جو صولت لائبریری کے فارسی عربی مخطوطات کی توضیحی فہرست پر مشتمل ہے پریس میں ہے دوسری زیر ترتیب ہے۔

آصف الدولہ کے ہندوستان میں عوامی زندگی کیسی تھی، بادشاہوں سے اور نواب سے ہٹ کے ہندستان کیا سوچتا اور کرتا تھا اس پر اس عہد کے ایک بڑے مصنف مرزا ابوطالب اصفہانی نے جو کتاب لکھی ہے "تفضیح الغافلین" اس کا ایڈیشن اس سال کے وسط تک شائع ہو جائے گا۔ یہ کام انسٹی ٹیوٹ کے کارکن اور نیشنل آرکائیز کے ڈائرکٹر مسٹر ترمذی ل کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں حدیث پر جو اہم ترین کام ہوا ہے یعنی کنزالعمال، اس کا باب با عنوان وار اردو ترجمہ انسٹی ٹیوٹ کے نگراں سید فریدالدین صاحب کر رہے ہیں۔ تین ہزار صفحات مکمل ہو چکے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ کی تازہ ترین اسکیم ہند سا فغانستان کلچر کا مطالعہ ہے جس کے لئے رام پور بہترین میدان ہے۔ پاکستان کے سرحدی علاقوں اور افغانستان کے دورے کے لئے جلد ہی انسٹی ٹیوٹ کے بعض کارکن جانے والے ہیں اس طرح موقع پر مطالعہ سے اسکیم زیادہ صحت سے قریب ہو جائے گی۔

اسی طرح ایک انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد میں کچھ دن ہوئے ڈاکٹر عبداللطیف کی نگرانی میں حدیث پر کام کرنے کے لئے بنا تھا معلوم نہیں اس کا کیا ہوا۔ اس کی اسکیم بہت شاندار اور امید افزا تھی۔

بمبئی میں بھی ایک اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن پروفیسر فیضی کی نگرانی میں قائم ہے اور چھوٹی بڑی مطبوعات اس کی طرف سے باہر آتی رہتی ہیں لیکن کچھ فعال جماعت نہیں ہے۔

محمود سامی بارودی
(جدید عربی شاعری کا معمار)

جناب سید احتشام احمد ندوی

بارودی سے قبل عربی شاعری عباسی دور کے انحطاط پذیر فن کی ترجمان تھی جس کا سارا سرمایہ لفظی صنائع و بدائع اور ایسی عبارت آرائی تھی جس میں معانی خبط ہو جائیں نہ صرف یہ بلکہ ایسی شاعری جس میں نہ زندگی تھی اور نہ قوت، اس طرز شاعری نے عربوں کی ذہنی زندگی کو تقریباً ختم کر دیا تھا کہ بارودی نے انھیں جھنجھوڑا، اپنے پرکیف اور بلند آہنگ نغمے کے ذریعہ عربی شاعری کو ایک نیا قالب عطا کیا۔ شاعری کی ہیئت وہی قدیم رہی مگر معنوی نقطۂ نظر سے بارودی نے ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ بلند خیالات سے اس کو بھر دیا وہ دور جدید کے ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے دوسرے شعراء کو حوصلہ اور بلندی عطا کی بارودی جلاوطنی کے زمانہ میں جو نظمیں لکھ لکھ مصر روانہ کرتے تھے انھیں شوقی پڑھ کر یہ تمنّا کرتے تھے کہ کاش وہ بھی اس طرح کا کلام کہہ سکتے۔

بہرحال بارودی کی شاعری نے اس تمام کثافت کو دُور کر دیا جو زوال پذیر دور عباسی کی یادگار تھی۔ انھوں نے صنائع و بدائع ختم کر دئے، جا بجا تکلفات سے شعر کو پاک کیا اور بے ربط معانی کے بجائے سوسائٹی کے روزمرّہ کے مسائل اور سماج کے احساس و جذبہ کو اپنا مطمح نظر قرار دیا۔ شاعری اور شخصیت دونوں میں بارودی نے صداقت پیدا کی اور اجتماعی و انفرادی غم و احساس

کی تصویر کشی کی۔ شخصی فخر ومباہات، ذاتی اغراض، مالی انتفاع جو قدیم شاعری کے اصل عناصر تھے ان کو بارودی نے چھوڑ کر انسانیت، فطرت، حسن، معاشرہ کے مصائب اور مسائل کو موضوع شاعری قرار دیا۔ اور یہ سب کچھ اس طرح پیش کیا کہ جدید شاعری میں ان کی اہمیت سب سے نمایاں اور سب پر مقدم ہو گئی۔

محمود سامی بارودی ایک چرکسی ترکی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حسن حسنی بک البارودی محمد علی کے زمانہ میں اچھے عہدوں پر فائز رہے۔ بارودی سات سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ ابتدا میں گھر میں تعلیم حاصل کی بعد میں ترکوں کی رسم کے مطابق بارہ سال کی عمر میں فوجی مدرسہ میں داخل ہو گئے اور عباس اول کے زمانہ میں سولہ سال کی عمر میں وہاں سے فارغ ہو کر نکل آئے۔ عباس اول کا زمانہ فوجی حیثیت سے ایک خاموش دور تھا جس میں فوجی زندگی کے حوصلہ مند نوجوانوں کے لئے کوئی راہ نہ تھی۔ بارودی نے بچپن ہی سے فوجی زندگی میں آنکھ کھولی تھی جب ان کے حوصلوں کے لئے میدان جنگ نہ ملا تو انھوں نے شاعری کی دنیا میں اپنے لئے میدان تلاش کر لیا اور فخر و شجاعت خاص کر ان کی تمناؤں کا مرکز بنے۔

واقعہ یہ ہے کہ بارودی کی فطرت میں شاعرانہ ملکہ چھپا ہوا تھا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بہت جلد شاعری میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مصر کی فضا ان کے حوصلوں کے لئے تنگ ہے تو وہ آستانہ دار الخلافت چلے گئے جہاں انھوں نے ترکی اور فارسی زبانیں سیکھیں اور بے شمار اشعار ان زبانوں کے یاد کر کے ان میں بھی شاعری شروع کر دی لیکن اصلاً عربی ہی میں کہتے رہے۔

جب اسمٰعیل بر سر حکومت آیا تو بارودی نے اس کے حوصلوں میں اپنی امنگوں کو جلوہ گر پایا اور ترقی کر کے فوج کے اعلیٰ عہدے پر پہنچ گئے۔ جزیرۂ کریت کی بغاوت کے دبانے کے لئے اسمٰعیل نے جو فوج روانہ کی اس میں بارودی بھی شریک ہوئے اور وہاں کے فوجی معرکوں کو بڑے ستھرے انداز سے شعر کا قالب پہنایا۔

جب ۱۸۷۷ء میں روس نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو مصر کی فوج میں بارودی بھی لڑنے کے لئے ترکی گئے اور (امیر اللواء) کا رتبہ حاصل کیا جنگ کی بہترین منظر نگاری انھوں نے اپنے اس دور کے اشعار میں پیش کی ہے۔

بعد میں جب اسمٰعیل کا زوال ہوا تو فواد اوّل کے زمانہ میں بارودی وزیر اوقاف مقرر ہوئے مگر اس وقت انھیں ایک مشکل کا سامنا کرنا پڑا اس لئے کہ بارودی اصلاح پسند طبقے کے ساتھ تھے۔ فواد اپنی حکومت سے پہلے خود بھی جمال الدین افغانی کے اصلاحی خیالات کو پسند کرتا تھا مگر جب برسر حکومت آگیا تو انگریزوں کے اشاروں پر ناچنے لگا اور جمہوریت کے بجائے مطلق العنانی اختیار کرلی۔ اس طرز عمل کا مصر کے آزادی پسند طبقہ پر ردّ عمل ہوا اور اس کے نتیجہ میں مصر میں اعرابی پاشا کی سرکردگی میں بغاوت رونما ہوئی اس موقع پر فواد نے بارودی کو وزارتِ دفاع سپرد کردی مگر وہ بھی کچھ نہ کرسکے اور بالآخر فواد کا زوال عمل میں آیا اور بارودی اپنے دوسرے رفیقوں کے ساتھ سراندیپ جلاوطن کردیئے گئے جہاں وہ سترہ سال قیام پذیر رہے۔ اسی جلاوطنی کے زمانہ میں بارودی نے انگریزی زبان سیکھی اور ایسے قصائد کہے جنھوں نے ان کو ابدی زندگی بخش دی۔

جلاوطنی نے انھیں زندگی کا سلیقہ سکھایا اور ان کے اندر رنج وغم سے ایک سوزِ دروں کی کیفیت پیدا ہوگئی جس نے عزت وحشمت کی گود میں آنکھیں کھولی ہوں وہ وطن سے دور غربت کی زندگی میں اپنے آپ کو مقید پاکر یقیناً ایک اضطراب کی کیفیت محسوس کرے گا۔ بارودی نے اپنے دوستوں عزیزوں اور اہل وطن میں سے بہتوں کے مرنے پر بہترین مرثیے لکھے ہیں وطن کی یاد میں بہت کچھ کہا۔ جوانی کی یاد، وطن کی دوری اور حالات کے تغیرا یسے بنیادی محرکات تھے جنھوں نے ان کی شاعری کو جلا بخشی۔ جلاوطنی کے زمانہ ہی میں وہ ضعفِ بصر وسماعت میں مبتلا ہوگئے

وہ خود کہتے ہیں:-

میں کیوں نہ اپنے شباب کا ماتم کروں ‏ ‏ کہ میں مشقت و غربت میں بوڑھا ہو گیا ہوں[1]

۱۹۰۰ء میں ان کو مصر واپس آنے کی اجازت مل گئی وہ خستہ حالت میں مصر پہنچے لیکن ان کے ہاتھ میں ایک دیوان تھا جو انھیں حیاتِ جاوداں بخشنے کا ضامن تھا چنانچہ انھوں نے ایک طرف اپنے دیوان کی تنقیح و تدوین کی اور جو اشعار پسند نہ آئے انھیں حذف کر دیا، دوسری جانب عربی شاعری کا ایک انتخاب پیش کیا جو مختارات البارودی کے نام سے شائع ہوا اور پھر ۱۹۰۴ء میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

بارودی کی نسبت اس طرح ہوئی کہ ان کے دادا "ایتای بارود" میں رہتے تھے جو کہ مصر کا ایک قصبہ ہے اس لئے ان کے والد بارودی کہلائے اور محمد سامی بھی اسی نسبت سے بارودی کے نام سے مشہور ہوئے خود بارودی کی ذہنی تربیت قطعاً غیر علمی ماحول میں ہوئی اور بچپن سے جنگ و جہاد میں زندگی بسر کی لیکن شاعری دراصل ان کی طبیعت میں اندر سے موجود تھی جو موقع پاکر ظاہر ہو گئی

احمد حسن زیات نے بارودی کی شاعری کے متعلق بڑے پتہ کی بات کہی ہے وہ لکھتے ہیں کہ "اگر امرؤ القیس کو شعر کی ابتدا میں سبقت حاصل ہے تو بشار بن برد کو ترتیب و تدوین کی فضیلت حاصل ہے اور بارودی کو (موجودہ دور میں) شعر کی تجدید و احیا کی شرف حاصل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ بارودی نے مصر کی ادبی فضا میں اپنے پرکیف نغموں سے ایک ادبی بیداری پیدا کر دی اور ادبی جمود جو برسوں سے سیاسی، معاشی اور معاشرتی اسباب کی بناپر اہل مصر پر طاری تھا اُسے دور کر دیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ عربی ادب کا باقاعدہ انھوں نے مطالعہ بھی نہ کیا تھا مگر ترکی فارسی اور انگریزی زبانوں کی تحصیل سے ان کے اندر وسعتِ خیال و نظر پوری طرح موجود تھی۔

بارودی نے انھیں اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی جو عصر عباسی میں رائج تھیں۔

---

[1] کیف لا ابکی ندا ب الشبا ب ‏ ‏ وقد اصبحت کہلا فی محنۃ واغترا ب

لیکن ان کے اندر ایک ایسی شاعرانہ کیفیت ملتی ہے جو انھیں بہت ممتاز بنا دیتی ہے وہ جاہلی شعراء کی طرح احساس و شعور کی سچی تصویر کشی پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تقلید کے ساتھ ساتھ تجدید کے بہت سے عناصر کارفرما نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کی پختگی پر دلالت کرتی ہے عربوں کے حوصلے، آرزوئیں اور امیدیں ان کے کلام میں جلوہ گر نظر آتی ہیں ان کا دیوان حریت، محبت اور مساوات کی ایک دل کش داستان ہے۔

بارودی کی قدامت پرستی:۔

ان کی شاعری میں وہ تمام اصناف شاعری نظر آتی ہیں جو عصر عباسی کے شعراء کے یہاں ہمیں ملتی ہیں یعنی مدح، ہجو، وصف، مرثیہ، عتاب اور فخر وغیرہ۔ وہ نہ صرف تقلید کرتے ہیں بلکہ کھنڈرات کا بیان، نجد کی وادیوں میں گم گشتگی اور دوسری روایتی چیزیں بیان کرنے میں بہت جری ہیں حالانکہ اس قسم کی شاعری کا دور گذر چکا ہے وہ عورتوں کے بیان میں انھیں پرانی تشبیہات کو لاتے ہیں جو اس دور کے لئے نامناسب ہیں اور ان کے اس طرز کے کلام کو پڑھتے وقت قاری کو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ کسی دوسرے دور کے شاعر کا کلام پڑھ رہا ہے کیونکہ بدیع و بیان کا استعمال بھی وہ قدماء کی طرح کر جاتے ہیں دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

چاند[1] کی طرح ہے اگر سامنے آئے (روشن ہو) اگر دیکھے تو ہرن ہے
اگر متحرک ہو تو ڈالی ہے اگر نغمہ خواں ہو تو بلبل ہے

اگرچہ بارودی نے قدماء کی تقلید کی اور ان کے موضوعات، معانی اور اسالیب کو اختیار کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار میں تجدید کا پہلو قریب قریب ہر جگہ موجود ہے، یہ تجدید ان کے شعور و مشاہدہ دونوں کی مرہون منت ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ہر صنف کو لے کر اس میں ان کے مرتبہ کو واضح کیا جائے

---

[1] کالبدر إن سفرت والظبي إن نظرت والغصن إن خطرت والزهر إن نفحت

تاکہ ان کی شاعرانہ شخصیت اُبھر کر سامنے آجائے۔

وصف:-

بارودی نے وصف کے بیان کرنے میں بڑی شاعرانہ مہارت سے کام لیا ہے انھوں نے بعض ایسے قصائد لکھے ہیں جن میں وصف ہی وصف نظر آتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ احساس کی لطافت، مشاہدہ کی صداقت اور ذوقِ جمال ہر جگہ کار فرما نظر آتا ہے جس کے ساتھ خود ان کی شخصیت بھی اپنے افکار و شعور کے ساتھ موجود نظر آتی ہے۔

فطرت کی ترجمانی میں بارودی ممتاز ہیں وہ جب بارش کی رات کی تصویر کشی کرتے ہیں تو مصوّر کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور بہترین تشبیہات پیش کرتے ہیں

اور ایسی رات جس میں زبردست بارش ہو اور برق تیز تلوار کے مانند چمکتی ہو
جس میں بادلوں نے اپنی چادر سے دور دراز گوشوں کو ڈھانک لیا ہو اور
متواتر اور شدید بارش ہو رہی ہو۔

دیہاتی زندگی کے بہت سے مناظر اور فطری کیفیات کی ترجمانی بارودی بڑے سلیقہ سے کرتے ہیں۔ اسی طرح جنگ کے حالات بھی اپنے قصائد میں بڑی کامیابی سے بیان کر جاتے ہیں۔

اسی طرح جیل کی تصویر کشی ان الفاظ میں کرتے ہیں

کوئی غم گسار نہیں جو شکوہ سن سکے نہ کوئی خبر آتی ہے اور نہ کوئی خیال
ایک تاریکی ہے جہاں کوئی ستارہ نہیں سوا آہوں کے شعلوں کے

وَليلة ذات تهتان واندبة ... كأنما البرق فيها صارم سلط
لف الغمام آفاقها ببردته ... وانهل في جريتها وابل سبط
لا أنيس يسمع الشكوى ولا ... خبر يأتي، ولا طيف يمر
ظلمة ما إن بها من كوكب
غير أنفاس تراءى بالشرر

نسیب:-

غزل میں بارودی قدما کے مقلد ہیں مگر عفت کو سب سے اہم سمجھتے ہیں ویسے بھی ایک فوجی آدمی کے یہاں ایک غزل گو کی رقت مشکل ہی سے پیدا ہو سکتی ہے، لیکن پھر بھی وہ محبت کا ایک متوازن نظریہ پیش کرتے ہیں۔

میں[۵] ایسا شخص ہوں کہ محبت جس کی نیادت کی مالک ہے اور صدق عہد ہی پر میری دنیا کا انحصار ہے۔

عشق[۵] ایک محترم شے ہے اگر نوجوان اس سے اپنا دامن پاک رکھے جس میں گمراہ ملوث ہو جاتا ہے

مرثیہ:-

بارودی نے مراثی کچھ زیادہ نہیں لکھے ہیں لیکن جتنے بھی لکھے ہیں ان میں دل کی گہرائی اور جذبات کی صداقت پوری طرح موجود ہے انھوں نے عبداللہ فکری، حسین المرصفی اور احمد فارس الشدیاق کے مرثیے بطور دوست کے لکھے ہیں، چند شعر اس مرثیہ کے ملاحظہ ہوں جو انھوں نے اپنے لڑکے کی وفات پر کہا تھا

اے[۵] میرے بیٹے! موت نے کس طرح تجھے لپیٹ لیا اور کیسے میں نے تجھے اپنے ہاتھوں سے دفن کیا۔

اے علی تیرے بعد مجھ پر افسوس ہے کاش کہ میری پیاس بجھ سکتی

مدح:-

بارودی نے اسمٰعیل توفیق اور عباس کی مدح کی ہے اور اس میں خاص طور سے

انی امرؤ ملک الوداد قیادتی	وجری علی صدق العهود وفائی
والعشق مکرمة ذاعف الفتی	عما یهیم به الغوی الا صور
کیف طوتک المنون یاولدی	وکیف اودعتک بیدی
واکبدی یا علی بعدک لو	کانت تبل الغلیل واکبدی

شورائیت پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر کوئی بھی والی ملک بغیر شوریٰ کے ملک و ملت کا کام انجام دیتا ہے تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بارودی کی مدح میں غلو اور تملق کی باتیں نہیں ملتیں وہ شاعری کو پیشہ نہیں سمجھتے تھے مذکورہ بادشاہوں کی شان میں جو کچھ کہا ہے وہ ان کے شکریہ کے طور پر ان سب کی نظر عنایت بارودی پر رہی وہ شعر کے متعلق خود کہتے ہیں

شعر[54] انسان کی آرائش کا ذریعہ ہے جب تک کہ وہ مدح و ذم کا وسیلہ نہ بنے

سیاسی و وطنی شاعری

دراصل یہ وہ صنف شاعری ہے جس میں بارودی کی شخصیت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے اور ان کی شاعری کی جدت کا مظاہرہ بھی اسی صنف میں ہوتا ہے۔ ان کے خیالات کی بلندی، مساوات پسندی اور انصاف کی تمنا نیز ایک حریت پسند طبیعت کا اظہار بھی انھیں نظموں سے ہوتا ہے۔ وہ ذلت کی زندگی کو موت پر ترجیح دیتے ہیں اور صاف الفاظ میں کہتے ہیں

جو دنیا میں موت سے ڈرتا ہو ذلت اس کے لئے چھوڑ دو۔ تکلیف دہ زندگی سے موت بہتر ہے

وہ ظلم کے خلاف تھے اور اہل دنیا میں آزادی و مساوات دیکھنا چاہتے تھے اصلاح ان کی شاعری کا سب سے بڑا محرک ہے بارودی ہی نے دراصل حافظ کے لئے وطنی شاعری کی راہ ہموار کی۔ ان کی شاعری سے مصری زندگی کے واقعات صاف نظر آتے ہیں اور ان کے پس منظر کے بغیر بہت سے ایسے قصائد ہیں جو سمجھے نہیں جا سکتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بہت سی آرزوؤں میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

---

[54] الشعر زین المرأ ما لم یکن   وسیلة للمدح والذم

دع الذل فی الدنیا لمن خاف حتفه

فالموت خیر من حیاة علی أذی

افسوس ہے اس خواہش پر جس کا قلب متمنی رہا اور رہا تھا اس کے حصول سے قاصر رہے

وہ اہل مصر کو حریت کے لئے جد وجہد کرنے پر اس طرح ابھارتے ہیں

اے قوم! اٹھو عمر ایک موقع ہے زمانہ میں بے شمار راستے ہیں اور منافع ہیں

یا برباد ہو جاؤ یا جنگ کرو حتٰی کہ ذلت سے نجات مل جائے۔

مصر میں جو بغاوت ہوئی اور جس کے نتیجہ میں بارودی کو جلاوطنی ملی ان سب کا ذکر وہ اپنی شاعری میں کرتے ہیں اور اپنی ذات سے یہ اتہام بھی دور کرتے ہیں کہ وہ ریاست کے خواہاں تھے پھر وہ اہل مصر کی برائی اور دھوکہ بازی کا ذکر کرتے ہیں

برے ساتھی ہیں اور مصر برا ملک ہے کہ وہ جھوٹوں اور دھوکہ بازوں کا مرکز بن گیا ہے

بارودی پر ممکن ہے یہ الزام صحیح ہو کہ وہ ظلم کے خلاف اپنی دعوت میں مخلص نہ تھے بلکہ عہدوں کے متلاشی تھے بہر حال اس کی صحت وغیر صحت کی بحث میں پڑے بغیر یہ ایک حقیقت ہے کہ وطن کا نغمہ اور سیاسی مسائل کی ابتدا دور جدید میں سب سے پہلے بارودی کے یہاں ہمیں ملتی ہے۔ مصر کی حریت قومی کے مسائل کا احساس، آزادی کی تڑپ بارودی کی شاعری کی جان ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے مصر اللہ تیرے سائے کو دراز کرے تیری سرزمین کو نیل کی موجوں سے سیراب کرے

مصر کی تعریف کے بعد اپنی جلاوطنی اور اس کے نتیجہ میں غم کا بیان کرتے ہیں۔

---

۴ ویلاه من حاجة فی النفس هام بها قلبی، وقصر عن ادراکها باعی

۵ فیا قوم هبوا انما العمر فرصة وفی الدهر طرق جمة ومنافع

فکونوا حصیدا خامدین اوافزعوا الی الحرب حتّی یدفع الضیم دافع

۶ بئس العشیر وبئست مصر من بلد اضحت مناخا لاهل الزور والخدع

فیا مصر امدّ الله ظلك وارتوی ثراك بسلسال من النیل دافق

[۵] اہلِ مصر سے چھٹنے کے بعد میں نے زندگی کی لذت کو چھوڑ دیا

اور ساتھ ہی جوانی کی رعنائیوں کو بھی الوداع کہا

بارودی کی شاعری ان کے ضمیر کی آواز ہے انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ جاہلی و عباسی دور کی شاعری پہ اس زمانہ میں بھی قدرت حاصل کی جا سکتی ہے انھوں نے نابغہ ابونواس اور ابو فراس وغیرہ کے طرز پہ ہزاروں اشعار کہے ہیں جس سے عربی شاعری پہ ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تقلید بذات خود کوئی عیب نہیں بارودی کی تقلید میں آورد کا پتہ نہیں آمد ہی آمد نظر آتی ہے۔ بارودی دورِ جدید کی شاعری میں ایک نشانِ منزل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک غیر معمولی شاعرانہ قدرت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور تشبیہہ و استعارات میں دوسرے شعراء پر انھیں فوقیت حاصل ہے۔

بارودی عصرِ جدید کا وہ عظیم شاعر ہے جس سے شاعری میں تجدید کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نے اپنے دور کو جو کچھ دیا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو کہ اس کو اس کے زمانہ نے دیا تھا۔ صرف سیاسی شاعری کے میدان ہی کو لے لیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ایسی راہ تھی جس کو کسی گذشتہ شاعر نے اختیار نہیں کیا تھا۔ نہ صرف معانی کے اعتبار سے بارودی ایک ممتاز شاعر تھا بلکہ الفاظ کے انتخاب اور شعر کی موسیقی کا بھی وہ دلدادہ تھا۔

---

[۵] هجرت لذيذ العيش بعد فراقهم

وودعت ريعان الشباب الغرانق

ابتدائی دور کے سیاسی ادارے

جناب سید جعفر رضا بلگرامی

انسانی ارتقاء محض جسمانی نشو و نما کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی طرزِ زندگی بھی ہے جس میں سماجی تقاضے اور اُس کی پابندیاں فرد کے طرزِ عمل کو درست کرتی ہیں۔ انسانی ارتقاء کا یہ سماجی پہلو جسمانی نشو و نما سے کہیں بہتر ہے کیونکہ یہیں سے انسانی تہذیب کی بنیاد پڑتی ہے۔

قبیلہ بنا کر رہنا انسانی فطرت ہے۔ کبھی اچھے عادات و اطوار پر انعام دے کر اور کبھی بُرے برتاؤ پر سزا دے کر انسان کو سماجی پابندی سکھائی گئی۔ اسی قید و بند نے اُس کو دوسروں کی خواہشات کا احترام سکھایا۔ اس لئے یہ پابندیاں اُتنی ہی پُرانی ہیں جتنا کہ خود انسان۔ اپنے ابتدائی دور میں انسان نے جن سماجی پابندیوں کو اپنا لیا تھا وہ آج تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

حکومت بھی ایسی ہی ایک سماجی پابندی ہے جو قبیلہ کی طرف سے فرد پر عاید ہوتی ہے۔ افراد کا قبیلہ سے لگاؤ جذباتی ہے جو سمجھا تو نہیں جا سکتا لیکن محسوس ضرور کیا جاتا ہے اور یہی احساس فرد کو قبیلہ کی خدمت کیلئے ہمہ تن مستعد رکھتا ہے۔ قبیلہ کے نام پر متحد ہو کر کام کرنے کی یہ لگن انسان کی بہت بڑی اختراع ہے کیونکہ اسی نے حب الوطنی کا جذبہ پیدا کیا جس پر آج بھی بڑی سی بڑی حکومت کی طاقت کا انحصار ہے۔

ابتدائی دور میں قبیلہ کا وہ سن رسیدہ فرد جو بہادری، مستعدی، ہمدردی، فیاضی اور صبر و تحمل میں یکتا ہوتا تھا "بزرگ" مانا جاتا تھا اگرچہ اُس کو عملی طور پر اختیارات حاصل نہ تھے لیکن قبیلہ کے افراد صلاح و مشورہ کے لئے اسی کے پاس جمع ہوتے تھے کیونکہ وہ جملہ بزرگانہ خصوصیات کے علاوہ قبیلہ کی تمام روایات کا واحد سرپرست بھی سمجھا جاتا تھا اس کی ہستی قبیلہ میں اس قدر باعثِ احترام تھی کہ لوگ اس کو دیوتاؤں کے خطابات سے مخاطب کرتے تھے۔ اگرچہ "سیاسی اختیارات" اور "روحانی طاقتوں" کی یہ مماثلت ذہنی انتشار کا سبب بنتی تھی لیکن دیوتاؤں کے خطابات سے بزرگوں کو مخاطب کرنے کے اسی طریقے سے درحقیقت "حکومت ربانی" کی بنیاد پڑی۔

۱۔ حکومت ربانی ابتدائی دور میں سیاسی ادارے مذہبی پیشواؤں کے زیرِ حکومت رہنے کی وجہ سے مذہبی بنیادوں پر قائم تھے جب تک مذہب "توہم پرستی" کی منزلوں سے آگے نہ بڑھا تھا یہ سیاسی ادارے بھی ایک "جادو" سمجھے جاتے تھے جس میں حکمران کی حیثیت ایک شعبدہ باز سے زیادہ نہ تھی بعد میں جب دیوتاؤں کی خوشی اور نفرت پر زندگی کی خوش حالی اور تباہی کا عقیدہ پیدا ہوا تو سیاسی ادارے بھی "حکومت ربانی" بن گئے جس کے حکمران یا تو سمیرین تہذیب کے مطابق دیوتا کے نمائندے یا مصری تہذیب کے مطابق بذاتِ خود دیوتا ہوتے تھے۔ آخر میں جب خدا کی وحدانیت کا تصور پیدا ہوا تو یہ ادارے بھی دیوتاؤں کی منزلوں سے گزر کر کسی اَن دیکھی روحانی طاقت سے منسلک کر دیئے گئے۔ سیاسی اداروں کا یہ روحانی تصور "حکومت ربانی" کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل تھی۔

۲۔ قوانین ابتدائی دور میں قوانین کی موجودگی کے چار اسباب بتلائے جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اوزاروں کے استعمال اور آبپاشی کا معقول انتظام ہونے کی وجہ سے زراعت افراد کی ضرورتوں سے زیادہ ہونے لگی تھی۔ بچت کی تقسیم، کسان و مزدور کا زمین و زمیندار سے رشتہ اور بچی جائے داد کے حقوق اور پھر اس سے متعلق جرائم کیلئے کسی نہ کسی قانون کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سمیرین اور مصری تہذیبوں میں قوانین زیادہ تر زمین کے متعلق نظر آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تجارت کی ترقی، بازاروں میں چیزوں کی تبدیلی اور غیر ملکیوں کے آنے جانے کی وجہ سے گاؤں سے آبادی کھنچ کر قصبوں اور شہروں میں چلی آئی تھی۔ ان نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کسی نہ کسی قانون کی ضرورت تھی۔ تیسرے یہ کہ جو غیر ملکی تاجر یا غلام شہر میں آکر آباد ہو گئے تھے وہ نہ تو اب اپنے وطن کے قوانین کے پابند تھے اور نہ اس شہر کے رسم و رواج کی پابندی کے لئے تیار تھے۔ اُن کی پوزیشن متعین کرنے کے لئے کسی نہ کسی قانون کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چوتھے یہ کہ جب فوجی حکومتیں قائم ہوئیں تو اُنھوں نے قوانین کو مذہبی پیشواؤں کے مقابلہ میں اور زیادہ سختی سے مسلط کیا۔ اِسی زمانے میں تمام قوانین کو ترتیب دیدیا گیا جس سے کہ اُن میں ایک تسلسل اور سخت گیری آگئی۔

سماج جو اب تک ریت رواج کی پابندی تک محدود تھا ان قوانین سے ایک نئے انصاف کے مفہوم سے روشناس ہوا انھیں قوانین کی بدولت پہلی بار یہ روایتی سوسائٹی "سول سوسائٹی" بن گئی لیکن جہاں ان قوانین نے انصاف کے نئے مفہوم سمجھائے وہاں بے انصافی کے لئے نئی راہیں بھی پیدا کیں۔ کیونکہ ایک بار بھی اگر بے انصافی قانون کا لباس پہن لیا تو وہ بظاہر اسے انصاف ہی سمجھا جانے لگا۔ حمورابی کے قوانین میں پہلی بار اسکے پھاؤ کی

تدبیر ملتی ہے۔ اُس نے اپنے وضع کئے ہوئے قوانین میں انصاف کی چار مندرجہ ذیل بُنیادیں مانی ہیں:۔

۱۔ سوسائٹی کے تمام طبقوں کی قانونی حیثیت۔

۲۔ مجرم سے جُرم کا بدلہ لینے کی قانونی اجازت

۳۔ خاندان میں باپ کی مطلق العنانیت ۔ اور

۴۔ نجی جائیداد کے حقوق ۔

حمورابی نے یہ قوانین مرتب کر کے سوسائٹی کو پہلی بار آہنی سانچہ میں ڈھالا۔ مُلک کا ایک آئین بن جانے کی وجہ سے وہ نظام جو ابھی تک نیم سماجی اور نیم سیاسی حالت میں تھا مکمل طور پر ایک سیاسی ادارے میں تبدیل ہو گیا کیونکہ بکھری ہوئی سماجی روایات اب حکومت کے قوانین بن چکی تھیں۔

اگرچہ اِبتدائی دَور کے قوانین سماجی و معاشی تقاضوں کا نتیجہ تھے لیکن یہ سب اُس وقت خدائی احکامات سمجھے جاتے تھے یا کم از کم ان میں دیوتاؤں کی مرضی شامل حال سمجھی جاتی تھی۔ حمورابی کے قوانین کے پیچھے بیبی لون کے "مردُوک" دیوتا کی مرضی شامل ہوتی تھی۔ اِسی طرح مِصری قوانین "ری" کے تسلیم شُدہ مانے جاتے تھے۔ کورٹ میں بیٹھنا فرعون اپنی سب سے بڑی عزت سمجھتا تھا۔ مِصری ججوں کا ہمیشہ مذہبی مزاج رہا۔ ایک زمانہ تک مِصر کا سب سے بڑا جج سچائی کی دیوی کی تصویر اپنے سینہ پر لٹکائے رکھتا تھا اور اُس کے ماتحت جج "تھوتھ" دیوتا کو جو ایک "آئیڈیل جج" مانا جاتا تھا اپنا رہنما سمجھتے تھے۔ سمیرین، بیبی لونین اور اسیرین تہذیبوں میں اِسی قسم کے خیالات نظر آتے ہیں۔ جب تک قوانین کی بُنیاد مذہب تھی سوسائٹی کا کریکٹر سیکولر نہ ہو سکا۔

۴۔ نظامِ سلطنت سُمیرین اور مِصری مملکتیں اِنتظامی اُمور کے لئے مرکزی اور صوبائی حکومتوں اور ضلعوں میں تقسیم کر دی گئیں تھیں۔ مرکزی حکومت "شاہی دربار" پر مشتمل تھی جس میں خزانہ اور فوج کے افسرِ اعلیٰ مذہبی پیشوا اور شاہی خاندان کے معتبر افراد شامل ہوتے تھے یہی مُلک کے انتظامی اُمور کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ان کے اختیارات آبپاشی، زراعت اور تجارت پر تھے ٹیکس وصُول کیا جاتا تھا۔ فوج کے قیام کے لئے کنٹونمنٹ بنے تھے۔ عدالتیں قائم تھیں۔ صُوبائی حکومت چھوٹے پیمانہ پر انھیں انتظامات کی نگراں ہوتی تھی۔ کبھی یہ مرکزی حکومت سے آزاد بھی ہو جاتی تھی۔ ضلعوں کا انتظام ضلع افسران کے سُپرد تھا جن کا مخصوص کام ٹیکس وصُول کرنا تھا۔ عدالتیں افسران کے ظلم یا قانونی خلاف ورزی کے متعلق مُقدموں کا فیصلہ کرتی تھیں۔ اِس طرح جاگیرداروں، مذہبی پیشواؤں اور

افسران کے طبقوں نے مل کر سیاسی اداروں کے تنظیمی ڈھانچہ کو مکمل کیا۔ ان "نیم مذہبی اور نیم تنظیمی" اداروں کا واحد سرپرست بادشاہ ہوتا تھا جو مطلق العنان تھا۔ جس کے اختیارات قدرتی تھے، جس کی ذات مقدس تھی، جس کے احکامات قوانین تھے اور جو اپنی رعایا کی جان و مال کا مالک و مختار تھا۔

۴۔ **ٹیکس** سالانہ پیداوار کا ایک مقررہ حصّہ بطور ٹیکس حکومت کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ حکمران ملک کی ساری زمین کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ کاشتکار بادشاہ کو ٹیکس دے کر گویا اُس کا حق ملکیت ادا کرتے تھے۔ حمورابی کے زمانہ میں بیبی لون کے کاشتکار اپنی فصل کا ایک تہائی حصّہ جاگیرداروں کو ادا کرتے تھے۔ مصر میں فصل کا پانچواں حصّہ بطور ٹیکس ادا کرنے کا رواج تھا۔ وہاں ایک ٹیکس رجسٹر بھی رہتا تھا جس میں کاشتکاروں کے ٹیکس کی ادائگی کا اندراج ہوتا تھا۔ سارا مصر پچاس اضلاع میں تقسیم تھا جہاں سے اشیاء کی شکل میں ٹیکس وصول کیا جاتا تھا مقامی ٹیکس کلکٹر "وزیرخزانہ" کے سامنے ماہانہ رپورٹ پیش کرتا تھا۔ خزانہ کے دو شعبے ہوا کرتے تھے ایک جانوروں کا باڑہ اور دُوسرا اناج گودام۔

دراصل اگر دیکھا جائے تو ان حکومتوں کی ٹیکس کی پالیسی غیر منصفانہ تھی۔ مملکت میں مذہبی اور فوجی طبقہ معاشی بچت کو ٹیکس کی صورت میں عوام سے وصول کر کے حکومت تک پہنچانے کا کام کرتا تھا۔ حکومت اس طبقہ کے ذریعہ معاشی بچت میں نمایاں ترقی کراتی تھی اِس سے حکومت کے خزانہ میں ضرور اضافہ ہوتا تھا لیکن اِس بچت میں کاشتکاروں کا کوئی حصّہ نہ ہوتا تھا۔

حکومت کی آمدنی کا دوسرا ذریعہ بیگار تھا۔ ہر سال کاشتکار پلوں اور نہروں کی مرمت کے لئے بلائے جاتے تھے۔ مندر، مقبرے، محل اور قلعہ سب بیگار میں بنوائے جاتے تھے۔ تجارت نے دو نئے ذریعہ آمدنی دریافت کیے۔ ایک کسٹم اور پورٹ ڈیوٹی اور دوسرے کانوں اور کارخانوں کی آمدنی۔ مصر میں سونے اور تانبہ کی کانیں حکومت کے قبضہ میں تھیں۔ زراعت تجارت اور صنعت و حرفت کا انتظام حکومت کرتی تھی۔ غیر ملکی ہنرمندوں اور تاجروں کو لائسنس دیے جاتے تھے۔ کاشتکار انسپکٹروں کی ہدایات کے مطابق زمین جوتتے تھے۔ قریط میں کپڑے کے کارخانے بادشاہ کے ماتحت تھے۔ اسیریا کی ہر لڑکی بادشاہ کے کتائی و بنائی کے کارخانے میں کام کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ معاشی زندگی پر حکومت کا اتنا کنٹرول "اسٹیٹ کیمونزم" جیسا تھا۔

۵۔ پولیس ابتدا میں پولیس بادشاہوں کے باڈی گارڈ کی حیثیت سے مقرر ہوئی تھی۔ مملکتوں میں فوجی طاقت کے ساتھ ہی پولیس کی ذمہ داریاں بھی بڑھیں۔ جو علاقے فتح کی جاتی تھیں اُسکی آبادی کو پولیس کے کنٹرول میں رکھا جاتا تھا تاکہ وہ بغاوت نہ کرسکیں۔ مصریوں نے تمام ایشیائی ریاستوں میں فوجی توپ خانہ رکھے تھے جن کی حفاظت پولیس ہی کرتی تھی۔ اسیرین نے اِن ذمہ داریوں کے علاوہ ناپسندیدہ آبادی کو جو مُلک سے باہر نکال دینے کا کام بھی پولیس ہی کے سُپرد کر رکھا تھا۔ مصر میں فوج اندرونی امن وامان کے لئے بحیثیت پولیس کے کام کرتی تھی۔

۶۔ مُلوکیت وشہنشاہیت ڈھائی ہزار سے تین ہزار سال قبل مسیح کا زمانہ آپس کی خانہ جنگیوں سے جس میں سمیرین مملکتوں کے عروج وزوال کا لا متناہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ یہ جنگیں اکثر زمین یا پانی پر قبضہ جمانے کے لئے ہوا کرتی تھیں۔ کبھی دریا اپنا رُخ بدل لیتا تھا جو جھگڑے کا باعث بن جاتا تھا چونکہ ایک زرعی سوسائٹی میں کسی مملکت کا دوسرے کی زمین وپانی پر قبضہ اُس مملکت پر گویا حکومت کرنے کے مترادف ہوتا تھا اِس لئے اِن جنگوں کو محض فرقہ وارانہ فسادیا قبیلوں کے آپسی جھگڑے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اُس زمانہ کی تمام خانہ جنگیاں سماجی اور معاشی کشمکش کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ اور یہی دراصل "ملوکیت" اور "شہنشاہیت" کی اِبتدا تھی۔

مصری تہذیب میں بھی مختلف "نوموں" میں اغراض ومقاصد کے لئے جنگیں ہوئیں۔ پھر اِن مقاصد کی یک جہتی نے اُن سب کو مِلا کر ایک بڑی مملکت میں تبدیل کر دیا۔ اِبتدا میں اسی طرح مختلف نوموں سے مل کر "سیس" اور "بوٹو" نام کی مملکتیں قائم ہوئیں۔ "بوٹو" میں قبائلی حکومت بہت جلد شہنشاہیت میں تبدیل ہوگئی ڈیلٹا کی بڑھتی ہوئی تجارت نے ایک وقت میں پورے علاقہ کو ایک مملکت میں تبدیل کر دیا تھا۔ اِسی طرح شمال میں زراعت کی حفاظت نے اِن میں یک جہتی پیدا کر دی تھی۔ کبھی کبھی تو یہاں تک ہوا کہ دونوں علاقے کسی مشترک خطرہ یا فائدہ کی غرض سے ایک ہوگئے لیکن یہ اتحاد ہمیشہ وقتی رہا۔ زراعتی اور تجارتی رقابت نے اِن دونوں علاقوں کو کبھی مستقل طور پر متحد نہ ہونے دیا۔

اِس طرح شہنشاہیت اِنسانی سماج کی سب سے پہلی طرزِ حکومت قرار پائی جو دراصل مذہبی، معاشی، تاریخی اور سماجی تقاضوں کا ایک ناقابلِ فراموش نتیجہ ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے سیاسی اقتدارات کی روحانی

حیثیت نے رعایا کو بادشاہ کے تابع رکھا۔ ابتدائی دور میں بادشاہ اور رعایا کے ایسے ہی مضبوط رشتے اور مملکت میں ایسے ہی استحکام کی ضرورت تھی جس کو بغیر مذہبی عقاید کی شمولیت کے پورا نہ کیا جا سکتا تھا۔ معاشی میدان میں آبپاشی کا معقول انتظام ہونے اور زراعتی اوزاروں کے استعمال کی وجہ سے پیداوار ضرورت سے زیادہ ہوئی۔ پسماندہ دولت کی تقسیم اس وقت کا ایک اہم سوال تھا جس کا حل شہنشاہیت ہی میں ممکن تھا۔ تاریخی اعتبار سے جاگیرداروں اور کسانوں کے درمیان حیثیت کی تفریق پیدا ہو چکی تھی۔ اس خلاء کو پُر کرنے کی ضرورت نے شہنشاہیت کی بُنیاد ڈالی۔ سماجی اعتبار سے دولت مند مالک و مختار بن بیٹھے اور باقی رعایا کو دولت سمیٹنے کا ایک آلۂ کار بنا لیا۔ اس امیری و غریبی کی نازک صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے شہنشاہیت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس طرح ابتدائی دور میں شہنشاہی طرزِ حکومت مذہبی، معاشی، تاریخی اور سماجی تقاضوں کی ایک فطری پیداوار کہی جا سکتی ہے۔

ثانوی اساتذہ کی تعلیم کا توسیعی پروگرام

مرکزی ڈائریکٹریٹ توسیعی پروگرام' کے ذریعے مختلف عنوان سے ثانوی مدارس کے اساتذہ کو فنی امداد پہنچائی جارہی ہے اور ان کے علم کو تازہ رکھنے کے مواقع بڑھانے کی کوشش برابر جاری ہے۔ اس زمانے میں سائنس کے اساتذہ کی تربیت کے لئے خصوصی انتظامات کئے گئے ہیں۔ اسی غرض سے گذشتہ سال تعطیلات گرما میں چار حصوں میں سائنس اور ریاضی کا ایک نیا انتظام عمل میں آیا۔ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن' اور نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ' نے امریکہ کے تعاون سے چار مضامین کی تعلیم کا انتظام کیا۔ یہ چار چھ ہفتے تعلیمی پروگرام "تعطیلات گرما کی تعلیمی مجالس" (سمر انسٹی ٹیوٹ) کے عنوان سے چلایا گیا۔ پونا میں کیمسٹری' دہلی میں فزکس اور ریاضی اور مدراس میں بیالوجی کی مجالس قائم ہوئیں۔ ثانوی مدارس کے ڈیڑھ سو سے کچھ زائد منتخب اساتذہ نے اُن سے استفادہ کیا۔

سائنس کی روز افزوں ترقی نے نہ صرف سائنس کی اہمیت کو روزانہ زندگی میں بڑھا دیا ہے بلکہ سائنس کے اساتذہ کے لئے اپنی معلومات میں برابر اضافہ کرتے رہنے کی ضرورت کو بھی بخوبی واضح کر دیا ہے۔ سائنس کی تعلیم موثر اور موفر ہو ہی نہیں سکتی تا وقتیکہ سائنس کا استاد' سائنس کی نئی معلومات کا درک نہ کرے۔ اب یہ احساس خوب ہو چکا ہے کہ سائنس میں جو کچھ اور جس طرح پڑھایا جا رہا ہے' بڑی حد تک نئے تقاضوں کی روشنی میں ردّ و بدل چاہتا ہے۔ ہمارے ثانوی مدارس کے اساتذہ کو اپنے علم کو جلا دینے کے مواقع بہت کم میسر آتے ہیں۔ لہٰذا "تعطیلات گرما کی تعلیمی مجالس" کی شکل میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک یونیورسٹی یا کا

میں سائنس کے متعدد اساتذہ کو جمع کر دیا گیا ۔ وہاں نئی نئی درسی کتب اور بہتر توضیحی سامان فراہم کیا گیا اور لائق اساتذہ کی زیر ہدایت تجربے کرائے گئے ۔ اس طرح ثانوی مدرسے اور کالج کے اساتذہ کو بھی ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع نکل آیا ۔ ان تعلیمی مجالس کے مقاصد میں مدارس اور یونیورسٹیوں کے مابین رابطے کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے اور ثانوی مدارس کے اساتذہ کو مضمون خصوصی کے بنیادی تصورات کا صحیح ادراک حاصل کرانے کی اہمیت پر پورا زور دیا ہے ۔ اساتذہ کو خود سامان بنانے اور تجربے کرنے کے مواقع فراہم کرنے کی طرف توجہ دی گئی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اساتذہ اپنے اثر سے طلبہ میں تحقیقی کام کی لگن پیدا کرنے کے اہل بن جائیں ۔ اساتذہ میں اپنے مضمون کا ذوق و شوق ابھارنا اور آپس میں تبادلۂ خیال کرنا بھی ان مجالس کے مقاصد میں شامل ہے ۔

ان مقاصد کے تحت امسال کا پروگرام قدرے بڑے پیمانے پر مرتب کیا گیا ہے ۔ اس مرتبہ ۱۶ اجلاس کا انتظام ہوگا تاکہ ہر ایک سمت میں کئی کئی جگہوں پر کام ہو سکے ۔ ہر ایک ریاست سے دس منتخب مدارس کے سائنس اور ریاضی کے اساتذہ کو شریک کرنے کی تجویز ہے ۔ ہر ایک مرکز پر ایک پروفیسر کو مجلس کا ڈائرکٹر مقرر کیا جائے گا جو تین چار مددگار اساتذہ کے تعاون سے سارا پروگرام عمل میں لائے گا ۔ امریکہ کے چند معروف سائنس داں اور ماہرانِ تعلیم بھی ان مجالس میں شرکت کی غرض سے اسی زمانے میں امریکہ سے ہندوستان تشریف لائیں گے ۔ اس موقع پر امریکہ میں تیار شدہ سائنس کے جدید سامان کا استعمال خصوصیت کے ساتھ بتایا جائے گا ۔ ان مجالس کے لئے پانچ سال سے دس سال تک کے تجربہ کار اساتذہ منتخب کئے جائیں گے اور ان کے تمام اخراجات کو حکومت برداشت کرے گی ۔

ان اقدامات کی افادیت بالکل واضح ہے مگر یہ سب پہلے قدم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ وہ بھی ایک ہلکا قدم ! اس قسم کے مواقع صرف سائنس اور ریاضی کے اساتذہ کے لئے ہی ضروری نہیں ہیں بلکہ زبانوں کی تعلیم اور سماجی علوم کے اساتذہ کو بھی اسی قدر رہنمائی درکار

ہے۔ آج مادری زبان، قومی زبان، علاقائی زبان اور انگریزی زبان اپنی اپنی جداگانہ حیثیتوں سے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی اپنی نئی نئی ضرورتیں اور نئے نئے مسائل ہیں۔ اسی لحاظ اور اندازے سے اُن کا مقام متعیّن کرنے اور طلبہ کو درس دینے کا سوال ہے۔ اس غرض سے زبانوں کے اساتذہ کی خصوصی تربیت درکار ہے۔ اسی طرح سماجی علوم کا تصور ابھی ہمارے اساتذہ کو پوری طرح ذہن نشین نہیں ہو پایا ہے۔ معیاری درسی کتابیں بھی موجود نہیں ہیں۔ عموماً جغرافیہ، تاریخ اور علمِ تمدّن کی تھوڑی تھوڑی باتوں کو علٰحدہ علٰحدہ بنا کر سماجی علوم کی تعلیم کا حق ادا کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ان مضامین کی بھی مجلس منعقد ہونی چاہئیں۔ مزید برآں محض اشک شوئی کافی نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے دیس میں مڈل اسکولوں میں تقریباً ۶۵ فی صدی اساتذہ تربیت یافتہ (ٹرینڈ) ہیں اور ثانوی مدارس میں تقریباً ۶۸ فی صدی۔ اب تک کے اندازے کے مطابق تیسرے قومی منصوبے کے اختتام پر ان تمام مدارس میں تربیت یافتہ اساتذہ کا تناسب ۷۵ فی صدی ہو جانے کی امید ہے اس صورت میں یہ صاف ظاہر ہے کہ کتنی بڑی تعداد درس و تدریس کے طور طریقوں سے نابلد ہے اور کتنے بہت سے اساتذہ نئی روشنی سے قطعی محروم ہیں۔ چوتھے قومی منصوبے میں ثانوی منزل پر تعلیمی سہولتوں کی فراہمی کے پیشِ نظر تقریباً اب سے دوگنے اساتذہ درکار ہوں گے۔ ان نئے اساتذہ کی تربیت کا انتظام ایک بہت بڑا مسئلہ ہوگا اور تاوقتیکہ ابھی سے پرانے اساتذہ کو مختلف طور پر نئے تعلیمی رجحانات سے استفادہ نہ کرا لیا جائے، اُس وقت تو یہ کام اور دشوار ہو جائے گا۔ تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لئے سب ہی اساتذہ کو تعلیم کے نئے میلانات سے روشناس کرانا ضروری ہے تاکہ دورِ حاضر کے تعلیمی تقاضوں کو وہ بخوبی پورا کر سکیں۔ اس غرض سے ایک بڑے پیمانے پر مختلف مضامین کی تعلیمی مجالس کا انتظام کرنے کی ضرورت ہے۔

اساتذہ کی کارکردگی اور استعداد بڑھانے کے لئے ان تعلیمی مجالس کے علاوہ دوسرے ذرائع بھی برتنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً سہ پہر کو کام کے اوقات کے بعد اساتذہ کی اعلیٰ تعلیم کا

انتظام ہونا چاہیے جو شہروں میں اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں موجود ہیں وہاں ایسے مواقع فراہم کرنے میں آپ کسی تکلف یا تامل سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح ڈاک کے ذریعے تعلیمی مشاغل کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ یہ تجربہ دنیا کے مختلف ممالک نے کیا ہے اور آج بھی بہت سی جگہ ایسے نصاب جاری ہیں۔ اس طرح کچھ نہ کچھ فائدہ بہرحال پہنچ جاتا ہے اور جس کے دل میں لگن ہوتی ہے وہ ان سہاروں سے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھا ہی لیتا ہے۔ روس میں اساتذہ کی تعلیمی سطح کو بلند کرنے کے لئے اِن ذرائع کو بھی خوب اپنایا گیا ہے اور اُن کی افادیت میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہا ہے۔ وہاں ۵۸ - ۱۹۵۷ء کے تعلیمی سال میں سائنس کے کارکنوں کی تربیت کے مواقع بڑھانے پر خصوصی طور پر توجہ کی گئی۔ اساتذہ کو اپنی استعداد بڑھانے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے با تنخواہ تعلیمی رخصت کی سہولت اور دیگر مراعات فراخ دلی کے ساتھ دی جانے لگیں۔ ایسے کلب اور تعلیمی مرکز وجود میں آ گئے جہاں اساتذہ اپنے علم کو فروغ دینے کے لئے جمع ہونے لگے۔

لیکن کسی ملک کی ترقی صرف سرکاری احکامات اور امداد کے ذریعے ممکن نہیں۔ ان معاملے میں روس کے اندر بھی اساتذہ کی انجمنوں نے اپنے منصب کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے اساتذہ میں فرض شناسی کا احساس بیدار کیا ہے اور اُن کو پورے طور پر مفید بنانے کی ذمہ داری خود اٹھائی ہی ہمارے اساتذہ پر بھی اس باب میں بڑی ذمہ داری آ جاتی ہے۔ ابھی تک ہمارے اساتذہ کی انجمنوں نے اپنی سرگرمیاں قوتِ لایموت کے مسئلے تک ہی محدود رکھی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بغیر رزق کے زندگی ممکن نہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ صرف رزق ہی زندگی نہیں۔ ہماری انجمنوں کو اپنی نمائندگی کا پورا پورا حق ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ مقامی انجمن سے لے کر ریاستی اور مرکزی انجمنوں تک ہمارا ایک سلسلہ اس ربط و ضبط کے ساتھ قائم ہونا چاہیئے کہ ہر ایک تعلیمی مسئلہ اجتماعی فکر سے سلیقے کے ساتھ سلجھایا جا سکے اور تمام اساتذہ ایک دوسرے کی اصابتِ رائے سے اپنے علم و عمل کی درستی کر سکیں۔ ماہانہ مجالس سے لے کر سالانہ کانفرنسوں تک مختلف پیمانے پر پابندی اوقات کے ساتھ اساتذہ کے اجتماع

ہوتے رہا کریں اور اس طرح نہ صرف اچھے کام کے نمونے سارے دیس کے سامنے آئیں بلکہ دیس کو بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو آگاہی بھی دی جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ اساتذہ کی تعلیمی اور اقتصادی حالت کو بھی بہتر بنانے کی سعی کی جا سکے۔

گذشتہ مارچ کے مہینے میں مرکزی وزیر وزارت تعلیم نے اپنے ایک بیان میں حکومت کی تعلیمی پالیسی کا رجحان واضح کیا ہے۔ انھوں نے بھی ثانوی تعلیم کی اہمیت کا خصوصیت سے ذکر فرمایا ہے اور اساتذہ کی تعلیم و تربیت کے مختلف اور متنوع طور طریقے برتنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اب اساتذہ کی ذمہ داری کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔

"معلم"

نصاب کی ترتیب اور اس کو معاشری ضروریات کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ معلم کو فطرتِ اطفال اور نظام تمدن دونوں سے واقفیت ہو، وہ ذہین ہو اور معاشری احساس رکھتا ہو۔ اس کے بعد نصاب کو طلبہ کے سامنے پیش کرنے کا اور اس کو ان کی زندگی کا جزو بنانے کا مسئلہ آتا ہے، جو طریقہ تعلیم سے متعلق ہے اور اس کا انحصار تمام تر معلم کی ذات پر ہے۔

اُصولِ تعلیم ۔ خواجہ غلام السیدین

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

ماسٹر رام چندر

تالیف: صدیق الرحمٰن قدوائی

(ریسرچ فیلو، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی)

سن طباعت۔ اگست ۱۹۶۱ء - ناشر: شعبۂ اردو، دلی یونیورسٹی، دہلی ۶ سائز ۲۶×۲۰

حجم ۱۹۴ صفحات۔ طباعت ٹائپ میں بہت عمدہ۔ قیمت: مجلد ساڑھے آٹھ روپے

ہماری ادبی تاریخ میں یسوع داس رام چندر (۱۸۲۱ - ۱۸۸۰ء) کا نام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اُس دہلی کالج کی پیداوار تھے جو یقیناً محض ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک تہذیبی تحریک کا داعی بھی تھا۔ بظاہر یہ تحریک شعلۂ مستعجل ثابت ہوئی اور اٹھارہ سو ستاون کے تند و تیز انقلابی دھاروں میں تنکے کی طرح بہہ گئی لیکن ہمارے ادب پر اس نے گہرے نشانات چھوڑے۔ دہلی کالج کی تہذیبی تحریک کے پہلے اور موثر داعی ماسٹر رام چندر ہی تھے، جو صحافی بھی تھے اور ماہر ریاضی بھی۔ ان کی موخر الذکر حیثیت نے ان کو مغرب سے روشناس کیا اور ان کی شخصیت کے اوّل الذکر پہلو نے ہماری ادبی تاریخ میں ان کو شہرت دوام عطا کی۔ انیسویں صدی کے وسطی دور میں جن بزرگوں نے ہمارے علم و ادب کی توسیع میں بیش از بیش حصہ لیا ہے ان میں ماسٹر رام چندر کا نام سرفہرست ہے۔ وہ ہمارے پہلے اہل قلم ہیں جن کو قدیم مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ جدید مغربی علوم سے بھی براہِ راست اور باضابطہ واقفیت حاصل تھی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اخبارات ورسائل کی وساطت سے ہمارے ادب اور ہمارے کلچر کو مغربی علوم سے متعارف کیا۔ ماسٹر رام چندر کے نیم ادبی اخبار فوائد الناظرین اور ادبی رسالے محب ہند نے ہماری جدید اخبار نویسی اور ادبی صحافت (لٹریری جرنلزم) کا سنگ بنیاد ہی نہیں رکھا، بلکہ نسیم مغرب کو خوش آمدید کہنے کے لئے ہمارے ادبی و ثقافتی ایوانوں کے دریچے بھی کھول دئے۔

اٹھارہ سو ستاون کے معرکۂ آزادی کی ناکامی اور اس کے نتیجے میں انگریزی اقتدار کے مضبوطی سے جم جانے نے قدرتی طور پر ہندوستانیوں میں تند و تلخ جذبات پیدا کر دئے تھے اور اس کا منطقی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ انگریزی عہد کے فیوض و برکات کو بھی یکسر نظر انداز کیا جاوے اور ان لوگوں کا نام بھی نہ لیا جائے جو مشرق و مغرب کی مفاہمت کے علمبردار اور داعی تھے۔ اس کا سلسلہ مختلف شکلوں میں ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے خاتمے کے بعد اب اس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ مستقبل کی راہیں متعین کرنے کے لئے ماضی بعید ہی کا نہیں بلکہ ماضی قریب کی سیاسی و سماجی تاریخ کا بھی معروضی مطالعہ کیا جائے۔ زیر تبصرہ کتاب "ماسٹر رام چندر دہلی کالج کی ایک اہم شخصیت" بھی اسی جدید رجحان کا ایک موثر اور کامیاب مظاہرہ ہے، جس میں ماسٹر رام چندر کی علمی و ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے — (۱) رام چندر کا زمانہ (۲) حالات زندگی (۳) اخبارات، رسائل، تالیفات (۴) خیالات و افکار، اور (۵) تاریخ ادب میں رام چندر کا مرتبہ۔ ضمیمے میں ماسٹر رام چندر کے مضامین کی ببلوگرافی بھی دی گئی ہے، جو تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یقیناً بے حد مفید ہے۔

"ماسٹر رام چندر" کے دیباچے میں مؤلف نے ایک اہم ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اردو نثر کے ارتقار کی تاریخ میں قدیم دہلی کالج کا جو اہم حصہ رہا ہے، اس طرف ابھی تک خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔" ماسٹر رام چندر اور دہلی کالج دونوں لازم و ملزوم ہیں ایک پر کام کرنے کے بعد دوسرے پر کام کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ کام بھی اب صدیق الرحمٰن قدوائی ہی کو کرنا چاہیئے۔ اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ "مرحوم دہلی کالج (مولوی عبدالحق مرحوم) کو اڈِٹ کر دیا جائے، جو اُس وقت لکھی گئی تھی جب اردو میں تحقیق کا مذاق طفولیت کے دور سے گزر رہا تھا۔ تحقیق کے وسائل بھی اُس وقت تک عام نہیں ہوئے تھے۔

زیر تبصرہ کتاب کے مولف صدیق الرحمٰن قدوائی "نووارد بساط ادب" ہیں یا ماسٹر رام چندر ان کی پہلی کتاب ہے جو ہمارے سامنے آئی ہے۔ اس کو دیکھ کر ان سے جو توقعات پیدا ہوتی ہیں، امید ہے کہ وہ انھیں پورا کریں گے۔ (محمد عتیق صدیقی)

متاعِ تسکین — از تسکین قریشی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۱۶۰، قیمت کہیں درج نہیں۔ (۱) مکتبہ جامعہ۔ نئی دلی اور (۲) انجمن ترقی اردو، علی گڑھ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

ایک زمانہ میں شاعری سب سے لطیف و نازک اور اُسی کے ساتھ سب سے مشکل فن سمجھا جاتا تھا اور استادِ کامل کی مدد سے دوسرے فنونِ لطیفہ کے ساتھ بڑے ریاض سے حاصل کیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ استادی و شاگردی غیر ضروری سمجھی جانے لگی اور شعراء کثرت مطالعہ اور ذوقِ سلیم پر بھروسا کرنے لگے۔ کچھ لوگوں نے ان دونوں کو ضروری سمجھا اور تسکین بھی انھیں میں ہیں۔ "متاعِ تسکین" میں تسکین کے حالات درج نہیں ہیں لیکن کتاب کے آخر میں عزیز لکھنوی کا جو قطعہ تاریخ وفات درج ہے اس میں تسکین نے عزیز لکھنوی کو "حضرت استادی" لکھا ہے۔ اس کے علاوہ وہ جگر اور اصغر بالخصوص اول الذکر کے بہت قریب رہے ہیں۔ اس لئے ان کا کلام سہ آتشہ ہو گیا ہے۔

تسکین روایاتِ غزل کے ادا شناس ہیں۔ وہ غزل کے ان نئے رجحانات سے بھی واقف ہیں جن کی ابتدا عزیز لکھنوی وغیرہ سے ہوتی ہے۔ عشق کا سوز اور تصوف کا گداز انھوں نے علی الترتیب جگر و اصغر سے حاصل کیا ہے۔ لیکن ان کا رنگ سراسر تقلیدی نہیں ہے۔ ان کے اشعار میں ایک جاندار تغزل کی نمود ہے اور ان کے تصورِ عشق میں والہانہ پن بھی ہے اور پاکیزگی اور بانکپن بھی۔ ان کے کلام میں روانی اور پختگی کا نمایاں امتزاج ہے لیکن قیودِ فن کی پابندی کے باوجود وہ خلوصِ اظہار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ "متاعِ تسکین" میں ان ارباب نظر کی توجہ کے قابل بکثرت اشعار مل جائیں گے جو مزاجِ تغزل کے رمز شناس ہیں اور عام نگاہیں بھی ضرور لطف اندوز ہوں گی۔

قدیم روایاتِ غزل کے پابند شعراء میں تسکین کے یہاں تفکر کا بھی عنصر ملتا ہے لیکن ان کا عشقِ جنوں ساماں جدید محرکات سے بعض اوقات بے آہنگ بھی نظر آنے لگتا ہے ؎

رنگِ دورِ جدید اے تسکین   کیا سمجھتے تھے کیا نظر آیا

خیر، یہاں تک تو چنداں مضائقہ نہیں کیونکہ بہت سے لوگ دورِ جدید کے بعض پہلوؤں سے غیر مطمئن ہیں لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ؎

چھائی ہوئی ہیں دہر پہ فکر و عمل کی قوتیں
فکر و عمل بجا مگر ان کو سمجھ نہ کارساز

تو بات نری تقدیر پرستی تک جا پہنچتی ہے۔ کارسازی کا کوئی تصور جو فکر و عمل دونوں ہی کی سرحدوں سے پرے ہو نا سائنسی ہے۔ ایک سچے ملنے والے کے لئے بھی فکر و عمل میں اور مشیت کارساز میں کوئی تضاد نہیں ہے لیکن تسکین اُن ماننے والوں میں ہیں جو "تدبیر ساحل" اور "فکر تلاطم" دونوں ہی کو ننگ طلب" سمجھتے ہیں۔ گویا اگر طلب صادق ہے تو دونوں ہی کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اگر یہ فلسفہ اپنے تمام عواقب کے ساتھ مان لیا جائے تو تقدیر پرستی اور بےعملی کے سوا کیا ہاتھ آئے گا۔

لیکن تفکر کا میدان، تسکین کا خاص میدان بھی نہیں ہے۔ ان کے دیوان کا مطالعہ کرنے والا ان کے تغزل سے قدم قدم پر متاثر ہوگا۔

دل سے کیا آج کہ گئی وہ نگاہ
دیر تک کچھ عجیب حال رہا

نگہ ادھر وہ لئے معاذ اللہ
نگہ التفات کیا ہوگی؟

اشارہ پھر ان کی نظر کا اشارا
غم دوجہاں ہو تو وہ بھی گوارا

یہ کیسی محبت ہے کہ آنسو ہیں نہ آہیں
جیسے کہ ہمیں اب کوئی آتا ہی نہیں یاد

بیخودی شوق کی مدہے کہ ان کو دیکھ کر
اپنی ساری آرزوؤں کو بھی کم سمجھا ہوں میں

تسکین کا کلام اسقام سے پاک ہے اور سادگی میں پُرکاری کا مرقع ہے۔ وہ بہت بنا سنوار کے لکھتے ہیں۔ ایک شعر کا ایک مصرع کچھ ضرور کھٹکتا ہے ؎

صہبا ہمہ سرمستی و ساقی ہمہ آغوش!
کافر ہے جسے آئیں جواب بھی دل ودیں یاد

ایک ہی مصرعہ میں 'جسے' اور 'جو' کا اتنے اتنے قریب قریب آجانا اچھا نہیں لگتا۔ دوسرا مصرعہ اگر یوں ہوتا تو بہتر تھا ؎

کافر ہے وہ آئیں جسے اب بھی دل ودیں یاد

(علی جواد زیدی)

صبح بنارس   از عشرت کرت پوری

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۲۸، قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے

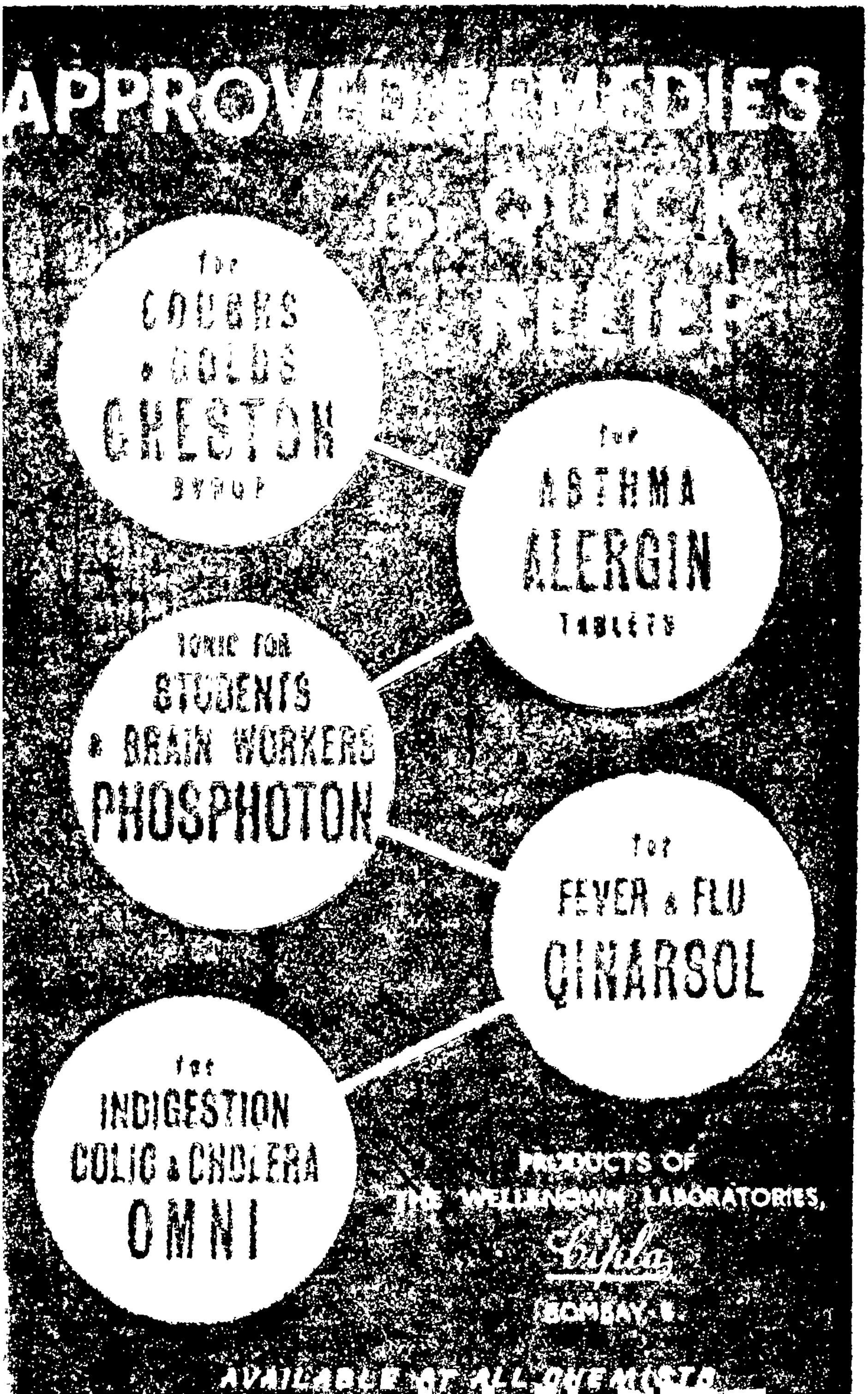
ملنے کا پتہ: جاوید پبلیشرز، اردو بازار، جامع مسجد دلی ۶

"صبح بنارس" نے ہمارے بہت سے شعراء کو صدیوں سے متاثر کیا ہے۔ اس میں حزیں اور غالب جیسے متقدمین بھی ہیں اور جاں نثار اختر، اجتبیٰ اور نذیر بنارسی جیسے شعرائے حال بھی۔ عشرت کرت پوری نے ان تمام شعراء کے وہ اشعار یکجا کر دئے ہیں۔ جو صبح بنارس یا بنارس کے حسن و عظمت کے عکاس ہیں۔ اس کام میں عشرت نے محنت کی ہے اور بہت سادہ حصہ کلام بھی فراہم کر دیا ہے جن پر عام نگاہیں کم پڑی ہوں گی۔ نظموں کے حصے میں تین نامعلوم شعرا کے علاوہ ۳۱ شعرا کا کلام شامل ہے اور پھر ۱۶ شعرا کے متفرق اشعار درج ہیں۔ یہ فہرست بھی یقیناً نامکمل ہے۔ ابھی بہت سے ایسے نام رہ گئے ہیں جنھوں نے صبح بنارس کے جادو کو لفظوں میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے، پھر بھی یہ مجموعہ اپنے دامن میں بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہے اور اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ ضرور کیا جائے۔

"صبح بنارس" کے کئی پہلو ہیں۔ زاہد و عابد، حق پرست و فطرت پرست، ظاہر بیں و تماشائی، عشق مشرب و نظارہ جو سب نے اسے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ عشرت نے ہر ایک پہلو کو یکجا کیا ہے۔ شروع میں انھوں نے شہر بنارس کا تاریخی پس منظر بھی دیا ہے جو محنت سے مرتب ہوا ہے اور بجائے خود ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

(علی جواد زیدی)

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائیٹل: دیال پریس دہلی


APPROVED REMEDIES
for QUICK RELIEF
for
COUGHS
& COLDS
CHESTON
SYRUP
for
ASTHMA
ALERGIN
TABLETS
TONIC FOR
STUDENTS
& BRAIN WORKERS
PHOSPHOTON
for
FEVER & FLU
CINARSOL
for
INDIGESTION
COLIC & CHOLERA
OMNI
PRODUCTS OF
THE WELLKNOWN LABORATORIES,
BOMBAY
AVAILABLE AT ALL CHEMISTS

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۵۰	بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۶۴ء	شمارہ ۵

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

پنڈت جواہرلال نہرو

پروفیسر محمد مجیب

۲۷ مئی کی صبح کو کسی رگ کے پھٹ جانے سے ایک ایسا مرد میدان دنیا سے رخصت ہوگیا جس نے اپنی تمام عمر میں کبھی ٹھہرنے اور ستانے کا نام نہیں لیا تھا۔ رگ کا پھٹنا اور خون کا بہ جانا اور اس کی وجہ سے آخر کار قلب کی حرکت کا رک جانا بھی ایک استعارہ تھا جس میں جواہرلال کی پوری زندگی بیان ہو جاتی ہے۔ ان کو موت نہیں آئی، ان کا خون رگوں سے نکل پڑا، جان جسم سے آزاد ہوگئی، ڈوبتے ہوئے سورج نے تاریکی سے شکست نہیں کھائی بلکہ آسمان پر وہ پھینک دئے جو اس کے اندر بھرے تھے اور منہ پھیر کر چلا گیا۔ مگر خالق کائنات آدمی کو جس شان سے بھی واپس بلائے واپس ضرور بلا لیتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ تو سبھی کہیں گے کہ جواہرلال جی کی سوانح حیات بیان کرنا ہندوستان کی ستر پچھتر برس کی تاریخ بیان کرنا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو اپنے ملک کے لئے اس طرح وقف کر دیا تھا کہ اپنے لئے کچھ الگ رکھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اسی وقف ہو جانے سے ان کی شخصیت میں ایسی صفات پیدا ہوگئیں کہ وہ ملک سے، حالات سے، ماحول سے بالاتر ہو گئے۔ ہندوستان جواہرلال میں سما گیا، جواہرلال ہندوستان میں محو ہو گئے۔ ہماری زندگی کے ہر انقلاب نے ان کی شخصیت کے کسی پہلو کو نمایاں کیا، اور آخر تک وہ ہم سے اس قدر بلند رہی کہ ہم کو اپنے سے بہتر زندگی کے نقشے دیکھنے اور دکھاتی رہی۔

جواہرلال جی کو میں نے پہلی مرتبہ غالباً ۱۹۱۷ء کے شروع میں دیکھا۔ بھائی جان مرحوم کندی لال صاحب اوکسفورڈ سے آئے تھے، اور ہم لوگوں سے ملنا اور لکھنؤ کی سیر کرنا چاہتے تھے۔ ایک روز انھوں نے کہا "جواہرلال یہاں آئے ہوئے ہیں، راجہ صاحب محمود آباد

مکان پر ٹھہرے ہیں۔ میں ان سے ملنے جا رہا ہوں، تم بھی چلو۔ میں ساتھ ہو لیا۔ ہم قیصر باغ میں راجہ صاحب کے مکان پر پہنچے، اطلاع کرائی اور تھوڑی دیر میں بلا لئے گئے۔ جواہر لال نہرو بار ایٹ لا، اس وقت قریب تیس بتیس برس کے تھے، بہت خوب صورت، بہت فیشنیبل، عدالت میں جانے کے لئے سیاہ الپکا کا کوٹ، ساڑھے تین انچ اونچا سخت کالر پہنے ہوئے بیاڑ، سر پر بال، برائے نام تھے، مگر جتنے بھی تھے انھیں اہتمام سے برش کر کے مانگ نکالی گئی تھی، ان کا بدن اور کپڑے ہی نہیں بلکہ ہر حرکت صابن سے دھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی، مکتری لال صاحب کچھ بہت سمجھ دار آدمی نہیں تھے، اور جواہر لال جی کی مسکراہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایسے آدمی سے بات کر رہے ہیں جو صرف بیوقوف نہیں ہے بلکہ بے وقت بھی آگیا ہے۔ میں اس قابل نہیں تھا کہ گفتگو میں شریک ہوتا باتیں سنتا رہا اور کوئی خاص اثر لئے بغیر چلا آیا۔

دوسری مرتبہ میں نے جواہر لال جی کو لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں دیکھا کھدر کا کرتہ اور دھوتی پہنے تھے، معلوم ہوتا تھا اپنے خیالات میں ڈوبے ہیں، جسم اور جان کی پروا نہیں ہے، بس حق بات کہنا چاہتے ہیں، چاہے وہ تیج بہادر سپرو اور موتی لال نہرو کی مرضی کے خلاف ہو اور مصلحت اندیش لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے۔ وہ اسی زمانے میں روس سے واپس آئے تھے، ایک نئی زندگی کا نقشہ ان کے ذہن میں تھا جسے اس وقت کے سیاسی ماحول میں دوسروں کے لئے قابل فہم بنانا تقریباً ناممکن تھا۔ مجھے ان کی تقریریں بہت بے ربط لگیں، یا یوں کہیئے کہ ان میں نظم اور ترتیب اتنی ہی تھی جتنی کہ ساحل سے ٹکراتی ہوئی سمندر کی لہروں میں۔

مگر ساحل کی بے حسی موجوں کے تھپیڑوں کا بہت عرصہ تک مقابلہ نہ کر سکی۔ سنہ ۳۰ء میں جواہر لال جی کی ہی تحریک سے کامل آزادی کو ہندوستان کی سیاسی تحریک کا نصب العین قرار دیا گیا۔ عام طور سے گاندھی جی کی محبت اور مصلحت اندیشی جواہر لال جی کے جوش کی روک تھام کرتی رہتی تھی، اعلان کے بعد گاندھی جی ہی قومی تحریک کو منزل مقصود کی طرف لے جانے کی تدبیریں کرتے رہے، مگر کامل آزادی کو منزل مقصود جواہر لال جی نے بنایا تھا اور اس کی ایسی

وضاحت کی تھی کہ اس کے کامل یا آزادی ہونے میں شبہ نہ رہے۔

عام طور پر ہر بڑی شخصیت کسی ایسی اخلاقی قدر کی حامل ہوتی ہے کہ وہ اس قدر کا مجسمہ بن جاتی ہے اور اسی کے ذریعہ سمجھی اور سمجھائی جا سکتی ہے۔ جواہرلال جی میں سینکڑوں خوبیاں تھیں مگر غور کیجئے تو یہ سب اس شرافت کو ظاہر کرتی تھیں جو ان کی طبیعت میں تھی، بلکہ ان کی طبیعت بن گئی تھی۔ وہ ایسی بات کو چاہے گوارا کر لیتے جو عقل یا مصلحت یا مفاد کے خلاف ہوتی، ایسی بات گوارا نہیں کر سکتے تھے جو شرافت کے خلاف ہوتی۔ شرافت نے ان کو ان تمام لوگوں کا سرپرست اور سہارا بنا دیا جو بغض یا کینہ یا تعصب سے نقصان اٹھا رہے تھے، اسی شرافت نے ان کو جمہوری اصولوں کے برتنے میں انتہا پسند بنا دیا۔ ہندوستان کے کسان اسے بہتر سمجھتے اور شاید زیادہ فائدہ میں بھی رہتے اگر انھیں حکم دیا جاتا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو، لیکن یہ شرافت کے سیاسی معیار کے خلاف تھا کہ ان پڑھ کسانوں کو بھی حکومت کا پابند کیا جائے۔ اسی معیار کو قائم رکھنے کی خاطر جواہرلال جی نے جمہوری طریق کار کو بڑی سختی سے برتا۔ ان سے بہتر کون جانتا تھا کہ کتنے کام ہیں، انھیں جلد سے جلد انجام دینا کتنا ضروری ہے اور اگر غیر ضروری بحثوں اور خواہ مخواہ کے اختلافات کو سمجھا بجھا کر دور کرنے میں کتنا وقت ضائع ہوتا ہے۔ وہ کام جلد کرنا اور کرانا چاہتے تھے اور بلا وجہ دیر لگتی تو بہت الجھتے تھے۔ جمہوری طریق کار کو برتنا ان کے لئے بڑی ریاضت تھی، مگر وہ تمام عمر یہ ریاضت کرتے رہے، اور کبھی اسے ترک کرنے کا خیال نہیں کیا۔

اسی شرافت کا ایک مظاہرہ میں نے دیکھا جس کا دل پر بہت اثر ہوا۔ ایک وزیر کے یہاں غالباً نئے نائب صدر کو مبارک باد دینے کے لئے دعوت کی گئی تھی۔ شامیانے میں ایک طرف، جہاں بڑے آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا، زمین بھی کوئی چھ انچ اونچی کر دی گئی تھی، جو مہمان آتا، خود اپنے مرتبے کا اندازہ کر کے اونچے حصے کی طرف چلا جاتا یا نیچے ہی رہتا۔ راشٹرپتی تشریف لائے، انھیں ظاہر ہے اوپر ہی بٹھایا گیا۔ جواہرلال جی آئے تو راشٹرپتی اور دوسرے لوگوں کی طرف بڑھے، پھر

یہ دیکھا کہ اس طرف زمین اونچی کی گئی ہے تو مسکراتے ہوئے چھوٹے، لوگوں کی طرف مڑ گئے، اور رخصت ہوتے وقت تک اونچی جگہ پر نہیں گئے۔ حفظ مراتب کا نظام درہم برہم کرنا جواہر لال جی کی ایک بڑی پیاری شرارت تھی جس کا بیان سن کر ہندوستان کے ہر شہری کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔

ہندوستان میں بہت سے لوگ، بہت سے ادارے ہوں گے جو جواہر لال جی کی شفقت اور عنایت کے سہارے پروان چڑھے۔ جامعہ ان میں سے صرف ایک ہے، مگر ان کی نظر جامعہ پر جب بھی پڑتی ایسی بھرپور محبت کی نظر ہوتی تھی گویا ان کا دل جامعہ میں اور جامعہ ان کے دل میں آباد ہے بلکہ مجھے ڈر ہے انھیں شکایت رہتی ہوگی کہ ہم ان سے الگ رہے جب ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہر وقت ہمارے گلے میں ہاتھ ڈالے رہنا چاہتے ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہہ بھی دیا۔ دہلی یونیورسٹی میں جلسہ تھا، اس کے بعد چائے۔ ان کے سامنے بڑی لمبی میز بچھی تھی اور بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں دوسری میز پر تھا۔ رخصت ہونے لگے تو دو قطاریں بن گئیں اور ان کے لئے بیچ میں رستہ چھوڑ دیا گیا۔ دوسرے لوگ آگے بڑھنا چاہتے تھے میں پیچھے ہٹتا گیا۔ وہ سامنے سے گذرے تو میری طرف دیکھ کر کہا، "اچھا، ہم سے چھپنا چاہتے ہو!"

ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں

ڈاکٹر سید عابد حسین

(مندرجہ بالا عنوان کے ماتحت ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کئی سال کی تحقیق اور محنت کے بعد ایک کتاب لکھی ہے اور وہ چند مہینے کے اندر شائع ہونے والی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی جو خود ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے ساتھ ہی ساتھ شائع ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کی اجازت سے اس کتاب کا مقدمہ رسالہ جامعہ میں نقل کیا جا رہا ہے)

نیا ہندوستان آج یک جہتی اور انتشار کا ایک عجیب ملا جلا منظر پیش کرتا ہے ـــــ ایک طرف وہ سیاسی اتحاد جس کی مثال نہ صرف ہمارے ملک کی بلکہ کسی ایشیائی ملک کی تاریخ میں بھی مشکل سے نظر آئے گی۔ دوسری طرف وہ تہذیبی اور معاشرتی اختلاف اور رنگا رنگی کہ شاید ہی کسی خطۂ ارض میں جو ایک ملک کہلاتا ہے پائی جاتی ہو۔

سیاسی اتحاد سے ہماری مراد سیاسی مقاصد اور تنظیم کی وہ یک جہتی ہے جو حکمراں جماعت کے جبر سے نہیں بلکہ لوگوں کی اپنی مرضی سے پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی وحدت کا پیدا ہونا صرف عہدِ جدید کی جمہوری ریاستوں ہی میں ممکن ہے جن میں ریاست کی بنیاد رائے عامہ کی قبولیت پر رکھی جاتی ہے۔ عہدِ قدیم کی جمہوریتیں مثلاً یونانی ریاستیں یا رومی سلطنت جدید معیار کے مطابق محض برائے نام جمہوری تھیں اس لئے کہ وہ اپنے کل باشندوں (جن میں لاکھوں غلام بھی شامل تھے) کی مرضی کی نمائندگی نہیں کرتی تھیں بلکہ صرف آزاد شہریوں کی مرضی کی۔

عہدِ جدید کے یورپ میں ایسی کئی ریاستیں جنھیں ہم موجودہ معنی میں جمہوری کہہ سکتے ہیں صدیوں سے چلی آرہی ہیں مگر ایشیا میں انیسویں صدی کے آخر تک صرف جاپان میں نمائندہ حکومت کا طریقہ شروع ہوا تھا گو اسے جمہوریت کہنا مشکل ہے۔ جمہوری راج دہ

وہاں دوسری جنگ عظیم کے بعد قائم ہوا ہے۔ بیسویں صدی کے شروع سے ایشیا میں اور جمہوری ریاستیں وجود میں آنے لگیں اور آزاد جمہوریہ ہند کے قیام کے بعد تو ایشیا اور افریقہ میں چھوٹے بڑے ملکوں کے مغربی سامراج کے تسلط سے آزاد ہونے اور جمہوری ریاستیں بننے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور اب تک جاری ہے۔ مگر ان سب ملکوں میں صرف ایک ہندوستان ہے جس میں سیاسی مقاصد اور تنظیم کی یک جہتی اس حد تک موجود ہے کہ اس کے سہارے ایک کم و بیش مستحکم حکومت قائم ہے ورنہ جہاں دیکھئے ملک کے باشندوں میں اندرونی سیاسی اور معاشی نقشے اور بیرونی پالیسی کے بارے میں اتنے زبردست اختلافات ہیں کہ آئے دن حریف طاقتوں میں شدید ٹکر ہوتی رہتی ہے اور فوجی یا عوامی انقلابات کے ذریعے حکومت بدلتی رہتی ہے۔ ہندوستان میں سیاسی پارٹیوں کی باہمی کش مکش اور آبادی کے بعض ٹکڑوں کا علیحدہ ریاست کا مطالبہ دیکھ کر ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے سیاسی اتحاد کی بنیادیں بہت کمزور ہیں۔ لیکن جب ہم اپنے ملک کا مقابلہ دوسرے ایشیائی ملکوں کے حالات سے کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں سیاسی اور معاشی پالیسی کے بارے میں اختلافات ہیں تو ضرور مگر اتنے گہرے نہیں کہ ان میں مصالحت کرنا یا کم سے کم انھیں ایک معقول حد کے اندر رکھنا ناممکن ہو۔ ہمارے اتحاد کو بلکہ ہمارے امن و عافیت اور ہماری آزادی اور سلامتی کو جو خطرہ ہے وہ ان سیاسی اختلافات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان تہذیبی اور معاشرتی اختلافات کی وجہ سے ہے جو کسی اور ملک میں اس حد تک اور اس شدت کے ساتھ موجود نہیں ہیں جتنے ہمارے ملک میں۔

جب ہم اپنے آس پاس کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ ان ملکوں کو چھوڑ کر جن میں ابھی تک قبائلی نظام کا دور دورہ ہے، عام طور پر افریقہ اور ایشیا کی نئی جمہوری ریاستوں میں سے ہر ایک کے اندر تہذیب و معاشرت کم و بیش یکساں ہے۔ پیشوں، نسلی گروہوں، علاقائی گروہوں اور مذہبی فرقوں کی الگ الگ جماعتیں تو ضرور ہیں اور ان کی زندگی اور تہذیب بھی کسی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہے مگر اس اختلاف کا احساس اتنا

شدید نہیں ہے۔

اب اپنے ملک کی طرف آیئے تو یہاں ہمیں تین طرح کی جماعتیں نظر آتی ہیں — ذاتی، لسانی جماعتیں، مذہبی جماعتیں — جن میں تفریق و اختلاف کے احساس نے فرقہ پروری کی شکل اختیار کرلی ہے یعنی ان کو اپنے جداگانہ وجود اور جداگانہ مفاد کا حد سے زیادہ شعور ہے اور اس نے مشترک قومیت اور قومی مفاد کے شعور کو دبالیا ہے اور قومی یک جہتی کی راہ میں زبردست رکاوٹیں کھڑی کردی ہیں۔ آج ہماری قومی زندگی کا سب سے اہم اور فوری توجہ کا محتاج مسئلہ یہی ہے کہ ہم فرقہ پروری کی ان تینوں قسموں سے کس طرح نبٹیں۔ ان میں سے پہلی قسم یعنی ذاتوں کا وجود ہندوستان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس طرح کی مستقل سماجی درجہ بندی جو دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں پائی جاتی، غالباً ہندوستان میں اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ یہاں رواداری کا تصور دنیا کے اور ملکوں سے زیادہ اور مساوات کا تصور ان سے کم تھا۔ اس زمانے میں جب فاتح نسلیں یا تو مفتوح نسلوں کا قلع قمع کر دیتی تھیں یا اُن کو اُن کے وطن سے نکال باہر کرتی تھیں یا انھیں غلام بنا کر رکھتی تھیں، ہندوستان میں آنے والی آریہ قوموں نے یہ رواداری برتی کہ ان کو اصولاً آزاد انسانوں کی حیثیت سے اپنی سماج میں شامل کرلیا اگرچہ ان کو سماجی درجہ بندی میں اتنا نیچا درجہ دیا کہ عملاً وہ بعض لحاظ سے غلاموں سے بھی بدتر تھا۔ اس عدم مساوات کی روح نے آگے چل کر خود آریوں میں بھی اونچی نیچی ذاتیں بنا دیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں بدھ سے لے کر گاندھی تک بہت سے مہاتما پیدا ہوئے جنھوں نے ذات کی تفریق کو مذہب کی سچی روح کے خلاف سمجھ کر اس کی دل و جان سے مخالفت کی۔ آج جمہوریت اور ہیومانزم کی قوتیں ذات پروری کو ختم کرنے کے لئے چوٹی کا زور لگا رہی ہیں اور انھوں نے اس کی جڑوں کو ہلا دیا ہے لیکن ابھی اسے گرا نہیں سکیں۔ بیچ میں قومی آزادی کی تحریک نے بہ ظاہر ذات پات کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیفیت محض عارضی تھی جب سے ملک آزاد ہوا ہے اور بالغوں کی حق رائے دہندگی کی بنا پر انتخابات شروع ہوئے ذات پروری کا زور پھر بڑھ گیا۔

اور ذات پات سے وفاداری کا جذبہ اتنا قوی ہے کہ ملک اور قوم سے وفاداری کے لئے بہت گنجائش رہ گئی ہے۔ آج بلاشبہ سب سے بڑی انتشار پیدا کرنے والی قوت ذات پروری۔ پھر بھی غور سے دیکھنے والے کو صاف نظر آتا ہے کہ مساوات کے قدرتی یا الٰہی ہونے کا تصور ذات پروری کی روحانی اور اخلاقی بنیاد ہے کمزور ہو چکا ہے اور یہ عمارت کتنے ہی مضبوط مسالے سے کیوں نہ بنی ہو، نیو کے کھوکھلے ہو جانے کے بعد زیادہ دن نہیں ٹک سکتی۔

لسانی فرقہ پروری دنیا میں کوئی نئی چیز نہیں مگر ہمارے ملک کی تاریخ میں نسبتاً نئی ہے۔ زبانوں کا اختلاف تو یہاں ہمیشہ سے چلا آرہا ہے مگر یہ صورتِ حال کہ ایک زبان کے بولنے والے اپنے کو ایک الگ جماعت یا ذیلی قوم سمجھیں اور اپنے لئے جداگانہ ریاست انتظامی یونٹ کا مطالبہ کریں، ابھی پچھلے چالیس پچاس سال سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جب انڈین نیشنل کانگریس گاندھی جی کی رہنمائی میں سچے میں عوامی سیاسی تحریک بنی تو اسے ملک کے مختلف علاقوں میں عوام تک پہنچنے کے لئے وہاں کی مقامی زبان سے کام لینا پڑا۔ اس طرح قدرتی طور پر لسانی علاقہ کانگریس کی ایک تنظیمی یونٹ یا پردیش بن گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ کانگریس نے کچھ زیادہ سوچ سمجھے بغیر اپنے سیاسی مطالبوں میں جو وہ حکومت سے کر رہی تھی اس مطالبے کو بھی شامل کر لیا کہ ہر لسانی علاقے کو ایک خود اختیاری ریاست بنا دیا جائے۔ اس مطالبے کو دہراتے دہراتے لوگ لسانی ریاست کے تصور کے اس قدر عادی ہو گئے کہ جیسے ہی آزاد ہوا کانگریس جواب حکومت بن گئی تھی، لسانی ریاستوں کے مطالبے شروع ہو گئے۔ اب کانگریسی حکومت کو یہ اندازہ کہ لسانی ریاستیں بنانے میں کیا کیا دشواریاں اور پیچیدگیاں ہیں اور وہ ہچر مچر کرنے لگی۔ اگر شروع ہی میں مضبوطی سے ادھر یا ادھر کوئی فیصلہ ہو جاتا تو شاید لسانی تفریق کا شعور اتنا زور نہ پکڑتا۔ لیکن ایک عرصے تک حکومت کی پالیسی اس قدر ڈانواڈول رہی کہ لسانی ریاستوں کے لئے ایجی ٹیشن بڑھتا گیا اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شامل ہوتے گئے۔ آخر ریاستوں کی نئی تنظیم لسانی بنیاد پر جہاں تک قابلِ عمل تھی کرنی پڑی۔ لیکن اس عرصے میں لسانی ریاستیں بنانے، پرانی ریاستوں کے حدود میں ترمیم کرنے اور ان کی لسانی اقلیتوں کے

حقوق کی حفاظت کرنے کے مطالبے اتنی شدت سے ہو رہے ہیں کہ ان سے نپٹنا خاصا مشکل ہو گیا۔

ایک اور چیز جس نے لسانی فرقہ پروری کو شہ دی ہندوستان کے آئین کی وہ دفعہ بھی ہے جس کی رو سے ہندی کو مرکزی حکومت کی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ اس کی وجہ سے علاقائی زبانوں کے بولنے والوں کو کچھ بجا اور کچھ بے جا اندیشے پیدا ہو گئے کہ ایک تو ہندی کی ترقی ان کی اپنی زبانوں کے نشو ونما کو روک دے گی دوسرے ہندی کو مرکز کی زبان بنانے کی وجہ سے انھیں مرکزی ملازمتوں کے لئے ہندی بولنے والوں سے مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے ہر لسانی جماعت کو اپنے جداگانہ اور مستقل وجود کو منوانے کی ضد پیدا ہو گئی۔

پچھلے دو تین برس میں لسانی فرقہ پروری کے محرکات کو سمجھنے، لسانی اقلیتوں کی جائز شکایات کو دور کرنے اور سرکاری زبان کے مسئلے کو قابل اطمینان طریقے پر حل کرنے کی انتہائی کوشش ہو رہی ہے۔ غیر ہندی علاقے کے باشندوں میں سے ان سیاست کاروں کو چھوڑ کر جنھیں واقعات سے سروکار نہیں بلکہ طاقت حاصل کرنے کی مہم میں کسی نہ کسی بہانے ایجی ٹیشن کرنا ضروری ہے، اور لوگوں کو رفتہ رفتہ یقین ہوتا جاتا ہے کہ لسانی فرقہ پروری نہ ضروری ہے اور نہ مناسب ہے۔ ان کی زبانیں اپنے اپنے دائرے میں بے روک ٹوک ترقی کر رہی ہیں اور کرتی رہیں گی اور ہندی کو مرکزی حکومت کی سرکاری زبان بنانے کا عمل ایسے تدریجی طریقے سے کیا جائے گا کہ ان کے مفاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

غرض دو طرح کی فرقہ پروری یعنی ذات پروری اور لسانی فرقہ پروری بعض وجوہ سے اس وقت بہت شدت پکڑ گئی ہے لیکن آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شدت عارضی ہے اس لئے کہ جن سیاسی وجوہ سے یہ پیدا ہوئی ہے وہ عارضی ہیں اور جن روحانی اور اخلاقی محرکات سے اسے قوت پہنچتی ہے ان کا طلسم اب ٹوٹ رہا ہے۔

مگر مذہبی فرقہ پروری کی صورت حال بالکل مختلف ہے۔ وہ لسانی فرقہ پروری کی طرح نئی نہیں بلکہ اپنے پیچھے ایک خاصی طویل تاریخ رکھتی ہے جو اب گئی گزری ہوئی مگر ابھی تک لوگوں کے ذہنوں پر اس طرح مسلط ہے جیسے جیتی جاگتی موجود ہو۔ اس کے علاوہ اس نے

فات پروری کی طرح اپنا روحانی اور اخلاقی بھرم نہیں کھویا بلکہ بہتوں کو جن کی بصارت زمانے کی بدلتی ہوئی روشنی سے عدم مطابقت کی وجہ سے دھندلی ہو گئی ہے اس کے اندر اخلاقی دروحانیت کی چمک دمک دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے دراصل یہی قومی یک جہتی کی راہ میں سب سے بڑی اور زبردست رکاوٹ ہے جس سے ٹکر لینے کے لئے سچے محبان وطن کو ایمان، فکر اور عمل کی ساری قوتیں اکٹھی کرنی ہوں گی۔ مذہبی فرقہ پروری کے یوں تو مختلف مظاہر ہیں لیکن ان کا سب سے نمایاں، سب سے اہم اور سب سے خطرناک مظہر یہ ہے کہ ہندو فرقہ پروری اور مسلم فرقہ پروری کے مقاصد بہ ظاہر مختلف معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل دونوں قوتیں ایک ہی سمت کام کررہی ہیں۔ ایک مسلمانوں کو پیچھے سے ڈھکیل رہی ہے۔ دوسری آگے سے کھینچ رہی ہے کہ انھیں ہندوستانی قومیت کا ایک لازمی جزبن کر نہ رہنے دے بلکہ مشترک قومی زندگی سے الگ کرکے ایک سیاسی اقلیت بنا دے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک انھیں غیر محفوظ اقلیت اور دوسری محفوظ اقلیت بنانا چاہتی ہے۔ یہ بحث کہ موجودہ زمانے میں ایک سیاسی اقلیت بن کر رہنا خود ہندی مسلمانوں کے لئے کس قدر مہلک ثابت ہوگا ہم آگے چل کر کریں گے۔ یہاں تو ہمیں قومی اتحاد سلامتی اور خوش حالی کے نقطۂ نظر سے یہ دیکھنا ہے کہ پانچ کروڑ آدمیوں کے اس طرح الگ تھلگ رہنے کا ان عظیم الشان مقاصد پر کتنا تباہ کن اثر پڑے گا جن کو سامنے رکھ کر آزاد ہندوستان نے اپنی اندرونی اور بیرونی پالسی کی تشکیل کی ہے۔ ہماری اندرونی پالسی کا خاص مقصد یہ ہے کہ منصوبہ بندی کے ذریعے خوش حالی حاصل کی جائے، یعنی ایک ایسی معتدل صنعتی سماج تعمیر کی جائے جو سب لوگوں کے آرام سے بسر کرنے کے لئے کافی دولت پیدا کرے اور اسے انصاف سے تقسیم کرے اور بیرونی پالسی کا یہ ہے کہ سب ملکوں سے دوستانہ تعلقات رکھے جائیں اور ان کی رائے عامہ کو ہموار کرکے امن عالم کو، جس کے سر پر تیسری جنگ عظیم کا خطرہ منڈلا رہا ہے قائم رکھنے کی کوشش کی جائے۔

جہاں تک منصوبہ بندی اور صنعت کاری کا تعلق ہے، ہندوستان جیسے غریب ملک کے لئے یہ اتنا عظیم الشان کام ہے اور اس کے لئے اتنی زبردست کوشش کی ضرورت ہے کہ جب تک

ساری قوم — ملک کی آبادی کا ہر ایک حصہ اس میں سرگرمی سے حصہ نہ لے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ مگر سیاسی اقلیتوں کی نفسیات کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہندوستان میں مسلمان ایک اقلیت بن کر رہے تو ان میں کبھی وہ جوش، وہ لگن پیدا نہیں ہو سکتی جو ملکی ترقی کے کاموں میں دل و جان سے لگ جانے کے لئے ضروری ہے ظاہر ہے کہ ملک کی آبادی کا کم و بیش نواں حصہ جو جغرافی حیثیت سے الگ نہیں بلکہ ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے، اگر بے حسی اور بے دلی کی وجہ سے ملک کے معاشی تعمیر نو میں کام نہ کرے تو ہمارا معاشی نظام کم سے کم جزوی طور پر اسی طرح معطل ہو جائے گا جیسے اعصابی نسیج کے ایک حصے کے بے کار ہو جانے سے جسمانی نظام جزوی طور پر مفلوج ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑا نقصان مسلمانوں کے قومی پالیسی کے نفاذ میں سرگرمی سے حصہ نہ لینے سے یہ ہوگا کہ ملک دو ایسے مقاصد کے حاصل کرنے میں ان کے تعاون سے محروم ہو جائے گا جن کے حصول میں وہ خاص طور پر قابل قدر مدد دے سکتے ہیں یعنی سماج کا اشتراکی ڈھانچہ بنانا، اور علاقائی تفریق پسندی کے رجحان کو دبا کر قومی یک جہتی کی روح کو ابھارنا۔

سماج کے اشتراکی ڈھانچے کا نظریہ جو دولت کی منصفانہ تقسیم کے تصور پر مبنی ہے اسلام کے معاشی تصورات سے قریب تر ہے۔ اگر مسلمانوں کو وضاحت سے سمجھایا جائے اور ان کو معقول طریقے سے یقین دلا دیا جائے کہ اس کے پیچھے مارکسزم یا کوئی اور مخالف مذہب فلسفہ نہیں بلکہ محض معاشی انصاف کا جذبہ ہے تو ان کے دل کو ضرور لگے گا اور وہ اس کو عملی جامہ پہنانے میں جوش اور خلوص سے مدد کریں گے۔ اس بات پر ہم آگے چل کر کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آج جب ہندوستانی مسلمان اپنے مستقبل کے بارے میں ایک ذہنی دھندلکے کے عالم میں ہر وہ چیز جو بجلی کی لپک کی طرح کبھی کبھی بادلوں میں روشنی کی جھلک پیدا کر دیتی ہے، اشتراکی ڈھانچے کا خیال ہے۔ اس لئے یہ توقع کرنا بے جا نہیں کہ جب وہ "چہ کنم" کی حالت سے نکل کر یکسوئی سے سوچنے کے قابل ہوں گے تو اس عام تصور کے سرگرم حامی بن جائیں گے

سماج کے اشتراکی ڈھانچے کی تحریک کو صحیح رخ دینے اور آگے بڑھانے میں ایک زبردست قوت ثابت ہوں گے بہ شرطے کہ وہ یہ محسوس نہ کریں کہ وہ باہر کے آدمی ہیں جن کا قومی زند کی تشکیل میں کوئی حصہ نہیں۔

اسی طرح علاقائی تفریق پسندی کے مقابلے میں قومی یک جہتی کا جھنڈا بلند کرنے کی مسلمانوں میں بالقوۃ بڑی صلاحیت ہے جس کا قوت سے فعل میں آنا اس پر موقوف ہے کہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو ہندوستانی قوم کا ایک لازمی جزو سمجھیں۔ یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ مسلمان جس علاقے میں رہتے ہیں اس سے انھیں لگاؤ نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ سیاسی شعور رکھنے والے مسلمان خواہ ملک کے کسی حصے کے باشندے ہوں مجموعی طور پر ایک کل ہند انداز رکھتے ہیں جو تاریخی قوتوں نے ان میں پیدا کیا ہے۔ یہ ابھی تک قومی اندازِ نظر نہیں ہے مگر اس میں قدرتی طور پر قومی بننے کا رجحان موجود ہے اس لئے کہ جب مسلمان کسی مسئلے کو سارے ملک کے مسلمانوں کا مفاد سامنے رکھ کر سوچیں گے تو انھیں یہی معلوم ہوگا کہ پوری مسلم جماعت کا مفاد پوری ہندوستانی قوم کے مفاد سے الگ نہیں ہے۔ غرض مسلمانوں کا اضافی حیثیت سے وسیع اندازِ نظر قومی یک جہتی کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے اگر ان کے دلوں کو قومی مقصد کی حمایت کے لئے جیت لیا جائے۔

اس طرح ہماری قومی بیرونی پالیسی یعنی سب ملکوں سے دوستانہ تعلقات اور سب کی رائے عامہ کو امن عالم کے حق میں اور تیسری جنگ عظیم کے خلاف ہموار کرنا ہندوستانی مسلمانوں کے تعاون کے بغیر پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اس کو کامیاب بنانے کے لئے ہندوستان کو خاص طور پر ایشیائی اور افریقی ملکوں کی مدد پر بھروسہ کرنا ہے اور وہ انڈونیشیا سے لے کر مغربی ایشیا تک اور مصر سے لے کر مراکو تک زیادہ تر مسلمان ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اب ان سب ملکوں میں قومیت کا دور دورہ ہے مسلمانانِ عالم کے سیاسی اتحاد کی تحریک بالکل مردہ ہو چکی ہے اور کچھ مغربی طاقتوں کی یہ کوشش کہ اس کو نئے سر سے زندہ کریں کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس لئے ان میں سے کسی ریاست کے مسلمان

اپنی قومی سیاست کی تشکیل میں کسی دوسری ریاست کے مسلمانوں کی رائے سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوتے۔ پھر بھی ان سب میں اسلامی اخوت کا جذبہ باقی ہے اور انھیں ہندوستانی مسلمانوں سے اتنی ہی دلچسپی اور اتنا ہی انس ہے جتنا دنیا کے کسی اور حصے کے مسلمانوں سے۔ چنانچہ ان سے عام دوستانہ تعلقات اور تہذیبی داد و ستد رکھنے کے لئے جو سیاسی یک جہتی کی ناگزیر بنیاد ہے ہندوستانی مسلمانوں کا توسط بہت ضروری ہے۔ مگر یہ تبھی ہو سکتا ہے جب مسلمانوں کو اپنے اندرونی مسائل کی طرف سے معقول حد تک اطمینان حاصل ہو، وہ قومی معاملات میں دل سے دلچسپی لیں اور دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے اخوت اسلامی اور مفاد قومی کو مدنظر رکھ کر تہذیبی تعلقات کی تجدید کریں۔

جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ قومی یکجہتی کے سلسلے میں جو مسائل اس وقت ہمارے ملک کو درپیش ہیں ان میں فوری طور پر سب سے ضروری اور ملک کے مفاد کے لئے سب سے اہم یہ مسئلہ ہے کہ کس طرح ہندوستانی مسلمانوں کو قومی زندگی کے اصل دھارے سے الگ ہو جانے سے روکا جائے کیونکہ اس سے ملک کی اندرونی ترقی اور خوش حالی اور بیرونی قوت اور وقار کو نقصان پہنچے گا۔ خود مسلمانوں کے لئے اس کے جو افسوس ناک نتائج ہوں گے ان کا ذکر آگے آئے گا۔

(۲)

یہ پس منظر ہے جسے نظر میں رکھ کر ہم ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلے پر اس شکل میں جو اس نے آزادی کے بعد اختیار کر لی ہے، غور کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک کے بہت سے سیاستداں جن کی زندگی اور فکر موجودہ لمحے تک محدود ہے تعجب سے پوچھیں گے کہ کیا اب بھی ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی مسئلہ ہے؟ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا مسئلہ اس وقت تک اہمیت رکھتا تھا جب تک وہ ہندوستان کے آئینی سوال کے طے کرنے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ ملک کی تقسیم اور نئے آئین کے بن جانے کے بعد ان کے نزدیک اب ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے سوا اس کے کہ ان سے عام انتخابات میں

ووٹ کیسے لئے جائیں۔ ان حضرات سے جو عام طور پر ملک کی ترقی پسند سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں، زیادہ سیاسی بصیرت تو ان رجعت پسند اور فرقہ پرور کہلائے جانے والے لوگوں میں ہے جو یہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کا مسئلہ ہندوستان میں نہ صرف موجود ہے بلکہ فوری توجہ کا محتاج ہے۔ مگر ان کی بصیرت کی حد بس یہیں تک ہے۔ وہ مسئلے کے وجود سے چشم پوشی نہیں کرتے لیکن اس کی نوعیت کا آزادی سے پہلے بھی غلط تصور رکھتے تھے۔ جب غلط فہمی کی کچھ وجوہ تھیں اور آج بھی اسی مغالطے میں مبتلا ہیں جب کہ اس کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ اس کی کسی قدر تفصیلی بحث آگے آئے گی یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ مسلمانوں کا مسئلہ دراصل ان تین بنیادی مسائل میں سے تھا جو انیسویں صدی میں برطانوی حکومت اور جدید مغربی تہذیب کی ٹکر سے ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ایک یہ تھا کہ ہندو جو کم و بیش تین ہزار سال سے اپنے آپ کو نئی نئی ذہنی اور تہذیبی قوتوں سے ہم آہنگ کرتے آئے تھے۔ اب اس تازہ ترین عالمی قوت سے جو جدید مغربی تہذیب کہلاتی ہے کس طرح ہم آہنگ کریں۔ یہ اصلی ہندو مسئلہ تھا۔ دوسرا یہ تھا کہ مسلمان جو کسی زمانے میں خود ایک عالمی تہذیبی تحریک کے بانی تھے اور پھر ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک مشترک قومی تہذیب بنا چکے تھے اس نئی عالمی تحریک سے جو جدید مغربی تہذیب کے روپ میں آئی ہے اور برطانوی سیاسی قوت کے ساتھ مل کر قریب قریب ناقابل مزاحمت بنتی جا رہی ہے کس طرح نبٹیں۔ یہ اصلی مسلم مسئلہ تھا۔ تیسرا یہ قومی مسئلہ تھا کہ کس طرح ہندو مسلمان مل کر اپنے ملک کو بیرونی حکومت سے آزاد کریں اور قومی جمہوری حکومت قائم کریں جیسی مغربی ملکوں میں عام طور پر پائی جاتی تھیں۔

مگر اسی زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے پرانے جاگیردار طبقوں میں جو اپنے ذاتی اور طبقاتی مفاد کو قومی مفاد سمجھتے تھے اس لئے رسہ کشی ہو رہی تھی کہ نئی بدیسی حکومت کے الطاف و عنایات حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جائیں۔ ان لوگوں نے اس ہیجان سے فائدہ اٹھا کر جو تہذیبی بحران نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پیدا کر دیا تھا ہندو مسئلے اور مسلم مسئلے کو جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے فرقہ واری سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی اور برطانوی حکمرانوں نے عام طور پر

(بہت سے افراد کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جو ہماری عزت اور محبت کے مستحق ہیں) اس معاملے میں نہ صرف ان کی مدد کی بلکہ بعض صورتوں میں رہنمائی کی۔ اس سے ہمیں دو طرح کا نقصان ہوا۔ ایک تو قومی تحریک کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوئی دوسرے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مغربی تہذیب کے چیلنج سے روحانی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کا جتنا جوش پیدا ہوا تھا اس کا رخ فرقہ وارانہ سیاست کی طرف پھر گیا۔ مسلم مسئلہ یہ سمجھا جانے لگا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کے ذریعے قانون ساز کونسلوں میں بہت زیادہ نشستیں اور نامزدگی کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ملازمتیں حاصل کی جائیں اور ہندو مسئلہ یہ بن گیا کہ مغربی تعلیم میں مسلمانوں سے تقریباً نصف صدی آگے ہونے کی وجہ سے تعلیم یافتہ ہندوؤں کو جو غلبہ کونسلوں اور ملازمتوں میں حاصل ہے وہ قائم رہے۔ اس پر ہندو مسلم فرقہ پرور جماعتیں متفق تھیں کہ برطانوی اقتدار کسی نہ کسی شکل میں قائم رہے۔ اور جاگیرداری نظام کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھالے رہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ملک میں گاندھی جی کے سوا کسی کو روحانی، اخلاقی، معاشرتی مسائل سے حقیقی دلچسپی نہیں رہی۔ تقریباً سبھی لوگوں کے نزدیک صرف تین مسئلے اہمیت رکھتے تھے اور توجہ کے مستحق تھے۔ مسلمانوں کا سیاسی مسئلہ، ہندوؤں کا سیاسی مسئلہ اور قومی سیاسی مسئلہ۔ گاندھی جی کے تعمیری کاموں کو چھوڑ کر ملک میں ہر نئی تحریک خواہ اس کا مقصد کچھ بھی ظاہر کیا جائے سیاسی تحریک بن جاتی تھی جو قومی یا فرقہ واری یا ملے جلے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ان کی باہمی کشمکش کی وجہ سے ہندوستان کا سیاسی مسئلہ اس طرح طے ہوا کہ ملک آزاد ہو کر دو خود مختار سیاسی ریاستوں میں بٹ گیا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا آزادی سے قبل نہ صرف مستقل حقوق رکھنے والے ہندو مسلم بلکہ اور بہت سے لوگ بھی سمجھنے لگے تھے کہ ہندو مسلمانوں کا مسئلہ بنیادی طور پر سیاسی طاقت اور حقوق کی تقسیم کا مسئلہ ہے تو ایک حد تک قابل معافی ہے اس لئے کہ دو سو سال پرانا سیاسی نظام بدل رہا تھا اور نئے سیاسی نظام کا کوئی واضح تصور عام طور پر لوگوں کے ذہن میں نہیں تھا بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ جس طرح اب تک حقوق فرقہ واری اصول پر دئے جاتے تھے آزادی کے

بعد نئے نظام میں بھی حقوق کی تقسیم اسی طرح ہو گی اس لئے اس زمانے میں اپنے طبقے کے مذہب کے نام پر زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل کرنے کا خیال دونوں بڑی مذہبی جماعتوں کے صاحب ثروت طبقوں کے دل ودماغ پر مسلط تھا اور اسی کو وہ اصل مسئلہ سمجھتے تھے۔ لیکن آج نیا ہندوستان ایک سیکولر جمہوری ریاست بن چکا ہے اور اس کے آئین میں سب شہریوں کے حقوق بلا تفریق مذہب وملت یکساں رکھے گئے ہیں۔ ہندوؤں کے مسئلے اور مسلمانوں کے مسئلے کے وہ بدنما نقلی چہرے جو انھیں زبردستی پہنا دئے گئے تھے اتر جانے چاہئیں اور ان دونوں مسائل کو اپنی اصلی شکل میں سامنے آنا چاہیئے۔

آج ہندوؤں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح ذات پات کی تفریق کو جس نے ان کی زندگی کو چھوٹے چھوٹے بکھرے ہوئے جزیروں میں بانٹ رکھا ہے ختم کر کے ایک سالم ہندو سماج بنائیں اس کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ ہندو مذہب کی ان اقدار کو حاصل کریں جنھیں مہاتما بدھ سے کر مہاتما گاندھی تک عظیم الشان اخلاقی معلموں اور مصلحوں نے حاصل کر کے دکھایا ہے اور بدھ اور گاندھی کی طرح ان اقدار کو عقل سے مطابقت دے کر سیکولر سطح پر عالم گیر انسانی اقدار کی حیثیت سے پیش کریں تاکہ سب کے لئے قابل قبول ہوں۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مسلمانوں کے خلاف محاذ بنانے اور ان سے جنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ مسلمان اس کے حل ہونے میں کسی طرح رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔

اسی طرح مسلمانوں کا اصل مسئلہ بھی یہی ہے کہ اپنی روحانی اور اخلاقی اصلاح کی مہم پورے خلوص کے ساتھ جس میں سیاست کا کھوٹ نہ ہو شروع کر کے اسلام کی تعلیم اور تاریخ سے وہ فیضان حاصل کریں جس نے انھیں قرون وسطیٰ میں سینکڑوں سال تک دنیا میں علم اور روشن خیالی، تہذیب اور آزادی کا ہراول بنائے رکھا اور جو سبق مذہب سے سیکھیں اس کا سیکولر زبان میں ترجمہ کر کے اپنے وطن کی نذر کریں کہ سب ہندوستانی اسے سمجھ سکیں اور اپنا سکیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان کو ایک فوری مسئلہ کو بھی حل کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ آزادی

کے بعد انھیں طرح طرح کی مشکلات، شبہات اور تعصبات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے اور اس کی وجہ سے خود ان میں ایک حد تک مایوسی اور محرومی کا احساس، اور وہ بے اعتمادی، غصہ اور غصہ پیدا ہو رہا ہے جو دراصل خوف اور پست ہمتی کا نفسیاتی پردہ ہوا کرتا ہے۔ ان ہمت شکن قوتوں سے نبٹنے کے لئے جنھوں نے باہر سے اور اندر سے ہندوستانی مسلمانوں پر نرغہ کر رکھا ہے انھیں ایک حد تک برادران وطن کے تعاون کی بھی ضرورت ہے مگر زیادہ تر اپنی قوت ایمانی، قوت ارادی اور سعی و عمل پر بھروسا کرنا ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ قومی یک جہتی کی مہم میں جو پچھلے سال سے ہمارے ملک میں ہر قسم کی فرقہ وارانہ کشیدگیوں کو دور کرنے کے لئے شروع ہوئی ہے ہندو فرقہ پروری اور مسلم فرقہ پروری کی روک تھام اور ہندو مسلمانوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے پر بھی زور دیا جا رہا ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس معاملے میں جو طرز فکر عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی اور اس لئے جو علاج تجویز کیا جا رہا ہے وہ بے کار بلکہ شاید خطرناک ثابت ہوگا۔ بظاہر یکجہتی کے علم بردار خصوصاً قومی تعلیم کے سربراہ کار یہ سمجھتے ہیں کہ مذہبی فرقہ پروری کی جڑ مذہبی ناروا داری ہے اور یہ ناروا داری جدا گانہ مذاہب کی جدا گانہ تعلیم سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا علاج ان کے نزدیک یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارے ملک کے اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں ایک عام اخلاقی مذہب انسانیت کی تعلیم دے کر ہماری نئی نسلوں میں روحانی وحدت پیدا کی جائے جو قومی وحدت کے لئے بنیاد کا کام دے۔ ہم اس جذبے اور خلوص کی جو اس طرز خیال کا محرک ہے دل سے قدر کرتے ہیں مگر خود ان خیالات کو سراسر حقیقت سے دور سمجھتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مذہبی فرقہ پروری جس شکل میں آج نظر آ رہی ہے وہ درحقیقت مذہبی ناروا داری پر مبنی نہیں بلکہ اس پر مبنی ہے کہ دور تغیر میں مختلف مذاہب کے لوگوں میں سیاسی معاشی اور تہذیبی طاقت و اقتدار کی کشمکش ایک زبردست الگ کرنے والی قوت بن گئی تھی۔ جن کا مقابلہ قومیت اور سیکولر جمہوریت کی ملانے والی قوتوں سے تھا۔ آخر الذکر قوتیں آزادی

کے بعد ہندوستان میں اتنی مضبوط تو ہوگئیں کہ انھوں نے ایک قومی، سیکولر اور جمہوری آئین بنادیا مگر ابھی اتنی مضبوط نہیں ہوئی ہیں کہ لوگوں کے دلوں سے الگ کرنے والی قوتوں کے تسلط کو دور کرکے انھیں آئین کے اعلیٰ اور پاکیزہ تصورات کو حقیقت کا جامہ پہنانے پر آمادہ کریں۔ اس کے لئے اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں ایک مشترک مذہب کی نظری تعلیم دینے کی ضرورت نہیں بلکہ قومیت اور سیکولر جمہوریت کی عملی تربیت دینے کی۔ ایک مشترک مذہبی تعلیم جو عام مدرسوں میں دی جائے اگر واقعی یک جہتی پیدا کر سکتی ہے تو اس صورت میں جب وہ ہر بچے کے دل سے اس کے مخصوص مذہب کی تعلیم کو بلکہ کسی مخصوص مذہب کے احساس کو محو کردے۔ مگر یہ ہندوستان کے شہریوں کے بنیادی حقوق میں مداخلت سمجھی جائے گی جسے وہ ہرگز برداشت نہیں کریں گے ظاہر ہے کہ مشترک مذہبی تعلیم کے علم برداروں کا یہ منشا نہیں لیکن لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اور ہو رہی ہے کہ مشترک مذہب کے نام سے مختلف مذاہب کی بیخ کنی کرنا منظور ہے۔ اسی لئے ہم اس قسم کی تعلیم کے خیال کو محض بے فائدہ نہیں بلکہ خطرناک اور مضر سمجھتے ہیں۔

بے شک مذہبی تعلیم بھی قومی برادری اور عالم گیر برادری کی تعمیر میں مدد دے سکتی ہے مگر اس طرح کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں کچھ پاکیزہ نفوس بغیر کسی خارجی محرک کے خالص مذہبی جذبے کے تحت اپنی تلقین میں ہر مذہب کی مشترک روحانی اور اخلاقی اقدار پر زور دیں اور اپنے آپ کو ان کا جیتا جاگتا نمونہ بن کر دکھائیں۔ اس طرح کی کوشش مسلمان صوفی اور ہندو بھگت پچھلے زمانے میں کر چکے ہیں، گاندھی جی نے ہمارے زمانے میں کی ہے اور دنوبا بھاوے آج کر رہے ہیں اور ان سے ہمیشہ ایک روحانی ہم آہنگی کی فضا پیدا ہوتی ہے جو ہر قسم کے اتحاد کے لئے سازگار ہے۔ لیکن اس طرح کی بے ساختہ تحریکوں میں جو حقیقی مذہبی شعور کے سرچشمے سے نکلتی ہیں، اپنے آپ کو زبردستی کسی پر مسلط نہیں کرتیں بلکہ صرف اپنی روحانی اندرونی قوت پر بھروسا کرتی ہیں اور حکومت کی ساختہ پرداختہ مذہبی تعلیم میں جسے سیاسی غرض سے خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو اوپر سے نافذ کیا جائے بہت فرق ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تحریکیں استبدادی حکومتوں کے زمانے میں بھی کامیاب

نہیں ہو سکیں، تو آج جمہوریت کے زمانے میں کیا ہوں گی مگر ان کو چلانے کی کوششیں بھی ملک میں تباہی مچا سکتی ہیں۔ اس لئے ہمیں بھول کر بھی اس کا خیال نہ کرنا چاہیئے۔

غرض مذہبی فرقہ پروری کا مسئلہ مشترک مذہبی تعلیم سے نہیں بلکہ شہریت کی مشترک تربیت سے جو ایک قومی جمہوریت اور سکولر ریاست کے ہر فرد کو ملنی چاہیئے حل ہو سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مختلف مذہبی فرقوں کو ملا کر ایک قوم بنانے کا کام جہاں تک وہ حکومت یا سیاسی اور ذہنی قیادت کو کرنا ہے مذہبی سطح پر نہیں بلکہ سیکولر سطح پر ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے مگر یہاں اس بات کو واضح کر دینا ضروری ہے کہ فرقہ پروری اور فرقہ وارانہ شعور میں فرق ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ نہیں کر دینا چاہیئے۔ ایک زبان کے بولنے والوں یا ایک مذہب کے ماننے والوں میں باہم وابستگی کا احساس، ان کا باہم مل کر اپنے مشترک مقاصد کو حاصل کرنے یا اپنے مشترک مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا ہرگز برا نہیں۔ وہ تو ایک قدرتی اور جائز بلکہ ضروری اور مستحسن چیز ہے۔ فرقہ وارانہ شعور فرقہ پروری کی ناجائز اور قابل ملامت شکل اس وقت اختیار کرتا ہے جب وہ اپنے فرقے کی بے جا تائید کرنا، اس کے لئے ناواجب حقوق کا مطالبہ کرنا، دوسرے فرقوں سے نفرت کرنا، ان کو واجب حقوق دئے جانے کی مخالفت کرنا یا اپنے فرقے کے جزوی مفاد کو ملک و قوم کے وسیع تر مفاد پر ترجیح دینا سکھاتا ہے۔ اس لئے ہم ہندو فرقہ پروری اور مسلم فرقہ پروری کی جتنی مخالفت بھی کریں وہ کم ہے مگر ہمیں ہندوؤں اور مسلمانوں سے اس کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ بہ حیثیت الگ الگ جماعتوں کے اپنے مشترک مسائل کو حل کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سچ پوچھئے تو جیسا ہم نے اوپر کہا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے جلد سے جلد اس مسئلے کو حل کرنا ناگزیر ہے کہ وہ کس طرح اپنے ماضی سے جس پر مذہب کا گہرا رنگ چھایا ہوا ہے قطع تعلق کئے بغیر عہد جدید کی زندگی سے جو تمام تر سیکولر ہے ہم آہنگی پیدا کریں۔ جب تک یہ مرحلہ سر نہ ہو جائے وہ مشترک سیکولر سطح وجود ہی میں نہیں آئے گی جس پر دونوں مل کر متحدہ قومیت کی مضبوط اور پائدار عمارت قائم کر سکیں۔

مسلمانوں کے لئے جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس اصلی مسئلے کے علاوہ ایک فوری مسئلہ ان گوناگوں

مشکلات کا بھی ہے جن کا انھیں آزادی کے بعد سامنا کرنا پڑ رہا ہے جب تک یہ فوری مسئلہ حل ہو نہیں وہ سکون خاطر اور وہ توازن فکر حاصل نہیں ہو سکتا جو اصلی مسئلے سے نبٹنے کے لئے ضروری ہے۔

یہ کتاب جو آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے ہندوستانی مسلمانوں کے فوری مسئلے اور اصل مسئلے کو خود انھیں اور دوسروں کو وضاحت کے ساتھ سمجھانے کی ایک کوشش ہے اور اس یقین کے ساتھ لکھی جا رہی ہے کہ اگر ایک بار ان مسائل کو صحیح طور سے سمجھ لیا جائے اور ان کی حقیقی اہمیت کا اندازہ ہو جائے تو ملک کی تمام صحت مند قوتیں مل کر ان کو حل کرنے میں لگ جائیں گی اور حل کر کے چھوڑیں گی۔

بہ ظاہر اس مطالعے کی دو شقیں ہونی چاہئیں :۔

(۱) ہندوستانی مسلمانوں کے حالات میں آزادی کے بعد کیا تغیر ہوا ہے ؟ کون سی مشکلات ہیں جنھوں نے ان کے ذہن کو الجھن میں ڈال رکھا ہے اور مستقبل کی طرف سے فکر مند کر رکھا ہے ؟ مستقبل کی تشکیل کے بارے میں ان میں کیا کیا خیالات اور رجحانات پائے جاتے ہیں ؟

(۲) ان کے موجودہ حالات کو درست کرنے اور مشکلات کو دور کرنے کی مناسب اور قابل عمل صورت کیا ہے ؟ اور آئندہ کے لئے انھیں فکر و عمل کی کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے جو خود ان کی روحانی اور مادی ترقی اور انھیں ہندوستانی قوم کا صالح اور اہم لازمی جزو اور انسانی برادری کا مفید رکن بننے میں مدد دے۔

مگر چونکہ ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ خیالات اور رجحانات کا اچھی طرح سمجھنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ماضی قریب کی فکر و عمل کی ان تحریکوں پر ایک نظر ڈالی جائے جنھوں نے مسلمانوں کے ذہنوں پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ اس کے نقش آج تک باقی ہیں۔ اس لئے یہ مناسب ہوگا کہ ایک تیسری شق پر بھی بحث کی جائے اور وہ یہ ہے کہ پچھلے سو سال میں جو مختلف سیاسی اور تہذیبی تحریکیں اٹھیں ان کی جھلک ہمیں آج مسلمانوں کے مختلف ذہنی رجحانات میں کہاں تک نظر آ رہی ہے۔ اس لئے ہم اس کتاب کو جس کا عنوان "ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں"

ہے۔ تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

حصّہ اول — کل کی پرچھائیاں

حصہ دوم — آج کا دھندلکا

حصہ سوم — کل کیا؟ اندھیرا یا روشنی

پہلے حصے میں مسئلے کے تاریخی پس منظر سے، دوسرے میں اصل مسئلے سے اور تیسرے میں اس کے حل سے بحث کی جائے گی۔

آخر میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ایسے موضوع پر جس کا نہ صرف ہماری ناگزیر انفرادی اور اجتماعی اغراض سے بلکہ ہمارے گہرے جذبات و احساسات سے گہرا تعلق ہے، خالص معروضی نقطۂ نظر سے لکھنا نہایت مشکل ہے۔ میں نے اپنے نزدیک اس کی پوری کوشش کی ہے، جہاں تک ایک انسان کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کی آپ مجھ سے توقع نہیں کر سکتے۔ مگر ہم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کتابوں کو جو اس موضوع پر لکھی گئی ہوں ٹھنڈے دل سے صبر و سکون کے ساتھ پڑھنا بھی اتنا ہی مشکل ہے اور میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اس کی انتہائی کوشش، جہاں تک انسان کر سکتا ہے، کیجیے۔ اس سے زیادہ کی میں آپ سے توقع نہیں کر سکتا۔ مگر وطن کی محبت اور حق کی محبت جو آپ کے دل میں ہے آپ سے مطالبہ کرتی ہے کہ آپ اس سے کم بھی نہ کریں۔

آزاد ہندوستان میں عربی اور فارسی کا مطالعہ

ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی، ریڈر شعبۂ فارسی دلی یونیورسٹی

عربی اور فارسی زبانیں ہمارا وہ بیش بہا تہذیبی ورثہ ہیں جو ہیں اپنی عہد وسطیٰ کی تاریخ نے دیا ہے۔ عربی مذہبی اور اسلامی زبان کی حیثیت سے ہم تک پہنچی، لیکن فارسی جو صدیوں تک ہندوستان کی درباری زبان رہی ایک ثقافتی زبان مانی گئی ہے۔ مغل دور میں فارسی اور عربی کو ایک قابل رشک اہمیت حاصل رہی ہے۔ اگرچہ یہ دونوں زبانیں دو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اس طرح سے ملیں جیسے ایک ہی خاندان کی دو فرد ہوں۔ کئی سو برس میں ان زبانوں میں تقریباً سب ہی علوم سے متعلق ایک عظیم سرمایہ عالم وجود میں آیا ہے۔

انگریزی حکومت کے قیام اور ہندوستانی زبانوں کی نشو ونما کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان زبانوں کا دائرہ محدود ہوتا گیا پھر بھی ان کا شمار کلاسیکی ادب میں ہوتا ہے۔ اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب کا جزو اور اہم مرتبہ کی حامل ہیں۔

آزادئ ہند کے بعد ایک بار پھر صحیح طور پر ان دونوں کلاسیکل زبانوں کے مطالعہ کی اہمیت محسوس کی گئی، عربی نہ صرف اس وجہ سے پڑھی جاتی ہے کہ وہ ایک اسلامی زبان ہے بلکہ وہ عرب ممالک کی زندہ زبان بھی ہے فارسی کی تحصیل صرف اس وجہ سے نہیں کی جاتی کہ وہ فارسی بولنے والے ملکوں کی زبان ہے بلکہ اس کا مطالعہ اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ وہ قرون وسطیٰ کی معاشرت کی آئینہ دار ہے۔ ان دونوں زبانوں کا مطالعہ مشرق وسطیٰ کے ممالک سے ثقافتی تعلقات مضبوط کرنے میں زیادہ سے زیادہ معاون ثابت ہوگا اور اس کی وجہ سے ہم ان ممالک کی سیاسی، سماجی، تمدنی، ادبی اور مذہبی زندگی کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

اسی خیال سے بہت سے ادارے یا تو از سر نو قائم کئے گئے ہیں۔ یا ان کی دوبارہ تنظیم کی

گئی ہے۔ اس قسم کا سب سے پہلا ادارہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن ہے جو ۱۸۸۸ء میں قائم کیا گیا۔ یہی وہ پہلا ادارہ ہے جس نے خاص طور پر اپنی عربی مطبوعات کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ آزادی کے بعد سے اس ادارہ نے مندرجہ ذیل کتابیں شائع کی ہیں:۔

التاریخ الکبیر نزہۃ الخواطر کتاب الروح کتاب الحاوی فی الطب

فی تحقیق ما للہند دیوان ابن سناء الملک الموضح لاوہام الجمع والتفریق بیان خطاء البخاری

تاریخ جرجان مرآۃ الزمان تاریخ اصبہان ذیل مرآۃ الزمان۔

امالی کتاب المعانی الکبیر التحلیل والترکیب الہندسہ والنجوم

الاصول الہندسیۃ لارشمیدس الا دائرۃ المتماسۃ لارشمیدس۔ استخراج الاوتار تمہید المستقر

تحقیق معنی المر مقالۃ فی راشیکات الہند۔ افراد المقال فی امر الظلال تصحیح زیج الصفائح

اصلاح شکل مانالاوس منازعۃ اعمال الاصطرلاب۔ دوائر السموات فی الاسطرلاب۔

تاریخ الیہود۔ استخراج تخطیط الساعات الزمانیہ بساحۃ الجسم المکافی

کیفیۃ تسطیح الکرہ فی ان الاشکال کلہا من الدائرہ۔ المقادر المشترکہ الشکل القطاع

صور الکواکب۔ القانون المسعودی۔

دارالمصنفین اعظم گڈھ جو شبلی اکیڈیمی بھی کہلاتا ہے، ۱۹۱۵ء میں مولانا شبلی نعمانی کے ادبی مشن کو پورا کرنے کے لئے قائم کیا گیا۔ مولانا کی کچھ کتابوں کا ترجمہ مصر، ترکی، ایران اور افغانستان میں ہوا ہے۔ اس ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والا رسالہ معارف اردو میں سب سے پرانا ماہنامہ ہے۔ دارالمصنفین سے عربی اور فارسی تحقیقات پر یہ کتابیں شائع ہوئی ہیں:۔

تاریخ سندھ تالیف سید ابوالظفر ندوی۔ بزم تیموریہ اور بزم مملوکیہ، تالیف سید صباح الدین عبدالرحمن، تاریخ اندلس تالیف سید ریاست علی ندوی، حکمائے اسلام، تالیف مولانا عبدالسلام ندوی۔

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے قیام کا مقصد ایران

افغانستان، ترکی اور عرب ممالک کی زبان اور ادب کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس ادارہ سے ایک تحقیقی رسالہ "مجلۂ علوم اسلامیہ" شائع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ادارہ نے چند کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ مثلاً البیان فی اعجاز القرآن مرتبہ ڈاکٹر عبدالعلیم، شریف الادریسی کی کتاب ہندوستان اور اس کے پڑوسی ممالک (عربی متن) مرتبہ ڈاکٹر ب۔ مقبول احمد۔ انقلاب کے بعد کا فارسی ادب از ڈاکٹر منیب الرحمٰن، اور المسعودی کی یادگاری جلد۔

پٹنہ میں بہار گورنمنٹ نے ایک ادارہ پوسٹ گریجوایٹ اسٹڈیز اور عربی و فارسی کی تحقیقات کے لئے قائم کیا ہے۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام ڈاکٹر سید احمد نے کتاب الوصیۃ پروفیسر عطاء الرحمٰن نے سفینۂ ہندی، پروفیسر سید حسن نے مولانا برہان الدین مظفر شمس بلخی کے مجموعۂ اشعار، دیوان رکن الدین، مثنوی والہ و سلطان، دیوان مولانا محمد صوفی مازندرانی، تذکرہ خلاصۃ الکلام، دیوان اثیر امانی اور پروفیسر سید علی حیدر نے رسالۂ مغنیان ہند، عروض الہند، مثنوی آصف نامہ، دیوان ارسلان، دیوان حکیم پریشان، تذکرہ ریاض الافکار مرتب کیا ہے۔ نیز مندرجہ ذیل مضامین پر اس ادارہ میں تحقیقات کا کام جاری ہے:۔

حجاز بن یوسف کی زندگی اور کارنامے، حیات و تصانیف مولانا شمس الحق دیانوی، حیات و تصانیف مرزا معز فطرت موسوی خان، کشن چند اخلاص اور ان کا تذکرہ ہمیشہ بہار، حیات و تصانیف ظہور الحق تپاں۔

انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، ایک سہ ماہی رسالہ "ثقافت الہند" نکالتی ہے اس کے علاوہ اس نے فارسی سنسکرت گرامر، بھگوت گیتا (فارسی) شکنتلا (فارسی) وکرم اروشی (فارسی) اور میراث ہند (عربی) شائع کی ہیں۔

ایران سوسائٹی، کلکتہ ایک سہ ماہی مجلہ "انڈو ایرانیکا" جو فارسی اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے نکالتی ہے۔ اس کے علاوہ البیرونی اور ابن سینا کی یادگاری جلدیں اور دوسری کتابیں شائع کی ہیں۔

انجمن فارسی مخطوطات، حیدرآباد نے امیر خسرو کا تغلق نامہ، سید علی طباطبائی کی برہان معاصر، علی بن حمید الکوفی کا چاچ نامہ، اور محمد گاوان کی ریاض الانشا جیسی کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ انجمن خسرو کی غرۃ الکمال، فضل اللہ روزبہان کی سلوک الملوک اور تاریخ قطب شاہی شائع کرنے والی ہے۔

نیشنل آرکائیوز آف انڈیا CALENDAR OF PERSIAN CORRESPONDENCE کی آٹھویں نویں اور دسویں جلدیں نیز DESCRIPTIVE LIST OF MUTINY PAPERS کی جلد اول جو بھوپال کے نیشنل آرکائیوز میں تھی شائع کی ہے۔

مدراس کی GOVERNMENT ORIENTAL MANUSCRIPTS LIBRARY نے فارسی اور عربی کی حسب ذیل کتابیں شائع کی ہیں :-

جوامع الاشیا، سفینۂ طب فریدی، تحقیق البرہان، سفینۃ النجات، شواکل الحور فی شرح ہیاکل النور، نسخۂ شاہجہان، تزک والاجاہی، واقعات عضفری، رقعات والاجاہی بہارستان سخن، تحفہ خانی، نسخہ جات مجرب، سوانحات ممتاز، تاریخ حفیظ اللہ خانی، بہار اعظم جاہی۔

سری نگر کی جموں اور کشمیر اکیڈمی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ کشمیر میں جس فارسی ادب کی نشو ونما ہوئی ہے اس کا مطالعہ کیا جائے۔ اس اکیڈمی نے دیوان طاہر غنی مرتبہ علی جواد زیدی شائع کر دیا ہے۔ اور مثنویات فانی کشمیری مرتبہ ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی شائع کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ اس ادارہ کا خیال ہے کہ ملا صرفی اور میر علی ہمدانی کی تصنیفات کو شائع کیا جائے۔ یہاں سے ایک مجلہ شیرازہ بھی نکلتا ہے۔

ادارہ تحقیقات و مطبوعات، سری نگر نے تاریخ حسن کئی جلدوں میں شائع کی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ادارہ ان مخطوطات کو بھی شائع کرنا چاہتا ہے جو کشمیر سے متعلق ہوں۔

امیر خسرو اکیڈمی ابھی حال ہی میں قائم ہوئی ہے اور اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ امیر خسرو کی تصنیفات شائع کی جائیں نیز ہندوستان کے دوسرے صوفی شاعروں اور مصنفوں

کے کارناموں کا مطالعہ کیا جائے۔

مذکورہ بالا اداروں کے علاوہ ملک کی بہت سی یونیورسٹیاں عربی اور فارسی ادب کے متعلق تحقیقی کام کر رہی ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے استادوں میں ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم نے نایاب دیوان فلکی، مغل شاعری۔ اس کی تاریخی اور تمدنی اہمیت، نایاب دیوان شہنشاہ ہمایوں، زندگی و آثار قاسم کاہی، نایاب دیوان قاسم کاہی، مجموعہ مقالات اور ادب فارسی میں مطالعے جیسی کتابوں کو لکھا یا اڈٹ کیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے تاریخی و ادبی مطالعے، حیات و تصنیفات ظہوری جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے معراج العاشقین بھی مرتب کی ہے۔ ڈاکٹر سید مقبول احمد نے ادریسی کی کتاب ہندوستان اور اس کے پڑوسی ممالک کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ ڈاکٹر شمون اسرائیلی نے حیات و تصنیفات عمادی لکھی اور دیوان قاسم منیترہ اردو دیوان اہلی خراسانی مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر نبی ہادی نے طالب آملی کی زندگی اور تصنیفات پر کام کیا ہے۔ اور ڈاکٹر ام ہانی فخرالزمانی نے نفائس المآثر مرتب کی ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل مضامین پر تحقیقی کام ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے۔

حیات و آثار غزالی مشہدی، تحول نثر فارسی در عہد مغولان، فارسی تذکرے جو ۱۵۵۰ء سے ۱۶۵۰ء تک ہندوستان میں لکھے گئے، غزلیات نوعی کا تنقیدی اڈیشن، مغل بادشاہوں کی فارسی ادب و علوم کی پشت پناہی، خلجی عہد میں فارسی ادب، دیوان مطہر کا تنقیدی ایڈیشن، عہد تغلق میں نثر فارسی دیوان جوبلقانی کا تنقیدی اڈیشن، غزلیات عرفی کا تنقیدی اڈیشن، پندرھویں اور سولہویں صدی میں ہندوستانی فارسی ادب، مغلیہ عہد میں شعرائے کشمیر، سبحۃ المرجان اور حماسۃ البصریہ کے انتقادی ایڈیشن، عرب لیگ، زندگانی و آثار محمد عبدہ، جمال الدین افغانی کے مذہبی خیالات، ہندوستان میں عربی شاعری۔

اعلیٰ حضرت ہمایوں شہنشاہ ایران کے عطیہ سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے روضات الجنات فی اوصاف مدینۂ ہرات مرتبہ ڈاکٹر محمد اسحاق، گلزار حال مرتبہ ڈاکٹر تاراچند اور ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی، مکاتیب سنائی مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد، شائع کیا ہے نیز یوگ شست کا فارسی ترجمہ

بھی شائع کر رہی ہے۔ یونیورسٹی نے پروفیسر خلیق نظامی کی کتابیں حیات و اشعار شیخ فریدالدین گنج شکر اور خیرالمجالس بھی شائع کی ہیں۔ یہاں سے ایک سہ ماہی رسالہ "فکر و نظر" بھی نکلتا ہے۔

کلکتہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر زبیر صدیقی کی کتابیں عربی و فارسی میں طبی ادب احادیث۔ ان کا آغاز، تحول اور خصوصیات جیسی کتابیں شائع کی ہیں۔ موخرالذکر کتاب کی دوسری اور تیسری جلدیں بھی بعد میں شائع کی جائیں گی۔ اس وقت ڈاکٹر موصوف "عورتوں کا اجتماعی درجہ اور ایشیا اور یورپ کے کچھ حصوں میں ان کی ثقافتی اور سماجی سرگرمیاں" لکھنے میں معروف ہیں۔ اسی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ڈاکٹر سید امام الدین نے تاریخ خان جہانی مرتب کی ہے۔ نیز ڈاکٹر دکرامت حسرت نے سر اکبر اور فضل محمود نے شاہ ولی اللہ کی حیات اور ان کی حجۃ اللہ البالغہ پر تحقیقی کام کیا ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ڈاکٹر محمد معید خاں نے الاساطیر العربیہ، تاریخ زبان عربی اور گولکنڈہ کے عربی شعراء جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ نیز انھوں نے کتاب التشبیہات، ابن سینا کا تعبیر اور فضل اللہ رازی کی کتاب الفراسہ کو مرتب کیا ہے۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب موصوف پیغمبر محمد کی زندگی ان کے زمانے کی شاعری کی بنیاد پر اور کتاب وجوہ الاعراب القرآن، اور غرایب الحدیث کی ترتیب میں معروف ہیں۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید اور ڈاکٹر شریف النساء نے فارسی شاعری میں نعتیہ شاعری کا ارتقا اور ابو طالب حکیم پر کام کیا ہے۔ ڈاکٹر سید ابوالفضل نے دیوان عسقلانی مرتب کیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ حضرات منعم خاں کی سوانح دکن، لچھمن نرائن شفیق کی مآثر آصفی، زمخشری کی المستقصی، فریدالدین رازی کی الامامہ، دیوان باقر آگاہ، دیوان سید علی ابن معصوم وغیرہ مرتب کر رہے ہیں۔ ایک صاحب اردو زبان و ادب پر عربی کے اثر پر کام کر رہے ہیں۔

دہلی یونیورسٹی میں ڈاکٹر خورشید احمد فارق نے خلیفہ حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط خلیفہ حضرت ابو بکرؓ کے سرکاری خطوط، ساتویں صدی کے ایک عرب سیاست داں، تاریخ ہند پر نئی روشنی، زید بن ابیہ اور تاریخ ردہ لکھی ہیں۔ موصوف اس وقت عربی ادب کی تاریخ، خلیفہ حضرت عثمان کے سرکاری خطوط، عرب سیاست داں۔ ہند عربوں کی نظر میں، مختار

بن عبید جیسی کتابوں کے لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف ابن حبیب بغدادی کی کتاب منمق کو ترتیب دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی نے ابوطالب حکیم پر تحقیقی کام کیا ہے اور بہت سی فارسی کی اہم کتابوں اور مخطوطات جیسے بزمی کی پدماوت اور عصمت نامہ، کو ترتیب دینے میں مصروف ہیں اور کچھ کو مرتب کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف ایک اور کتاب مرتب کر رہے ہیں جس کا نام ہے فارسی ادب میں ہندوستانی قصے۔ ڈاکٹر آہوجہ نے شیخ عراقی اور ان کی لمعات پر تحقیقی کتاب لکھی ہے اور مدھا ونلا اور ابوالفضل کی ارجن گیتا کو مرتب کیا ہے اور کچھ مشہور ہندی قصول پر کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد مرسلین نے طالب آملی، ڈاکٹر چودھری نے حجاج ابن یوسف پر تحقیقی کام کیا ہے۔ عربی و فارسی کا یہ شعبہ ہندوستان میں فارسی ادب کی مفصل تاریخ تیار کرنے میں مصروف ہے۔ وہ مضامین جن پر اس وقت کام ہو رہا ہے مندرجہ ذیل ہیں:-

اورنگ زیب سے پہلے کی دو صدیوں میں عربی تصنیفات کا تنقیدی جائزہ، زمانہ حال کا عربی ادب اور اس کا آغاز، نپولین کے حملے سے عصر حاضر تک مصر میں عربی ادب کی نشوونما اور ترقی، ہندوستانی فارسی شاعری میں ملکی عناصر، زندگانی و آثار آنند رام مخلص، سترھویں عیسوی کے نصف آخر میں ہندوستان میں فارسی ادب۔

مدراس یونیورسٹی نے کلیات امجدی اور سرخوش کی کلمات الشعراء شائع کی ہے۔ اصل الاصول فی بیان مطابقۃ الکشف بالمعقول والمنقول کو محمد یوسف کوکن عمری نے اور اسمٰعیل اسامی کی فتوح السلاطین، حسین محمد شہاب انصاری کی کنزالفوائد اور عبداللہ ہاتفی کے تیمور نامہ کو پروفیسر اوشا نے مرتب کیا ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں بہت سے تحقیقی کام ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں، مثلاً ہندوستان کے عربی فرہنگ نویس، المتنبی، اسلامی خلافتوں کے دارالسلطنت بعض عرب سیاح اور ان کا علم جغرافیہ میں اضافہ، ہندوستان اور عربستان کے درمیان تجارتی اور ثقافتی تعلقات، علی عادل شاہ بیجاپوری کے درباری شعراء، غازی بیگ ترخان، حیات و تصنیفات عرفی، لودی سلاطین

دہلی المعدذان جو ادب فارسی کا ارتقا، حیات و تصنیفات ابوطالب لندنی، بیرم خاں اور ان کی شاعری، ملک الشعرا بہار کی زندگی اور کارناموں کا تحقیقی مطالعہ، سا سانیوں کے عہد کا ایران اور ہندوستانی اور دوسری معاشرتوں کا اثر۔

بمبئی یونیورسٹی میں اسلام سے پہلے کی ایرانی زندگی فارسی مثنویوں کے آئینہ میں، حکیم اوحدالدین علی انوری کی حیات و تصنیفات کا تحقیقی جائزہ، عہد جہانگیر و شاہجہاں میں فارسی ادب، ابوالفیض فیضی کی حیات و تصنیفات پر اب تک تحقیقی کام کیا جا چکا ہے۔

پٹنہ یونیورسٹی میں ان مضامین پر تحقیقی کام کیا جا چکا ہے یا ہو رہا ہے:- زندگانی و آثار سلیم تہرانی، حیات و آثار ملا سعید اشرف ما زندرانی صفویوں کا نظم سلطنت، موہن لال انیس کے تذکرہ انیس احبا کا تنقیدی اڈیشن۔

بھاگل پور یونیورسٹی میں والہ داغستانی کی حیات و تصنیفات پر تحقیقی کام جاری ہے اگر ہم اپنے مقالہ میں ان اداروں کو شامل نہ کریں جو اصلاً مذہبی ادارے ہیں مگر جنہوں نے عربی اور فارسی ادب کی خدمت کی ہے تو یہ بے انصافی ہوگی۔ ندوۃ المصنفین دہلی کا ایک اردو ماہنامہ برھان ہے۔ اس کے علاوہ اس ادارے نے بہت سی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلوم نے ایک عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے نام سے جاری کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس ادارہ کا خیال ہے کہ نایاب کتابیں شائع کی جائیں۔

یہ مختصر سا خاکہ اس وقت تک پورا نہ ہوگا جب تک ہم ان حضرات کا تذکرہ نہ کریں جو مسلسل عربی و فارسی ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ سب سے زیادہ ممتاز ہستی ڈاکٹر تاراچند کی ہے جنھوں نے ایک ایرانی محقق سید محمد رضا جلالی نائینی کے ساتھ دارا شکوہ کے سر اکبر یا سرالاسرار یعنی اپنیشد کا سب سے پرانا فارسی ترجمہ جو حقیقت میں فارسی ادب میں ایک قابل فخر کام ہے مرتب کیا ہے۔ اس وقت بھی موصوف نائینی صاحب کے ساتھ توضیح الملل یعنی کتاب الملل والنحل کے فارسی ترجمہ، دبستان مذاہب کے کچھ حصوں، اور دارا شکوہ کی تصنیفات کو مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر تاراچند صاحب ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی کے ساتھ

بھی پہنچا گیا ہے، جو بھگوت گیتا کا ایک نایاب فارسی ترجمہ ہے، اور بہت سے دوسرے سنسکرت کے فارسی ترجموں کو مرتب کرنے میں مشغول ہیں۔

قاضی عبدالودود صاحب جو اردو فارسی کے ایک ممتاز محقق ہیں غالب کی قاطع برہان کا ایک انتقادی ایڈیشن مرتب کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف کی زیر نگرانی "تحقیق" بھی نکل رہا ہے۔

ڈاکٹر سدارنگانی نے سندھ کے فارسی شعرا، اور مختصری در تاریخ شعر فارسی در ایران و ہندو سندھ جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر ڈیسائی نے زندگانی و آثار فیضی اور اس کی نل دمن پر کام کیا ہے۔ سید اکبر علی ترمذی صاحب محمود بخاری کی تاریخ سلاطین گجرات کو ترتیب اور ہندوستان کے قرون وسطیٰ کے مورخین پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ یوسف کمال بخاری صاحب خطوط شایستہ خان اور فضل اللہ انصاری کی اسرار الحفظ کو مرتب کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سے ایسے تحقیقی کام ہوئے ہیں جن کے متعلق اطلاع نہ مل سکی۔ ان تحقیقی مقالوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو اسلامک کلچر، معاصر، وغیرہ جیسے رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ ان رسالوں میں سے بعض کا ذکر اس مضمون میں کیا جا چکا ہے۔

اُلٹے قدم

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

بچے مچلتے ہیں تو پھر آپے میں نہیں رہتے۔ کوئی زمین پر لوٹتا ہے تو کوئی چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا لیتا ہے، کبھی آنسو نہیں تھمتے تو کبھی زبان نہیں رکتی۔ مار کاٹ بھی ہوتی ہے، توڑ پھوڑ بھی۔ ذرا سی دیر میں بھولا سے بھتنا بن بیٹھتے ہیں۔ آخر کار بال ہٹ پوری ہو کر رہتی ہے۔

بچے کے اس عمل میں اس کی تربیت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے عمل کے ساتھ ساتھ بڑوں کے ردِّ عمل کو بھی سمجھتا ہے۔ جب سارا کھیل بگڑتا نظر آتا ہے تو وہ سٹ پٹا کر آخری ہت کنڈا استعمال کر ڈالتا ہے یعنی مچل جاتا ہے۔ اس طرح وہ نامناسب اور ناجائز طریقے سے دباؤ ڈال کر اپنا مطلب نکال لینا چاہتا ہے۔ اس کی اپنی خواہشیں اور اپنی ضروریات ہوتی ہیں۔ وہ انھیں ملتوی کرنا بھی نہیں جانتا۔ اس کی دنیا میں کل کا اعتبار نہیں۔ جس قدر چھوٹا ہوتا ہے اسی قدر بے صبرا لیکن انسان کی زندگی میں صرف ایک ہی دَور ایسا آتا ہے جبکہ اس کے احساسِ ضرورت اور تکمیلِ ضرورت کے درمیان کوئی وقفہ نہیں گزرتا۔ اِدھر چاہا، اُدھر ہوگیا۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب شکمِ مادر میں ایک محفوظ زندگی ملتی ہے۔ اس دنیا میں تو ایک دم کے ساتھ ہزار جنجال ہوتے ہیں۔ پیدائش کے ساتھ ساتھ نہ معلوم کتنی ضرورتیں اور جنم لے لیتی ہیں۔ ایسی ضرورتیں جن کی تسکین فوراً ہی ممکن نہیں ہوا کرتی۔ وقت کے سہارے وہ پروان چڑھا کرتی ہیں۔ جتنا منہ لگائیے اتنی ہی پیاس بڑھتی ہے۔ لہٰذا بچہ ہو یا بڑا ہر ایک کے سامنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کا سوال آتا ہے۔ اپنی اپنی زندگی کے تقاضے ہوتے ہیں کچھ پورے ہو جاتے ہیں۔ کچھ پورے نہیں ہوتے، کچھ کا آدھا پونا ہی حق ادا ہو پاتا ہے۔ زندگی کے بازار میں لین دین کا یہ سلسلہ آخری دم تک برابر جاری رہتا ہے۔

بچہ مچل کر اپنا کام نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ دراصل اپنی خفت مٹانے کے لئے یہ ڈھونگ رچاتا ہے۔ لیکن وہ کوئی بھی روپ کیوں نہ دھارے، ساری حکمت عملی یہی ہوتی ہے کہ ذہنی پختگی کی کسی پچھلی سطح پر مورچہ جمایا جائے جبکہ اسے اب سے زائد چھوٹ ملی ہوئی تھی، وہ اپنے آزمائے ہوئے ہی داؤ پیچ چلانا چاہتا ہے۔ لہذا ایک چھوٹا بچہ اور زیادہ چھٹ پن پر اتر آتا ہے۔ ایک نوجوان لڑکپن دکھاتا ہے۔ ایک بڈھا، جوانی کے چونچلوں سے دل بہلاتا ہے دراصل یہ سب اپنے اپنے مچلنے کے انداز ہیں۔ لیکن سب کے پاس گر ایک ہی ہے۔ سب ہی نے منہ موڑ کر دیکھا ہے اور جھٹ سے کود کر اپنے ماضی کے کسی دور میں پہنچ گئے ہیں۔ بچوں کی زندگی میں ڈگمگا جانے کا ایک سنگین موقع اس وقت آتا ہے جب ان کی سلطنت میں کوئی اور آدھمکتا ہے۔ وہ اس غیر متوقعہ آمد کو بن بلایا مہمان سمجھ کر خوش آمدید کہنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر پاتے۔ گھر کی آبادی میں اضافہ ہو جانے کی صورت میں ان کی ذات بہر حال متاثر ہوتی ہے ان کے کچھ نہ کچھ حقوق پامال ہوتے ہی ہیں۔ کم از کم ماں کی گود میں ہی حصہ بٹ جاتا ہے۔ اب ہر گھڑی ماں کا التفات نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس طرح اس ننھے سے معصوم دل پر چوٹ پڑتی ہے وہ اپنے حقوق کی بازیافت کے لئے پلٹا کھاتا ہے اور جانتے بوجھتے نادانی پر اتر آتا ہے۔ اب نہ ہاتھ منہ خود دھوتا ہے، نہ اپنے آپ کو خود صاف رکھ سکتا ہے۔ اب تو وہ یہی چاہتا ہے کہ اُس نو وارد ننھی منی جان کی طرح نہالچے پر لیٹ جائے۔ اسے بھی قطعی غیر ذمہ دار قرار دیا جائے، اس سے بھی کوئی باز پرس نہ ہو، جو جی چاہے وہ کہے، لڑے جھگڑے، دند مچائے۔ اس کی تو دلی خواہش صرف یہ ہے کہ گھر میں اس کے جملہ حقوق محفوظ رہیں۔ جب اس معاملے میں کھنڈت پڑتی دکھائی دیتی ہے تو وہ پچھلی زندگی کی طرف لوٹ جاتا ہے جو اس کے نزدیک اب سے کہیں زیادہ خوشگوار تھی۔ ایسی صورت میں اگر والدین ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ پر اتر آئیں یا بچے کے بگڑ جانے پر آنسو بہائیں تو یہ ان کی بھول ہوگی۔ انھیں بچے کی اس ترقی معکوس کا سبب جانتے ہوئے سمجھداری سے کام لینا چاہیئے۔ انھیں اپنے عمل سے بچے کے دل سے وسوسے دور کر کے اسے مطمئن کرنے کی ضرورت ہے بچے کو جب اطمینان ہو جائے گا

کہ اس کی ذات پر کوئی حرف نہیں آیا ہے اور اس کی حیثیت برقرار ہے تو پھر بچے اور والدین دونوں کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

پیری میں جوانی کا سنگار کرنے والے بھی زندگی کے حقائق سے منہ موڑ کر گذر جانے والوں میں شامل ہیں۔ جن سن رسیدہ لوگوں کو اپنے خاندان اور اپنے مشاغل سے پورا پورا اطمینان نصیب نہیں ہوتا وہ نوجوانوں کی صحبت میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ انھیں اپنے وہ دن یاد آتے ہیں۔ جب وہ بھی کبھی مرکز التفات تھے۔ آج کی یہ کیفیت انھیں پھر اسی پُر لطف دور کی یاد میں محو کر دیتی ہے۔ جوں جوں ڈھلتی جوانی کا احساس بڑھتا ہے، وہ زمانہ یاد آتا ہے جبکہ با ہزاراں اضطراب وصد ہزاراں اشتیاق "پہلے پہل دل لگایا تھا۔ وہ باب زندگی کے اوراق ایک ساتھ الٹ کر ان بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کا مزا لینے لگتے ہیں۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ بڑھاپے کا نخرہ دکھا رہا ہے۔ لیکن ان کی جان پر بنی ہوتی ہے۔ اپنی وضع قطع میں نوجوانی کی علامتیں ظاہر کی جاتی ہیں۔ طرح طرح سے جوانی کی خواہشوں اور عادتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ اس عمر میں ایسا احساس عموماً مزاج میں تلخی پیدا کر دیتا ہے۔ تند خوئی، جلی کٹی سنانا عام رویہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مطمئن طبیعتیں جنھیں ماحول سے مطابقت پیدا ہو جاتی ہے، بڑی شرافت ومتانت کے ساتھ زندگی کے مدارج طے کرتی ہوئی بزرگی کے حدود میں داخل ہوتی ہیں۔

یادِ رفتہ ماضی کی خواب گاہ بھی حال کی تلخی سے نجات دلانے کا ایک ذریعہ ہے۔ گذرے ہوئے دنوں کی یاد ہمیشہ شیریں ہی ہوتی ہے۔ شاعروں نے اس کے گیت گائے ہیں، عاشقوں کا سہارا وہ ہے۔ اس کا جب ذکر آتا ہے تو منہ سے یہی نکلتا ہے کہ "اچھا گزر گیا بہت اچھا گزر گیا۔" لیکن ناکام ونامراد شخص پچھلے کارنامے دہرا کر آج کی ناکامی کا تدارک کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے پچھلی کامرانیوں کا تذکرہ ہی باعث تسکین ہو جاتا ہے۔ اسے ماضی کی چادر تان کر سو جانے سے ہی سکون کی نیند آتی ہے۔ جب چونکتا ہے تو یہی پکارتا ہے کہ "لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو"!

ممکن ہے کہ یہ رویہ ان لوگوں کے لئے مناسب ہو جو ایک کامیاب زندگی گزار چکے ہیں۔ اپنے کارناموں کی یاد سے انھیں تقویت پہنچ سکتی ہے لیکن نوجوانوں کے لئے ایسا تذکرہ نہ صرف تضیع اوقات ہے بلکہ ذہنی پسپائی کی علامت بھی رکھتا ہے۔ ایسی پسپائی جو قطعی مجہول کر سکتی ہے۔ کیونکہ اس افتادِ طبع کی ابتدا عموماً آغازِ شباب کے ساتھ ہوتی ہے، اس لئے استاد کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر ابتدا ہی میں پتہ لگ جائے تو نوجوان ذہن کی اصلاح آسان ہے۔ شروع شروع میں اس روگ کا صاف صاف پتہ بھی نہیں چل پاتا۔ ایک ایک کر کے علامات ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ پہلے کام میں جی نہیں لگتا۔ نوجوان اکھڑا اکھڑا سا نظر آتا ہے۔ پھر ذرا چلت پھرت میں کمی آتی ہے۔ پھر بے زاری اور بے کیفی بڑھتی ہے۔ سبق میں دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ ایسی فضا میں ناکارہ نوجوان پیدا ہوتے ہیں۔ انھیں اپنی زندگی کو مفید بنانے اور زمانہ سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ بہت سے مجرم شکی، مراقی، جھوٹ موٹ کے علاّمہ یا برخود غلط عالم اسی طرح معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے بڑھاپے کے آثار اسی وقت ظاہر ہونے لگتے ہیں جب کسی کو حال اور مستقبل سے زیادہ ماضی دل کش نظر آنے لگتا ہے۔

قدامت پرستی افراد کی زندگی ہو یا اقوام کی، طرزِ کہن پر اڑنے والی بات بڑی خطرناک ہے اچھا خاصا معقول آدمی بھی کبھی کبھی روایت پرستی کے چکر میں پھنس کر دقیانوسی ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ جب زمانے کا ساتھ نہیں دے پاتا تو ماضی کے نشانات پر جم کر بیٹھ جانے میں اپنی عافیت خیال کرتا ہے لیکن اس طرح وقت کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور وہ روز بروز زمانے سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ ماضی کی اقدار کا احترام اور چیز ہے اور عظمت رفتہ کا پجاری یا تہذیب قدیم کا پرستار بن کر رہ جانا دوسری بات۔ ان باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ کا لطف ختم ہو چکا ہے۔ دورِ حاضر کی ہما ہمی اور اس کی برکتیں اس کے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔ اس لئے وہ آئینِ نو کے خلاف ہے۔

یہ مزاجی کیفیت کبھی کبھی کسی قوم پر بھی طاری ہو جاتی ہے۔ بیشتر افراد احساسِ کمتری کا

شکار ہونے کی بنا پر اپنی قوم کے عہد زریں کی داستانیں دہرانے میں مبتلا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ترقی یافتہ ممالک کی طرف نہیں دیکھتے، مہذب اقوام کے محاسن اپنانے کی تدبیریں نہیں کرتے اور اپنی تاریخ کے نہاں خانۂ ماضی میں اپنے آپ کو مقفل کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دوسری قومیں شاہراہ ترقی پر گامزن ہوتی ہیں اور یہ پرانی تہذیب کی علم بردار قوم، قعر مذلت کی طرف ڈھلکتی چلی جاتی ہے۔

محبت کی محرومی، امتحان کی ناکامی، تجارت میں مایوسی، کام کی دشواری، ملازمت سے سبکدوشی، سب ہی آزمائش کا وقت لاتے ہیں۔ ان آزمائشوں کی منزلیں الٹے قدموں سے طے نہیں کی جاسکتیں۔ ایسے وقتوں میں ہر موج کو اک نئے دم خم کے ساتھ سنبھلنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ جنون کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے کردار و گفتار کے اعتبار سے بالکل بچہ بن کر رہ جائے۔ لیکن ایک نگاہ واپسیں محض تفریحاً بھی ڈالی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ستانے کی خاطر بھی تھوڑی دیر کے لئے بچپن کی بے خیالی میں الٹے قدم لوٹ پڑتے ہیں۔

بچوں کے کھیل تماشوں میں شرکت اور بچکانے مشاغل اسی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ انجمن طلبائے قدیم کی کوئی تقریب ہو یا کسی ہمدم دیرینہ سے ملاقات، ماضی کے پُر کیف ہنڈولے میں وقتی طور پر جھولنے لگنا ایک قدرتی فعل ہے جس سے جذبات آسودہ ہوتے ہیں مگر ذہنی طور پر الٹے قدم دھرتے ہوئے زندگی کسی گذری ہوئی منزل میں دوبارہ داخل ہو جانے سے ذہن کی ناپختہ کاری ظاہر ہوتی ہے۔ یہ 'الٹے قدم' فرار کی ایک صورت ہیں۔

تنقید و تبصرہ

تذکرہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت

تبصرہ نگار : جناب قاضی عبدالودود

مؤلفہ : جناب سخاوت مرزا، شائع کردہ : انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ

کلچرل اسٹڈیز۔ حیدرآباد (اے پی) قیمت ۶ روپے ۵۰ نئے پیسے مجلد

"محدثین تو اس کے قائل نہیں کہ حضرت ... نے ۔ کسی پتھر پر قدم رکھا تھا اور اس پر آپ کا نشان پائے مبارک نمودار ہو گیا تھا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ .. شاہ عبدالعزیز دہلوی کی مجلس میں .. شاہ رفیع الدین .. نے بغداد کے ایک عالم شاہ عبداللہ سے دریافت کیا کہ آپ کا قدم شریف کے متعلق کیا خیال ہے، تو فرمایا کہ مجھے بغداد کے خلیفہ سے اس کا حال معلوم ہوا اُس نے ایک کتاب مجھے دکھلائی تھی جس میں لکھا تھا کہ فلاں سنہ میں حضرت مخدوم جہانیاں آثار قدم مبارک ہندوستان لے گئے ۔ شاہ جہاں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے پوچھا کہ قدم شریف کی آپ کے پاس کوئی سند ہے تو فرمایا کہ عاشق را محض نام و نشاں سند باشد، وایں فعل ولی حق تعالیٰ است، اعنی مخدوم .. بے سند نیست "

روایت یہ .. ہے کہ حضرت .. عمر .. دوسرے اور بھی صحابہ کے ساتھ جنگ میں مصروف تھے اور آں حضرت .. بھی شریک تھے .. سردار کفار نے یہ حجت پیش کی کہ اگر پتھر پر قدم مبارک منقش ہو جائے تو ہم اسلام قبول کرتے ہیں ۔ آں حضرت .. نے .. قدم مبارک پتھر پر رکھے تو نشان اتر آیا .. بہت سے کفار مسلمان ہوئے ۔ سیدھے پیر کا نشان تو خلیفہ بغداد نے رکھ لیا اور قدم چپ کا نشان آپ کے حوالے کیا تھا ۔ غرض سلطان فیروز تغلق نے آپ کو قدم مبارک لانے کے لئے ایک کروڑ ۱۳ لاکھ تنکہ نذر کیا تھا، .. اور قدم شریف کے حالات حضرت مخدوم جہانیاں کے ایک مرید اور برنی نے سیدنامہ کے نام سے لکھے ہیں جو سلطان بہلول

دہلی ۱۱۱۸ھ/۱۱۴۴ھ کے زمانے میں.. جہاندار شاہ.. کے ایما سے مرتب کی گئی۔" (ص ۱۱۰ و ص ۱۱۱)

یہ عبارات تذکرہ یعنی تذکرۂ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے لی گئی ہیں اور حوالہ صرف مجموعۂ ملفوظ جلال الدین بخاری الموسوم بہ سیدنامہ مولف احمد برنی (قلمی.. حیدرآباد سنٹرل لائبریری مکتوبہ ۱۲۶۱ھ کا دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ سوالات پیدا ہو سکتے ہیں: (۱) کیا حضرت مخدوم کے زمانے میں خلافت بغداد باقی تھی؟ (۲) حضرت مخدوم کے ایک مرید کی تالیف میں شیخ عبدالحق، شاہ جہاں، شاہ عبدالعزیز اور ان کے نام کس طرح آ گئے؟ (۳) شاہ عبدالعزیز کے ایک معاصر نے خلیفۂ بغداد سے کس طرح گفتگو کی؟ (۴) حدیث متعلق قدم شریف کس طرح مروی ہے؟ مصنف نے، جن کی طرزِ فکر ظاہر ادبی ہے جو شیخ عبدالحق کی عبارات بالا سے معلوم ہوتی ہے، ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش مطلقاً نہیں کی، ان کے ہی زبان حال سے یہ کہنا کافی ہے کہ "عاشق را محض نام ونشان سند باشد"۔ یہ روش اپنی جگہ پر ٹھیک ہے، لیکن مصنف کی عقیدت مندی خالص نہیں، اس میں تشکیک کی آمیزش ہے۔ ان کی کتاب کا اقتباس ذیل جو عبارات بالا سے مقابل ہے، ملاحظہ ہو:

آپ[1] کا سفرنامہ بحیثیت مجموعی کارآمد ہے (۱) علماء وصوفیا (صحیح صوفیہ) پر ایک حد تک روشنی

---

[1] مصنف نے سیدنامہ یا سفرنامۂ مخدوم جہانیاں، کے متعلق لکھا ہے کہ اس نام کے تین رسالے میری نظر سے گزر رہے ہیں: (الف) مرتبۂ احمد برنی مرید مخدوم، ۱۱ صفحات۔ مولف کا بیان ہے کہ ۷۷۲ھ میں واقعات مندرجہ مخدوم سے سن کر اور ان کی اجازت سے قلمبند کیے۔ (ب) مخطوطۂ حیدرآباد ۳۸ صفحات، جملہ ۸ مقامات کے ... پر مبنی ہے، اس میں دیوار قہقہہ کے عجائب کا بیان بھی ہے۔ تمہید اس پر مشعر کہ حالات خود مخدوم سے ... کر کے لکھے گئے تھے۔ اس کا ترجمہ اردو میں کانپور سے ۱۹۳۷ء (ص ۱۰۳ میں ۱۹۴۷ء) میں شائع ہوا۔ ترجمہ اغلاط سے مملو "یہ ایک نہایت غلط نسخے سے ترجمہ ہوا ہے اور واقعات پر بھی کوئی تنقیدی نظر نہیں ڈالی۔" (ص ۱۰۳) ب کی نسبت ایک جگہ 'جدید' لکھا ہے جو شاید اس کی خبر دیتا ہے کہ نسخہ پرانا نہیں (ج) نسخۂ حیدرآباد صفحات ۱۶۵، سرورق پر سید مبارک خاں کی مہر (یہ کون شخص تھے یا ہیں)، (باقی صفحہ ۶۰ پر دیکھیے)

پڑتی ہے۔ مرتب نے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر جگہ بے حد مبالغہ سے کام لیا ہے۔ بیان . . ہے کہ کسی بلند پہاڑ پر موجود تھے، تو وہاں آسمان چہارم پر آفتاب سے ملاقات ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ تجلی جو آفتاب کے مانند ہو آپ پر ظاہر ہوئی ہو۔ یہ سب روحانی کمالات معلوم ہوتے ہیں۔ یوں تو اولیا . . کی پرواز اور رسائی عرش اعظم تک ہے۔ واللہ اعلم"۔

آفتاب سے ملاقات میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ اسرار التوحید (شیخ ابو سعید ابو الخیر سے متعلق کتاب جو ان کے اخلاف میں سے ایک بزرگ نے چھٹی صدی ہجری میں لکھی) میں خود شیخ ابو سعید کی زبانی مرقوم ہے کہ دنیا ان کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی اور شاکی تھی کہ آپ کی سب پر نظر عنایت ہے، لیکن مجھ سے بیزار ہیں، اس سے جان چھڑانے کے لئے انھوں نے اسے اپنے ایک بیٹے کے سپرد کر دیا۔ حضرت دردیا ان کے والد نے سیارۂ زہرہ سے ملاقات کی تھی۔ ستون حنانہ کے رونے کی روایت

(بقیہ ص ۵۹ یہ ہے) اس کے متعلق مصنف نے کچھ نہیں لکھا اور نہ یہ بتایا ہے کہ یہ نسخہ کس سنہ کا مکتوبہ ہے۔ بقول مصنف اس میں اور ب میں بہت فرق ہے (صرف ب ہی کیوں؟ کیا الف میں اور اس میں فرق نہیں؟) اس نسخے کی ابتدا کے بعض عبارات: "ایں رسالہ است متبرک ازاں قطب الاقطاب (مراد از مخدوم) کہ . . بایں عبارت نوشتہ فرمودہ است"۔ یعنی یہ کہ اس کے مولف خود مخدوم ہیں۔ کتاب میں شیخ مطری سے متعلق روایت اسی سے ماخوذ ہے

مصنف کے بیانات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سفرنامے کا کوئی قدیم نسخہ موجود ہے، یا معاصر یا قریب العصر لوگوں میں سے کسی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ رسالے جعلی ہیں یا کسی کو اس کی ضرورت ہی کیا پڑی تھی، ایسے لوگوں کی نسبت ایسا گمان ان بعض الظن اثم کے تحت آجاتا ہے۔ اگر ان میں ناقص اور تضاد بھی نظر آتا ہے تو اسے ہمیں اپنی سمجھ کا قصور سمجھنا چاہیے۔ یہ بات ہمیشہ کے لئے مان لینی چاہیے کہ ہماری محدود عقل واقعات کی صحت کا معیار نہیں ہو سکتی۔

لا البتہ [illegible] بزرگوں کے کمالات لکھنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ مصنف کی عبارت [illegible] آفتاب سے ملک چہارم پہاڑ پر نازل [illegible] حضرت شرف کے مخاطبہ میں موجود ہے۔

مثنوی رومی میں موجود ہے۔ مصنف نے سفرنامے کے مولف (یا مولفوں) کی شان میں بے ادبی ہی پر قناعت نہیں کی، جا بجا یہ کہنے کے باوجود کہ "یہ سب روحانی کمالات معلوم ہوتے ہیں"۔ اور "اولیاء کی پرواز ... عرش ... تک ہے"۔ واقعات کی اس طرح تاویل کی ہے کہ انہیں عرش معلی سے تحت الثریٰ میں گرا دیا ہے۔

"تلخیص سفرنامہ" ... کے تحت جو جواہر پارے ملتے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) آپ نے "مدینہ منورہ کی زیارت فرمائی اور وہاں آپ کے سادات صحیح النسب ہونے کی آزمائش ہوئی جس میں آپ پورے اترے اور روضۂ اقدس کے وعلیکم السلام یا قرۃ العینی کے جواب سے مشرف ہوئے"۔ (ص ۱۰۳ و ۱۰۴)

(۲) مصر میں ... اذان کی آواز میلوں سنائی دیتی تھی۔ کیا تعجب ہے کہ حکمائے مصر نے کوئی .. لاؤڈ اسپیکر ایجاد کیا ہو"۔ (ص ۱۰۵)

(۳) شہر تخسواں میں ایک بزرگ صوفی شیخ محمد زندی (کذا) کی زیارت فرمائی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ .. چار سو برس میں قعود میں یعنی بیٹھے رہے، جو زیادہ[1] تر روایات پر مبنی ہے"۔ "مشہور اصحاب کہف کے قصے سے مشابہت معلوم ہوتی ہے"۔ (ص ۱۰۵)۔

(۴) ملک شام میں ایک سیاہ پتھر دیکھا جو ہوا[2] میں معلق تھا"۔ (ص ۱۰۵)۔

(۵) "کوہ قاف کی سیر کی، دیوار قہقہہ کے عجائبات[3] سے متاثر ہوئے"۔ (ص ۱۰۵)۔

(۶) ایک بزرگ کی دعا سے ایک پہاڑ نوسادر کا ہو گیا تھا، گویا نوسادر[4] نکلا کرتا تھا (ص ۱۰۶)

(۷) شمس تبریزی سے تبریز میں ملے، مگر وہ ۶۴۴ھ میں بہ روایت نفحات[5] الانس شہید ہو گئے

---

[1] زیادہ تر، چہ معنی دارد؟ [2] معلوم نہیں اب بھی یہ پتھر ہے یا نہیں۔
[3] مصنف نے خود تو ان عجائبات سے لطف اٹھایا، لیکن اپنی کتاب کے ناظرین کو اس سے محروم رکھا، یہ بڑی زیادتی ہے۔ [4] کیا مصنف کو اس میں شبہ ہے کہ پہاڑ نوسادر کا ہو گیا تھا؟
[5] حضرت جامی مصنف نفحات الانس حضرت شمس تبریز کے معاصر نہ تھے۔ سنہ وفات کے متعلق ان کا قول دیدہ کیوں مان لیا جائے؟ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی اور شمس تبریز کا ذکر کرتے ہوں اور سفرنامہ میں نام کے کسی اور بزرگ سے بحث ہو۔

تھے بمزار کی زیارت کی ہو گی، مگر مزار کے متعلق بھی اختلاف ہے، قونیہ میں[۵۱] یا تبریز میں یا ملتان میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جامع و مرتب سفر نامہ سے چوک ہو گئی۔ (ص ۱۰۷)۔

(۸) "گاندوں میں ایک عجیب و غریب چراغ تھا جو ۱۴ سال سے ایک ہی بتی اور تیل سے روشن رہتا تھا، ممکن ہے کہ کسی ماہر طبیعات[۵۲] نے ایسا چراغ بنایا ہو" (ص ۱۰۸)۔

(۹) گنجہ میں ایک بزرگ شراب خوار تھے بلکہ شراب سے غسل کرتے تھے، وقت مرگ وصیت کی کہ میری قبر پر شراب چھڑکنے سے شراب کی عادت چھوٹ جائے گی"۔ معلوم ہوتا ہے کہ .. محض شراب خواری[۵۳] کے انسداد کے لئے یہ طرز عمل اختیار کیا ہو"۔ (ص ۱۰۸)۔

(۱۰) شہر رائیکان میں ایک بزرگ کی بلی باتیں کرتی تھی اور مسافروں کے آنے کی اطلاع کر دیتی تھی۔ ممکن ہے کہ بلی کو سدھایا گیا ہو[۵۴]۔ طوطے اور کتنے عجیب عجیب کام کر جاتے ہیں۔ (ص ۱۰۹)۔

سفر نامے کے نسخہ ج کے ذکر میں اس کے حوالے سے یہ روایت درج ہے۔ کہ میں چلہ کشی کر رہے تھے کہ ایک دن جمعہ کی نماز کی امامت کے لئے شیخ مطری موجود نہ تھے، حضرت مخدوم نے امامت کی، شیخ تشریف لائے تو مخدوم نے دریافت کیا کہ کہاں گئے تھے، جواب[۵۵] ملا کہ ملتان گیا تھا، شیخ رکن الدین ابو الفتح کا انتقال ہو گیا، میں نے تجہیز و تکفین میں شرکت کی، آنحضرت بھی مع صحابہ شریک تھے، کسی نے پوچھا کہ مرتبہ قطبیت کسے ملا، شیخ مطری نے مخدوم کی طرف اشارہ کیا۔ (ص ۴۸)۔

---

۵۱ بجز یہ ممکن ہے کہ جسم کے مختلف حصے مختلف مقامات میں دفن ہوں۔

۵۲ عرش معلیٰ سے تحت الثریٰ پرلے آنا اسی کو کہتے ہوں۔

۵۳ جدت پسند بزرگ تھے، ورنہ انسداد کی اور بہت سی صورتیں تھیں۔

۵۴ پھر وہی تحت الثریٰ کی بات! کیا مصنف نے کسی سدھلائے ہوئے جانور کو باتیں کرتے یا مسافروں کے آنے کی اطلاع دیتے ہوئے دیکھا ہے؟

۵۵ تعجب ہے اس جگہ مصنف نے ہوائی جہاز کے ایجاد کا ذکر نہیں کیا۔

ایک روایت عہد عالم گیری کی ایک کتاب ثمرات القدس کے حوالے سے نقل کی ہے۔
مخدوم نے کئی سو شیوخ سے استفادہ کیا تھا۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے بغلگیر ہوئے تو جس قدر نعمت حاصل کی تھی سب شیخ نے سلب کر لی، پھر ان کے بیٹے سے اپنا سینہ مس کیا تو تمام نعمتیں اور فیوض اس سے بھی بہت زائد حاصل ہو گئے۔ (ص ۱۴)۔

ماخوذ از خزانۂ جواہر جلالی مؤلفہ ۱۰۸۱ھ: حضرت مخدوم جعفر نے جنید بغدادی کی نسبت فرماتے تھے کہ اپنے قول کے مطابق وہ "بعض ابدال کے نکاح میں بعض ابدال عورتوں کے ساتھ موجود رہا ہوں، وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا یعنی کوئی مجمع نہ تھا، نوشہ نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور کوئی چیز زمین پر گری تو وہ در و یاقوت وغیرہ معلوم ہوئے، مگر میں نے جب اس کو ہاتھ میں لیا تو زعفران تھی"
حضرت خضر نے حضرت جنید سے کہا کہ اس جماعت کے متعلق ایسا خیال نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ بدبیہ ہے۔ (ص ۹۸)۔

اگلے بزرگ بڑے غیور ہوا کرتے تھے اور اس مطلب کی روایتیں موجود ہیں کہ انھوں نے منکرین اور متشککین کو اپنی رحلت کے بعد بھی سزائیں دی ہیں۔ مصنف چونکہ بنیادی طور پر "ایک عقیدت مند آدمی ہیں" وہ درخور سزا تو نہیں سمجھے گئے۔ لیکن ان کی تنبیہ کے لیے اتنا ضرور کیا گیا کہ وقت تحریر ان پر غفلت طاری ہو گئی اور سہل امور میں ان سے اغلاط فاحشہ کا ارتکاب ہو گیا:

(۱) وہ تذکرۂ صبح گلشن کو صدیق حسن خاں کی تالیف بتاتے ہیں۔ ص ۱۵۹ لیکن، یہ ان کے بیٹے علی حسن خاں کے نام سے چھپی ہے، مگر چونکہ وقت تالیف وہ بہت کم عمر تھے، گمان غالب ہے کہ کتاب کا اصلی مؤلف صدیق حسن خاں کا کوئی ادبی مددگار رہے۔

(۲) شمع انجمن ان کے نزدیک سید نور الحسن ابن صدیق حسن خاں کی تالیف ہے۔ ص ۱۵۹۔
یہ باپ کی کتاب ہے بیٹے کی نہیں اور باپ ہی کے نام سے چھپی ہے۔

(۳) سید نور الحسن نے کئی تذکرے شعرائے فارسی کے لکھوائے ص ۱۵۹۔ انھوں نے نہیں صدیق حسن خاں نے لکھوائے تھے۔

(۴) ان تذکروں کا ماخذ ص ۱۵۹ میں آفتاب عالم مؤلفہ اختر بنگالی بتایا گیا ہے۔ تذکرہ کا نام آفتاب عالمتاب ہے، قاضی محمد صادق خاں اختر باشندۂ ہگلی ضرور تھے، لیکن کوئی انھیں اختر بنگالی نہیں لکھتا۔

(۵) "۵۰۰ سال قبل مسیح دارائے اول اور اسفندیار کے قبضے میں پنجاب کا کچھ علاقہ تھا" ص۲ اسفندیار کا ذکر اوستا میں ہے، لیکن نہ تو اس کا ثبوت موجود ہے کہ وہ دارا کا معاصر تھا اور نہ یہ کہ وہ ہندوستان کے کسی حصے پر قابض تھا۔ دارا ہخامنشی خاندان کا شہزادہ تھا، جو ایک تاریخی خاندان ہے، اسفندیار کیانی تھا جو ایک اساطیری خاندان ہے۔

(۶) سال وفات بہادر شاہ ۱۱۲۲ھ ص ۱۱۱، صحیح ۱۲۲۴ھ ہے۔

(۷) بحر ذخار (زخار چاہیئے) کے مولف کا سال وفات ۱۰۳۱ھ ہے ص۲۹۶۔ مصنف کی نظر سے جو نسخہ گزرا ہے وہ میں نے بھی دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سنہ کے بہت بعد کی باتیں بھی اس کتاب میں ہیں۔ یا تو یہ دوسروں کا اضافہ ہے یا مصنف کا بتایا ہوا سال وفات غلط ہے۔ میرا میلان اسے غلط سمجھنے کی طرف ہے۔

مصنف نے اخلاف مخدوم کا بڑی شرح وبسط کے ساتھ ذکر کیا ہے، لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ان میں اردو کے مشہور شاعر میر سوز کا نام نہیں۔ یہ مخدوم کے بیٹے حضرت قطب عالم کے اخلاف سے تھے۔ صوبۂ بہار کے مشہور مورخ سید حسن عسکری صاحب کا سلسلہ نسب بھی مخدوم تک پہنچتا ہے، ان کا ذکر بھی اس کتاب میں نہیں۔

کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، جن لوگوں کو حضرت مخدوم اور ان کے اخلاف سے دلچسپی ہو، اس کا مطالعہ کریں۔

اینت کے کندھے پر

جناب شیاما رجن

ہندی شاعری میں اظہار کی آزادی بڑھتی جا رہی ہے۔ اردو نظم میں بھی بحر و قافیے سے بالکل آزادی حاصل کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور اظہار کی آزادی تو ہندی کے مقابلے میں کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ پیش کردہ نظم میں اظہار کی آزادی تو کافی ہے لیکن قافیے اور ردیف کا جا بجا سہارا لیا گیا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ ہندی میں نظم ابھی پوری طرح آزاد نہیں ہو سکی ہے بلکہ اس لئے کہ شاید ہندی نظم تجربے کی منزل تک پہنچ کر اپنی ترقی کی راہوں پر نظرثانی سی کرتی معلوم ہوتی ہے۔ پوری طرح آزاد ہندی شاعری کی کامیابی ابھی ثابت نہیں ہوپائی ہے اور پیش کردہ نظم کی طرح کی روائتی اور آزاد شاعری کی بیچ کی چیزیں زیادہ دکھائی دینے لگی ہیں۔ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ ہندی اور اردو دونوں میں آزاد شاعری ایک سی معلوم ہوتی ہے۔ چند الفاظ ہیں جو ہندی اور اردو کا فرق محسوس کراتے ہیں۔ موجودہ نظم میں ہندی کے الفاظ کے معنی صاف ہونے پر نظم کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔"

شیام سروپ شرما۔ (شیاما رجن)

اُونچے چوبارے سے،
بارات دن آتے جاتے
آنگن سے، دوارے سے،
جھاڑوں سے بھرے ہوئے
ٹھونٹھوں سے ہرے ہوئے

ے۔ ۵ ۱ ماضی۔

سب کے لبھائے[1] ہوئے
رُتوں[2] کے رچائے[3] ہوئے
اُونچے سے ٹیلے کو
نت نت[4] پرتی لیکھتا ہوں،
کال[5] کے سجائے ہوئے
سامان دیکھتا ہوں۔

[1] بھلائے ہوئے
[2] موسم [3] رنگے
[4] روزانہ
[5] وقت

ٹیلے کے اُوپر سے
اُبھرا ہوا ٹھونٹھ ایک
ہاتھ کے اشارے سے
مجھ کو بُلاتا ہے،
لیکن اداس ہوکر،
مجھ سے ہتاش[6] ہوکر
انگلی پر بیٹھے ہوئے
گِدھ دھوپ سینکنے کو
جانے کس جتن سے
جُونکا، اُڑاتا ہے،
دِکھلا کر شکتی[7] اپنی
خود کو بُھلاتا ہے

[6] ناامید
[7] طاقت

لگتا ہے ایک دن،
مان[8] پگھل جائے گا،

[8] گھمنڈ

دونوں کے بیچ ٹھوس
انتر[9] گل جائے گا۔
اوندھے اتیت[10] کی
پیٹھ پر کھڑا ہو کر،
دور دور تک کے
بڑوں سے بڑا ہو کر،
دیکھوں گا ایک طرف
کارخانے، ہسپتال،
چلتی ہوئی سڑکیں یا
پھیلے سبھیتا[11] کے جال
دوسری طرف ہوں گی
ہری بھری کیاریاں
بونے سے لگتے ورکش[12]
ندیوں کی دھاریاں۔
دور پرے ابھیاسی[13]
سینکوں[14] کی ٹولیاں،
اٹھتا ہوا دھواں
سنسناتی ہوئی گولیاں۔
توپوں کی گرج جیسے
سب کچھ ہی روند دیگی،
میرے پیروں کے نیچے
بجلی سی کوندے گی۔

۹ فاصلہ
۱۰ ماضی
۱۱ تہذیب
۱۲ درخت
۱۳ مشق کرتے ہوئے
۱۴ فوجیوں

ٹیلے کے چت[15] میں
سب کچھ دِکھ جائے گا۔
محلوں کے ککشوں[16] میں
من ہی لکھ جائے گا۔
ٹیلا نہیں ہے یہ
سمے کا پھیر ہے،
محلوں کی نیووں[17] کے
ارمان ڈھیر ہیں۔
اٹہاس[18] سن پڑیں گے،
مُدھر ہاس[19] سن پڑیں گے،
وِینا، منجیر
آس پاس سن پڑیں گے۔
رِیتیاں[20] دکھائی دیں گی،
نیتیاں[21] دکھائی دیں گی،
پھسپھساتے داسوں کی
بھیتیاں[22] دکھائی دیں گی

لیکن اچانک ابھی،
یہاں تک پہنچ کر میری
انوبھوتی[23] گھبرا گئی،
میری اڑانوں سے
صدیوں کی کہر گھٹی

۱۵ دل
۱۶ کمروں
۱۷ بنیادوں
۱۸ قہقہے
۱۹ میٹھی ہنسی
۲۰ رسم ورواج
۲۱ پالیسی
۲۲ خوف
۲۳ احساس

کیا کچھ چھترا گئی؟
ڈرتا ہوں اپنے سے،
کوئی کہے گا جیسے
آج کی یہ دنیا ارے!
دیکھتے ہی دیکھتے
اتیت[۵۲۳] کے کندھے پر
چڑھ کر اترا گئی۔

۵۲۳ ماضی

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہے)

ابو خاں کی بکری اور چودہ کہانیاں — مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین

صفحات: ۱۳۶، قیمت: ڈھائی روپے

مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵

ابو خاں کی بکری، ذاکر صاحب کی ان کہانیوں کا مجموعہ ہے جو بہت دن ہوئے رقیہ ریحانہ کے نام سے چھپی تھیں۔ بچوں کی کہانیوں کا یہ مجموعہ حسن طباعت کے اعتبار سے بھی امتیازی حیثیت رکھتا ہے، مکتبہ جامعہ نے اسے بڑے اہتمام اور سلیقے سے شائع کیا ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ ۱۹۶۳ تک اردو کی حسین ترین کتاب ہے ملک کے مشہور اور نامور مصور گجرال کی چھ تصویروں نے اس مجموعہ کو نگار خانہ بنا دیا ہے۔

خوش لباسی کے ساتھ ساتھ اس محبوب کی خوبروئی کا بھی یہ عالم ہے کہ "کرشمۂ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست"۔ یہ کہانیاں بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں، انداز بیان سیدھا سادا اور رواں، کہانیاں دل کش اور کردار بڑے بھولے بھالے اور جاندار ہیں لیکن ان کہانیوں میں جس خصوصیت نے رنگینی اور توانائی پیدا کی ہے وہ ذاکر صاحب کی شخصیت کی تابناک IDEALISM یا تصور پرستی ہے۔ اس مجموعے کی سبھی کہانیاں زندگی سے اتھاہ محبت، اس سرزمین سے بے پناہ پیار اور اس حیات دو روزہ کی ہر ہر ادا پر جاں نذر کرنے کے ارمان سے بھرپور ہیں۔ زندگی سے گہرا لگاؤ اور اس کی دل کشی کا عرفان، عظیم ادب کی پہچان ہے اسی لئے یہاں فطرت کے مناظر کا بیان محض لطف داستان کے لئے نہیں ہے بلکہ اس طرح کیا گیا ہے جیسے عاشق والہانہ انداز

میں اپنے محبوب کی ثنا کرتا ہے اور اس کے حسن کو ہر پہلو سے دیکھتا اور ہر زاویے سے اس کی پرستش کرنا چاہتا ہے ایک منظر ملاحظہ ہو :

"گاؤں کے اردگرد دھان کے ایسے لہلہاتے کھیت کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں یوں کہنے کو تو سب کھیت ہرے ہیں پر ہر ایک کا رنگ الگ الگ ہے کوئی ہلکا انگوری۔ کوئی اس سے ذرا تیز مونگیا، کوئی گہرا کاہی کسی میں پیلاہٹ جھلکتی کسی میں نیلاہٹ۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی پہاڑی پری کی شادی ہو اور بڑی برات آنے کو ہو۔ عزیز قریب پریوں کے یہاں سے ہرے قالین منگا کر محفل کے لئے بچھائے گئے ہوں" (ص ۲۲)

اس کے علاوہ دوسری خصوصیت ان کہانیوں کی وہ تصویر پرستی ہے جو "آخری قدم" اور "عقاب" میں نکھر کر سامنے آئی ہے۔ افسانہ نگار نے جگہ جگہ انسان دوستی اور ایثار کی اس قدر کو حاصلِ زیست بتایا ہے جو دنیا کو بہت کچھ دے تو سکتی ہے مگر اس سے آگے کاسۂ گدائی نہیں پھیلاتی بلکہ اپنے احسانات کا حساب تک رکھنا گوارا نہیں کرتی۔ "آخری قدم" میں ایک نیک آدمی جسے سب لوگ برا کہتے ہیں مگر وہ بیواؤں یتیموں کی اور قومی کاموں میں اعانت کرتا تھا اور ایک خوبصورت سی کتاب میں "بے حساب امانت" لکھتا رہتا تھا مرتے وقت اس کتاب کو بھی انگیٹھی میں جھونک دیتا ہے۔

"کتاب کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھانا چاہا۔ کئی مرتبہ کی کوشش میں اسے مشکل سے اٹھا پایا پھر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ عظیم الشان گھڑی اور یہ چھوٹا خیال.... ان کو شرما کر تجھے کیا لے گا۔ تو اپنا کام کر چلا..... اپنے کام سے کام.... منزل آپہنچی.... آخری قدم کیوں ڈگمگائے؟"

یہی خیال اس زخمی عقاب کو تسکین دیتا ہے جو دودھ بالائی اور دہی کی ضیافتوں کو چھوڑ کر زنجیر توڑ شاہانہ انداز سے اڑتا ہوا سب سے اونچی چٹان پر اپنے ویران گھونسلے میں جا کر دم لیتا ہے :

"خدا کا شکر ہے پھر آپہنچا اپنے وطن میں پھر پالیا اپنا دیس۔ تو اکیلا ہی رہنے کو بنا ہے بس اکیلا ہی رہ۔ تیرے ساتھی اگر ہیں تو یہی ستارے اور یہی چٹانیں یہی چاند یہی سورج جو اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور کسی اور کے کام میں دخل نہیں دیتے" (ص ۳۴)

غرض یہ پندرہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں نہ صرف بچوں کے لئے بلکہ ہر عمر کے لوگوں کے لئے آنند

کی نہایت لطیف نمونہ قرار دی جاسکتی ہیں فکر اور جذبے کی رنگین دنیاؤں کے دروازے
والوں کے لئے کھول دیتی ہیں اور جو اس دنیا میں داخل ہوتا ہے وہ زندگی کا زیادہ تابناک
اور بہتر عرفان لیے بغیر نہیں جاتا۔ (محمد حسن)

مخدوم جہانیاں جہاں گشت مولفہ: محمد ایوب قادری

سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم ۳۰۴ صفحات، قیمت مجلد ساٹھ روپے، غیر مجلد چھ روپے۔ سنہ طباعت
ناشر: ادارہ تحقیق و تصنیف، ۱/۱۴۱ وحید آباد۔ کراچی (پاکستان)

حضرت جلال الدین بخاری، جو مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے لقب سے مشہور ہیں، چ
صدی عیسوی کے ایک معروف بزرگ ہیں، جنھوں نے ہندوستان کے اُس دور کی ملی و تمد
پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ افسوس کہ اب تک موصوف پر کوئی جامع اور مستند
نہیں لکھی گئی تھی۔ ۱۹۶۲ء میں حیدر آباد دکن سے اس کمی کو دور کرنے کے لئے ایک کتاب
جس پر مفصل تبصرہ جامعہ کے اسی شمارے میں شائع ہو رہا ہے۔ اس کے بعد پچھلے سال (
کے اواخر میں کراچی سے بھی ایک کتاب شائع ہوئی ہے، جو اس وقت ہمارے پیش نظر
بزرگوں اور صوفیوں کے حالات زندگی لکھتے وقت عام طور پر غلو کی حد تک مبا
سے کام لیا جاتا ہے اور جب تک کشف و کرامات نہ دکھلائے جائیں، ان کی عظمت اور بز
ثابت نہیں ہوتی۔ زیر تبصرہ کتاب کے مؤلف کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے "حضرت مخ
بحیثیت ایک انسان، عالم اور درویش کے پیش کیا ہے اور ان سے متعلق بعض چیز
من وعن قبول نہیں کیا۔" (ص ۱۵) مثال کے طور پر عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ ح
مخدوم فیروز شاہ تغلق کے عہد میں آثار قدم مبارک مکہ معظمہ سے دہلی لائے تھے۔ عید
تذکرہ (مولفہ سخاوت مرزا صاحب) میں بھی اس واقعہ کا ذکر ہے اور جناب قاضی عبدالودود
نے اپنے تبصرہ میں اس روایت پر مختلف پہلوؤں سے اعتراض کیے ہیں۔ قادری صا
اس کتاب میں اس واقعہ کی سختی سے تردید کی ہے۔ لکھتے ہیں "قدم شریف لانے کا ق

بے بنیاد ہے۔ میں نے جون جولائی ۱۹۶۳ء میں دہلی، لاہور، رام پور، آنولہ اور دیو بند میں بچشم خود مختلف قدم شریف دیکھے، اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ سب مجاوروں اور قبر پرستوں کی ایجاد و اختراع ہے" (ص ۱۵)۔

اسی طرح موصوف نے بڑی صفائی کے ساتھ لکھا ہے کہ "حضرت مخدوم کے جو سفر نامے ملتے ہیں وہ قطعاً ناقابل اعتبار ہیں۔ ان میں بے سرو پا واقعات، من گھڑت حکایتیں اور دور از کار قصے درج ہیں" (ص ۱۱۲)۔

غرض مولف نے بڑی حد تک واقعات کی چھان بین کی ہے اور صحیح حالات و تعلیمات تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تحقیق و تلاش سے کام لیا ہے۔ امید ہے موصوف کی یہ محنت اور کوشش مقبول ہوگی۔

دیوان قائم

مرتبہ: ڈاکٹر خورشید الاسلام

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$، حجم ۲۶۷ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ قیمت مجلد سات روپے، سن طباعت: دسمبر ۱۹۶۳ء۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

قائم اردو کے قدیم شعراء میں ایک خاص حیثیت اور انفرادیت کے حامل ہیں۔ افسوس کہ اب تک ان کا کوئی مکمل مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کمی کو دور کرنے کے لئے پیش نظر مجموعہ شائع کیا ہے، جو کتابت و طباعت اور کاغذ کے لحاظ سے بہت اچھا اور خوبصورت ہے۔

فاضل مرتب نے اس دیوان کو جس نسخے کی بنیاد پر مرتب کیا ہے وہ تقریباً ۱۷۷۹ء کا لکھا ہوا ہے اور چونکہ قائم کی تاریخ وفات ۱۷۹۲ء یا ۱۷۹۳ء ہے اس لئے قیاس ہے کہ یہ نسخہ شاعر کی نظر سے گذر چکا ہے۔ موصوف نے بعض دوسرے نسخوں سے بھی ملا لیا ہے اور اختلافات کو کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر درج کر دیئے ہے۔

اس قسم کے مجموعوں کے مرتبین سے عام طور پر توقع کی جاتی ہے کہ وہ مبسوط اور جامع مقدمہ میں

اپنی ریسرچ کی تفصیلات اور متعلقہ موضوع کی خصوصیات وغیرہ پر روشنی ڈالیں گے۔ مگر زیرِ تبصرہ کتاب کے فاضل مرتب اسے ضروری نہیں سمجھتے۔ اس کتاب میں "ضروری باتیں" کے عنوان سے چار صفحے کا ایک پیش لفظ شامل ہے، جس میں شاعر کے حالاتِ زندگی کا کیا ذکر، یہ بھی نہیں کہ اس کا پورا نام کیا تھا۔ اس کے متعلق مرتب کا عذر یہ ہے کہ "اس دیوان کی اشاعت میں یوں سمجھئے کہ میرا نقطۂ نظر محقق یا ناقد کا نہیں، بلکہ ناشر کا ہے اور میں اس منصب پر خوش ہوں"۔ ممکن ہے فاضل مرتب اس حیثیت پر خوش ہوں، مگر اس کتاب کے پڑھنے والے اور تبصرہ نگار ڈاکٹر خورشید الاسلام جیسے ادیب اور نقاد کو اس کے لئے آسانی سے معاف نہیں کر سکتے۔ موصوف نے "ضروری باتیں" میں "املا" کے بجائے "ہجے" کا لفظ لکھا ہے، جس کا استعمال میرے نزدیک محلِ نظر ہے بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موصوف نے "دیوانِ قائم" مرتب اور شائع کر کے اردو کی قابلِ قدر اور مفید خدمت انجام دی ہے اور مزید تحقیق کرنے والوں کے لئے راہ ہموار کر دی ہے۔

قائم چاندپوری (انتخاب) — مرتبہ: ڈاکٹر عابد رضا بیدار

سائز $\frac{20\times30}{16}$، حجم ۵۶ صفحات۔ قیمت: ایک روپیہ۔ تاریخ اشاعت: جون ۱۹۶۳ء۔

ناشر: نیا خواب۔ رام پور (یو پی)

حضرت قائم کے اس مختصر انتخاب کو ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مرتب کیا ہے۔ شروع میں قائم کے حالاتِ زندگی معتبر ترین ذرائع سے اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ سب سے پہلے خود نوشت ہے، اس کے بعد صرف معاصر اور ملاقاتی (۹) تذکرہ نگاروں کے بیانات دے گئے ہیں"۔ (۵۶)، قائم کے نام کے بارے میں جو اختلافات ہیں، اس سلسلے میں فاضل مرتب نے لکھا ہے کہ "میں اس سے بحث نہیں کروں گا کہ قائم کا نام قیام الدین علی تھا، محمد قیام الدین تھا یا محمد قائم تھا، نہ میں اس بات کی کھوج لگاؤں گا کہ قائم سنی تھے یا شیعہ یا دونوں مسلک اختیار کئے تو کتنے کتنے دن کے لئے۔ میری رائے میں ان میں سے کوئی ایک بات بھی ثابت ہو جائے تو نظامِ شمسی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا"۔ بہرحال اس مختصر انتخاب میں حالاتِ زندگی کی موٹی موٹی باتیں اور کلام کے اچھے نمونے آگئے ہیں، جن سے شاعر کی خصوصیات کا بڑی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کوائف جامعہ

جواہر لال نہرو کا سوگ

۲۷ مئی کو دوپہر کے قریب جب اطلاع ملی کہ پنڈت جی کی حالت بہت نازک ہے تو جامعہ برادری میں ہیجانی اور اضطرابی کیفیت پیدا ہو گئی اور جب ۲ بجے انتقال کی اطلاع ملی تو اسی وقت جامعہ کے اساتذہ اور کارکن مرحوم کی کوٹھی کے لئے روانہ ہو گئے! انتقال کی اطلاع ملنے تک جامعہ کے دفاتر بند ہو چکے تھے، دوسرے روز کی تعطیل کا فوراً اعلان کر دیا گیا۔ تیسرے روز جمعہ کی وجہ سے تعطیل تھی، سنیچر کو جامعہ کھلی تو محمد علی ہال میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے فرمائی۔ تلاوت قرآن کے بعد محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ نے فخر روزگار کے عنوان سے پنڈت جی کی شخصیت پر ایک مضمون پڑھا، اس کے بعد ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے تقریر کی جس میں جامعہ سے پنڈت جی کے تعلق پر روشنی ڈالی۔ تقریر کے آخر میں انھوں نے فرمایا کہ پنڈت جی کی علالت کے بعد لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ پنڈت جی کے بعد کیا ہوگا۔ یہ سوال اب جامعہ والوں کے سامنے بھی ہے کہ پنڈت جی جیسے ہمدرد اور بزرگ کے اٹھ جانے کے بعد جامعہ کا کیا بنے گا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ جس سرزمین سے گاندھی جی اور پنڈت نہرو جیسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں، وہاں سے ان جیسی کوئی نہ کوئی شخصیت ضرور پیدا ہوگی، اس لئے نہ تو ملک کا مستقبل تاریک ہے اور نہ جامعہ کا۔

آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے ایک مختصر تقریر کے بعد اعلان کیا کہ پنڈت جی کے نام پر ایک ہزار روپے کا انعام جامعہ کے اس طالب علم کو دیا جائے گا جس میں زیادہ سے زیادہ وہ خصوصیات موجود ہوں جو پنڈت جی کو عزیز تھیں۔ اس کے بعد حسب ذیل ریزولیوشن پڑھ کر سنایا، جسے حاضرین جلسہ نے کھڑے ہو کر منظور کیا:-

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وسیع خاندان کے مردوں عورتوں اور بچوں کا یہ جلسہ اپنے سردار اور سرپرست پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر شدید اور گہرے رنج والم کا اظہار کرتا ہے اور شریمتی اندرا گاندھی اور نہرو خاندان کے سب لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ اہل جامعہ ان کے غم میں دل وجان سے شریک ہیں۔ جواہر لال جی جہاں ہندوستانی قوم اور انسانی برادری کے محبوب رہنما تھے وہاں خاندان جامعہ کے چہیتے اور چاہنے والے

بزرگ خاندان بھی تھے۔ ان کی محبت اور ہمدردی نے ہر نازک موقع پر جامعہ کی دستگیری اور اعانت کی اور ان کی رہنمائی نے ہر مشکل موڑ پر اہل جامعہ کو جرأت وہمت اور عزم واستقلال کی راہ دکھائی۔ اب وہ دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کی عزیز یاد ہمیشہ ہمارے دل کے اندر اور ان کی شاندار مثال ہماری آنکھوں کے سامنے رہے گی اور ہمیں حق خیر اور حسن کی طلب اور ملت، ملک اور عالم انسانیت کی خدمت میں سرگرم رکھے گی۔

جناب شیخ عبداللہ جامعہ میں

جناب شیخ عبداللہ ۲۹ اپریل کو اپنے سیاسی مشن پر دلّی تشریف لائے، تو انھوں نے اہم بزرگوں اور مختلف رہنماؤں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کا پروگرام بھی بنایا۔ ۳۰ اپریل کو امیر جامعہ اور نائب صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں شیخ صاحب رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ وہاں شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کو معلوم ہوا کہ موصوف دوسرے دن صبح سویرے ڈاکٹر مختار احمد انصاری، بریگیڈیر محمد عثمان اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لئے جامعہ نگر تشریف لا رہے ہیں۔ شیخ الجامعہ صاحب نے صبح کے ناشتے کی پیش کش کی، جسے موصوف نے خوشی کے ساتھ منظور فرمایا۔ یکم مئی کو صبح کے ۶ بجے آپ تشریف لائے تو شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب (پرنسپل جامعہ کالج) اور دیگر اساتذہ موصوف کے خیر مقدم کے لئے پہلے سے موجود تھے۔ شیخ صاحب کے ساتھ ان کے مخصوص رفقائے کار مرزا افضل بیگ، مولانا مسعودی، شیخ صاحب کے صاحب زادے ڈاکٹر فاروق اور چند دوسرے حضرات بھی تھے۔ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد شیخ صاحب اور ان کے رفقاء نے شیخ الجامعہ صاحب اور دوسرے اساتذہ کے ساتھ ناشتہ کیا۔ اس مختصر مگر یادگار صحبت میں شیخ صاحب جامعہ کے حالات بڑی دلچسپی کے ساتھ پوچھتے رہے اور جاتے وقت پروفیسر محمد مجیب صاحب اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کو کشمیر آنے کی دعوت دی۔

شیخ صاحب کا یہ پروگرام یکایک بنا تھا، اور کسی کو ان کی آمد کی خبر پہلے سے نہیں تھی، پھر بھی بہت سے اساتذہ اور طلبہ، جن کو عین وقت پر اطلاع ملی تھی، شیخ صاحب

کا نیاز حاصل کرنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔

پروفیسر مجیب صاحب کی دو تقریریں

پروفیسر محمد مجیب صاحب کو دلی اور بیرون دلی کے تعلیمی اور علمی جلسوں کی وقتاً فوقتاً صدارت کرنی پڑتی ہے اور ان کے مباحث میں اکثر شریک ہونا پڑتا ہے۔ یہ تقریریں عام طور پر اتنے اہم قومی اور بین الاقوامی مسائل پر ہوتی ہیں کہ اگر ان کے خلاصے ماہنامہ جامعہ میں شائع کئے جائیں تو قارئین کی دلچسپی اور معلومات کا باعث ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ تقریریں زیادہ تر زبانی ہوتی ہیں اس لئے ان کے خلاصے پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ پچھلے دنوں انھوں نے دو تقریریں ایسی کی تھیں، جن کے خلاصے پہلے سے تیار کر لئے تھے، اس لئے ان کے بعض اہم حصوں کے ترجمے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

پہلی تقریر ۱۲ راپریل کو دلی کے نیشنل ڈیفنس کالج میں کی گئی تھی، جس میں فوج کے اعلیٰ افسروں کو تربیت دی جاتی ہے۔ تقریر کا عنوان تھا "عالمی مسائل میں مغربی ایشیاء کی اہمیت"۔ مجیب صاحب نے تقریر کے بالکل شروع میں فرمایا کہ "میں نہ تو سیاست داں ہوں، نہ حالات حاضرہ کا طالب علم اور نہ ماہر معاشیات، میرا مضمون تاریخ ہے، لیکن مجھے واقعات سے زیادہ واقعات کے معانی اور نتائج سے دلچسپی ہے۔ ایسے معانی اور نتائج سے جن کی مدد سے ہم گذشتہ اور موجودہ تحریکوں، واقعات اور رجحانات کو سمجھ سکیں اور ماضی، حال اور مستقبل کے باہمی منطقی تعلق کو دیکھ سکیں۔

اسلامی ملکوں کے موجودہ حالات اور رجحانات پر گفتگو کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ مغربی ایشیاء ایک لحاظ سے تین قوموں پر مشتمل ہے —— ترک، ایرانی اور عرب، عربی بولنے والی قوموں میں اگر اتحاد کا شعور اور جذبہ زیادہ مضبوط بنیادوں پر ہو تو موجودہ مشکلات کے باوجود وہ اپنی ایک اسٹیٹ قائم کر سکتی ہیں۔

عرب اتحاد کی کوششیں ایک عرصے سے جاری ہیں، عرب لیگ اور متحدہ عرب جمہوریہ کا قیام ان ہی کوششوں کا نتیجہ ہیں، اسرائیل کی مخالفت، مغربی ممالک کی مداخلت ردعمل اور اسلامی اخوت و محبت کی بنا پر اتحاد کے ان رجحانات کو بڑی تقویت پہنچ رہی ہے،

سعودی عرب اور شرق اردن کے شاہی نظام حکومت کی وجہ سے اتحاد کی راہ میں بلاشبہ رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں مگر یہ نظام دن بدن کمزور ہوتا جا رہا ہے، عرب قوموں کی باہمی غلط فہمیاں اور آپس کی رنجشیں بھی رفتہ رفتہ دور ہو رہی ہیں۔ ترکوں اور ایرانیوں نے دوسرے اسلامی ملکوں سے صدہا سال کے پرانے تعلقات کو منقطع کرنے کی کوشش کی تھی، مگر بالآخر انھیں ناکامی ہوئی۔ عربوں میں مغربی تہذیب و تمدن بڑی تیزی کے ساتھ مقبول ہو رہا ہے، جس کی وجہ سے ان کی ظاہری اور باطنی زندگی میں مکمل انقلاب آ رہا ہے۔

سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے فاضل مقرر نے فرمایا کہ ترکی واضح طور پر مغربی ممالک کے ساتھ ہے۔ اس نے ۱۹۵۵ء میں معاہدۂ بغداد کی شکل میں مغربی ملکوں سے اتحاد و اشتراک کی ایک دوسری راہ نکالی، نیٹو کا وہ پہلے ہی سے ممبر تھا، معاہدۂ بغداد میں پہلے ترکی اور عراق شامل تھے، بعد میں برطانیہ، ایران اور پاکستان شامل ہوئے، اس کا مقصد مغربی ایشیا میں سوویٹ یونین کے اثرات کی روک تھام تھی، عرب ملکوں نے معاہدہ بغداد کی شدت کے ساتھ مخالفت کی، سوویٹ یونین بھی اس کا مخالف تھا پھر برطانیہ نے غلطیاں کیں، جس سے روس نے فائدہ اٹھایا، اور عرب ملکوں میں اس کے اثرات بڑھے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ مگر تمام بحری راستوں پر مغربی ممالک کا قبضہ ہے، جس کی وجہ سے مغربی ایشیا کے اقتصادی مفاد کی کنجی ان کے ہاتھ میں ہے۔

تقریر کے اختتام پر موصوف نے فرمایا کہ ہندوستان اور مغربی ایشیا کے باہمی رشتہ کی بنیاد مغربی سامراجیت کی مشترک مخالفت ہے، اسی کے ساتھ روسی سامراجیت کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں میں کوئی اور مشترک مفاد نہیں ہے۔ اس وقت ہندوستان کی اپنی معاشی ترقی کا انحصار بیرونی امداد پر ہے، لیکن جس دن ہندوستان طاقتور اور معاشی اعتبار سے آزاد ہو جائے گا، عربی ملکوں کی نگاہوں میں اس کا وقار بڑھ جائے گا۔ اور ان کا ہندوستان کے لئے دوستی اور خیر سگالی کا جو جذبہ ہے اس کی جگہ احترام کا جذبہ پیدا ہوگا۔

مغربی ایشیا کی سیاست میں عام طور پر مذہب کا کوئی فیصلہ کن رول نہیں ہے، لیکن انڈونیشیا کی مثال ہمارے سامنے ہے اور پاکستان مذہبی جذبات کو اپنے حق میں استعمال کر سکتا ہے! اس چیز کو مثبت اقدام سے روکا جا سکتا ہے، مثلاً ہندوستانی مسلمانوں اور مغربی ایشیا کی قوموں میں روابط پیدا

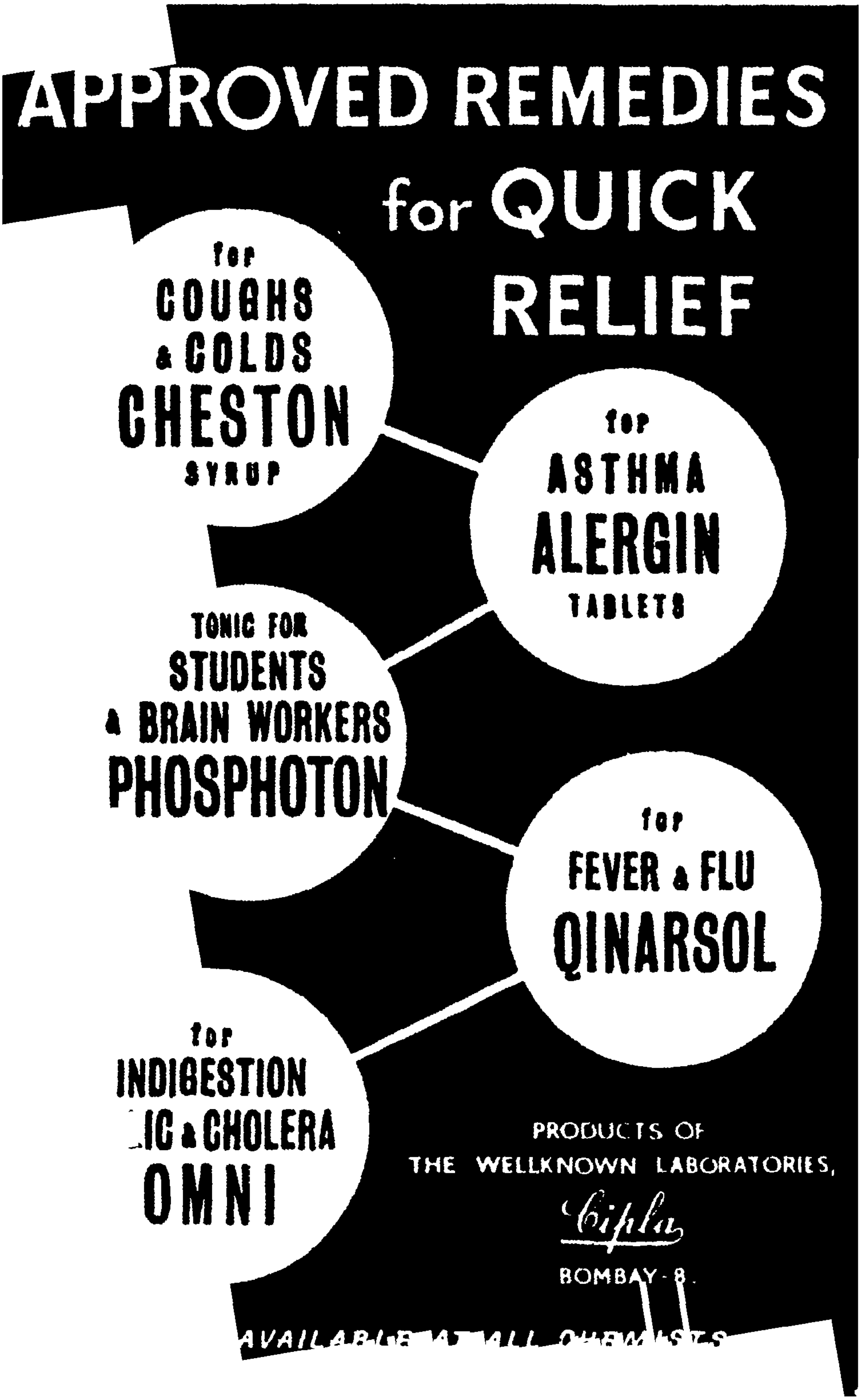
ہموں اور ان کو تقویت دی جائے، تعلیمی اداروں میں ان علوم کے مطالعے کو ترقی دی جائے جن سے اس بات پر روشنی پڑتی ہو کہ ہندوستانی تہذیب میں مغربی ایشیا کی قوموں کا کیا حصہ رہا ہے۔

دوسری تقریر ۱۴ مئی کو مسوری میں تھی۔ علی گڑھ کے ایک کالج نے مسوری میں ہفتہ عشرہ کے لئے ایک کیمپ کیا تھا اور مختلف موضوعات پر مشاہیر اور ماہرین فن کو تقریروں کے لئے دعوت دی تھی۔ اسی سلسلے میں پروفیسر مجیب صاحب سے "ہندوستان میں قومی یکجہتی" پر تقریر کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ ہندوستان میں جب مذہبی تعصب، نسلی امتیاز اور علاقہ جاتی رجحانات حد سے بڑھ گئے اور ہماری تہذیبی خصوصیات، جس کی رنگارنگی پر ہمیشہ فخر کیا جاتا رہا ہے، خطرے میں پڑ گئیں تو جذباتی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ رواداری پر حکومتی سطح پر زور دیا جانے لگا، لیکن جامعہ ملیہ میں شروع ہی سے ان باتوں کی اہمیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور تعلیم و تربیت میں ان کو امتیازی جگہ دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے مجیب صاحب کو قومی یکجہتی پر تقریر کرنے کی دعوت دینا عین مناسب تھا، لیکن مجیب صاحب کی اس موضوع سے دلچسپی اس وقت سے اور بڑھ گئی جب انھوں نے قومی یکجہتی کانفرنس میں، جسے حکومت نے بلایا تھا، شرکت کی اور مرکزی حکومت نے انھیں ایک ایسی کمیٹی کا ممبر مقرر کیا، جس کے ذمے فرقہ واریت کی تعریف کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے سامنے ہندوستان کے سبھی فرقوں اور جماعتوں کے رہنما اور نمایندے پیش ہوئے اور انھوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے فرقہ واریت کی تعریف کی اور قومی یکجہتی پیدا کرنے کے لئے حکومت کو مشورے دئے۔ اس کمیٹی کے سامنے جو بھانت بھانت کے بیانات دئے گئے، جن کی رپورٹ فل اسکیپ کے ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ موضوع اور کام کس قدر اہم اور ضروری ہے۔ مجیب صاحب نے اپنی تقریر میں اسی اہمیت پر زور دیا اور کالج کے طالب علموں اور استادوں کو بتلایا کہ آج کل لوگ اس مسئلے کو قابل ذکر نہیں سمجھتے، ان کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ اب دب گیا ہے اور اس کو اہمیت دینے کے معنی ہیں کہ بلا وجہ ایک نامناسب چیز کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی جائے اور اس کی یاد کو، جسے لوگ بھلائے ہوئے ہیں، ذہنوں میں تازہ کیا جائے۔ لیکن فاضل مقرر نے آگاہ کیا کہ تعصب اور فرقہ واریت کی ان گنت شکلیں ہیں اور وہ کسی وقت کسی شکل میں اس طرح ظاہر ہو سکتی ہے کہ ہماری قومی یکتا کا شیرازہ، جیسا بھی ہے، بکھر جائے اور ملکی وحدت، جس قدر بھی ہے، پارہ پارہ ہو جائے۔



طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائٹل: دیال پریس دہلی

., New Delhi-25



APPROVED REMEDIES
for QUICK
RELIEF
for
COUGHS
& COLDS
CHESTON
SYRUP
for
ASTHMA
ALERGIN
TABLETS
TONIC FOR
STUDENTS
& BRAIN WORKERS
PHOSPHOTON
for
FEVER & FLU
QINARSOL
for
INDIGESTION
IC & CHOLERA
OMNI
PRODUCTS OF
THE WELLKNOWN LABORATORIES,
Cipla
BOMBAY-8.
AVAILABLE AT ALL CHEMISTS

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

| جلد ۵۰ | بابت ماہ جون ۱۹۶۴ء | شمارہ ۶ |

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

ضیاء گوکلپ

ضیاء الحسن فاروقی

باپ کی وصیت

میری عمر تیرہ سال کی تھی، فوجی ہائی اسکول کا میں سب سے زیادہ کاہل اور سُست طالب علم تھا. لیکن ریاضی سے مجھے فطری لگاؤ تھا اور شاعری و ادب کے لئے اپنے اندر ایک پُرجوش میلان پاتا تھا، ریاضی کا نصاب بھی مجھے اپنی کاہلی سے باز نہ رکھ سکا کیونکہ ریاضی کے مسئلے میں بڑی آسانی سے حل کر لیتا تھا، اور چونکہ شاعری اور ادب کی کتابیں میں شوق سے پڑھتا تھا اور ان سے لطف لیتا تھا اس لئے ان سے کبھی تھکتا نہ تھا۔ جہاں تک دوسرے مضامین کا تعلق ہے، مجھے وہ سخت ناپسند تھے، میں اُن سے نفرت کرتا تھا اس لئے کہ اس زمانہ کا طریقۂ تعلیم ناقص تھا اور اس کے مطابق ان مضامین کے لئے نوٹس کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

میرے والد دوسروں سے مختلف تھے، ان کی شخصیت میں تقدس اور آزاد خیالی کا بڑا خوشگوار امتزاج تھا، انھوں نے نئی اور پرانی ہر قسم کی ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا، وہ خود ہی نفسیاتی کیفیات کے مشاہدے اور مطالعے کے عادی ہو چکے تھے اور روحانی معاملات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک بار ان کے ایک دوست نے جنھوں نے یہ سُن رکھا تھا کہ میں شاہ اسمٰعیل اور عاشق غریب جیسی کتابیں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں، انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ مجھے عوامی مسخرے مسطروں کی کتابیں پڑھنے سے روکیں اور ان کے بجائے سنجیدہ موضوعات کی کتابیں پڑھنے کی ترغیب دیں، میرے والد نے جواب دیا "بچے کو وہی

چیزیں پڑھنی چاہئیں جنھیں وہ سمجھتا ہے اور جن سے لطف لیتا ہے، اگر اس سے ایسی کتابیں پڑھوائی جائیں جن سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے نفرت کرنے لگے۔" اور یہ حقیقت ہے کہ چونکہ مجھے ان کتابوں کے پڑھنے کی اجازت تھی جن میں مجھے مزا ملتا تھا، میں نے جلد ہی مسخرے مطربوں کی کتابوں سے گذر کر ڈرامے اور مختصر کہانیوں کے مجموعے پڑھنے شروع کئے اور پھر شاہکار اور عظیم ناولوں کا مطالعہ شروع کر دیا، اور اس کے بعد ترقی کر کے میں نے تاریخ، سائنس اور فلسفے کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔

اگرچہ میرے والد نے ان کتابوں کے پڑھنے کی اجازت دے رکھی تھی جو مجھے پسند تھیں، پھر بھی وہ نفسیاتی اعتبار سے نازک اور اہم لمحات میں اس سے کبھی نہیں چوکتے تھے کہ میرے ذہن کو متاثر کریں اور مجھ میں نیا شوق پیدا کریں۔ ایسی ہی ایک شام تھی، میں اسکول سے واپس ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ وہ بہت اداس ہیں، جیسے ہی ان کی نگاہ مجھ پر پڑی انھوں نے کہا "یہاں آؤ، مجھے ایک المناک خبر تمھیں سنانی ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ خبر سن کر تم رو اٹھو گے، آج کا دن تمھارے اور تمھارے دوستوں کے لئے غم واندوہ کا دن ہے، اس لئے کہ تمھارا سب سے بڑا معلم اور قوم کا سب سے بڑا شخص، نامق کمال[۵]، دنیا سے اُٹھ گیا ہے۔"

میں نامق کمال کی تصنیفات سے متعارف تھا، میں نے یہ بھی سنا تھا کہ ان کی بعض کتابیں غیر قانونی قرار دی گئی ہیں، لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ بڑے معلم اور عظیم شخص تھے، میرے والد نے بڑے غمگین لہجے میں ان کی جدوجہد، ان کے آدرش، ناانصافیاں اور مظالم جو ان کے ساتھ کئے گئے تھے اور ان کا عزم جس نے یہ سب جھیلا تھا ـــــ پوری داستان سنائی اور آخر میں کہا، "اب تم اس شخص کی پیروی کروگے، اس کے خیالات کو اپناؤ گے، تم بھی اسی کی طرح حب الوطنی کے گیت گاؤ گے اور آزادی کا علم بلند کروگے۔"

اس گفتگو کا اثر اس خاص وقت میں جو کچھ ہوا وہ اور کسی وقت نہیں ہو سکتا تھا، میں نے

---

[۵] نامق کمال (۱۸۴۰ء-۱۸۸۸ء)، ترکی کا شاعر اور مفکر جو دستوری حکومت کا حامی تھا اور جس نے ترکی کے تعلیم یافتہ طبقہ میں آزادی، ترقی اور حب الوطنی کے خیالات کی اشاعت کی۔

اپنی روح میں ایک نیا جوش محسوس کیا، ایک آدرش کا تصور میرے ذہن پر چھا گیا، اس وقت سے میں نے مسلسل یہ محسوس کیا ہے کہ میں حریت کا شیدائی ہوں اور ایک ایسا محب وطن جو شعور رکھتا ہو اس بات کا کہ حب الوطنی کا مفہوم اور اس کے تقاضے کیا ہیں، آزادی کسے کہتے ہیں اور اس کے لئے کیا کرنا ہوتا ہے۔

ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنی زندگی کی چودھویں منزل میں قدم رکھا تھا، ایک دن میرے والد اپنے ایک دوست سے گفتگو کر رہے تھے جو میرے تعلیمی شوق سے متعلق انھیں کچھ بتا رہے تھے، انھوں نے کہا کہ اگر اعلیٰ تعلیم کے لئے مجھے یورپ بھیج دیا جائے تو ملک اور قوم کا بہت فائدہ ہوگا۔ میرے والد نے جواب دیا: "وہ نوجوان جو اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ بھیجے جاتے ہیں صرف یورپی علوم ہی سیکھتے ہیں اور اپنے قوم کی علمی میراث سے نابلد اور ناواقف رہتے ہیں، وہ جو "مدرسوں" میں جاتے ہیں، اپنے مذہبی اور قومی علوم سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں بشرطیکہ ان کے اساتذہ اچھے ہوں، لیکن دوسری طرف وہ یورپی علوم سے محروم رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے لئے وہی معلّم اچھے اور مفید ہوں گے جو اُن سچائیوں سے آگاہ ہوں جو ہمارے لئے آج ضروری ہیں۔ یہ سچائیاں نہ تو یورپی علوم کے ذریعہ دریافت کی جا سکتی ہیں اور نہ حقیقی طور پر آج کل ہمارے قومی علوم ہی میں موجود ہیں، ہمارے نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ توجہ کے ساتھ فرانسیسی زبان سیکھیں اور دوسری طرف عربی اور فارسی کا گہرا مطالعہ کریں، ان کی حیثیت ایسی ہونی چاہیئے کہ مغربی اور مشرقی علوم دونوں پر حاوی ہوں اور پھر ان دونوں کے سہارے ان عظیم سچائیوں کا پتہ لگائیں جن کی ہماری قوم کو ضرورت ہے، اسی طریقہ پر میں ضیا کو تعلیم دینا چاہتا ہوں، بشرطیکہ میں ابھی اتنا اور جیوں کہ اس خواہش کو عمل میں لا سکوں۔

افسوس ہے کہ اپنی اس آرزو کے اظہار کے بعد میرے والد ایک سال بھی زندہ نہیں رہے، وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے، لیکن ان کے الفاظ میرے قلب پر نقش ہو گئے اور میں نے انھیں ایک مقدس وصیت کے طور پر محفوظ کر لیا۔

میں نے انھیں فراموش نہیں کیا ہے اور جب تک میں زندہ ہوں کبھی فراموش نہیں کر سکتا،

یہ وہ الفاظ تھے جنھوں نے میری زندگی کا رُخ بدل دیا، اس وقت تک میری تنقیدی صلاحیتیں
ہوئی تھیں، مُصنف پر مجھے اتھاہ اعتماد تھا اور جو کچھ وہ کہتے تھے میں اسے بے چون وچرا
لیتا تھا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ میرے والد کے الفاظ نے مغرب اور مشرق کے کتب خا
کو اس تخت سے اتار پھینکا تھا جس پر وہ براجمان تھے، کتابوں اور مصنفوں کا وہ طلسم جو مجھ
حاوی تھا ٹوٹ چکا تھا، ان الفاظ نے میرے ذہن کو آزاد کر دیا۔ یہ گویا بلاوا تھا، ایک ایسی منز
کی طرف جس کا سفر طویل اور مشکل تھا۔

استاد کی وصیت

کالج میں ہم نے علوم طبیعی اور دینیات کا مطالعہ شروع کیا، یہ دونوں متضاد برقی
جن میں سے ایک اخلاق پر مثبت اثر ڈالتی ہے اور دوسری منفی، جب کسی روحانی خلا
ٹکراتی ہیں تو سچائی کی چنگاریوں کے بجائے تشکک کی شعاعیں نکلتی ہیں، میری روح بھی اس
ہیجان سے نہ بچ سکی، میرا قلب اس بات پر مطمئن نہیں رہ سکتا تھا کہ انسان ـــ نیک سیر
اور اولوالعزم انسان جو میرے انسپریشن کا منبع ہے ـــ مشین بن کر رہ جائے جو ارادہ او
آزادی سے عاری ہو اور جس کی تخلیق صرف لیسنٹ اور بنجر مادے سے ہوئی ہو۔

میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ میں یہ جان سکوں کہ کیا میری قوم جو ہزاروں خطرات
گھری ہوئی ہے اور استبداد کے خواب آور نغموں کی وجہ سے جن کا احساس اسے نہیں ـــ
کسی معجزانہ جدوجہد کے ذریعہ اپنے آپ کو ان خطرات سے بچا سکتی ہے۔ مجھے دراصل ای
فلسفہ اور ایسے فکر کی ضرورت تھی جو امید اور نجات کا مژدہ سنائے۔ اگر آدمی مشین کے
اور کچھ نہیں، اگر اس میں وہ مافوق فطرت صلاحیتیں نہیں ہیں جن کی مدد سے وہ اپنے آپ
نیچر سے بلند و بالا ثابت کر سکے، تو پھر میری قوم زندہ نہیں رہ سکتی اور انسانیت بھی
ویرانے میں بھٹکتی پھرے گی۔

دینیات اور تصوف ـــــ ان میں سے کسی کے پاس امید اور نجات کا فلسفہ نہیں تھا، نئی زندگی کے آیئڈیل کی تہوں تک ان میں سے کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں انسانیت اور انسان کو ایک اعلیٰ وارفع مقام پر اور اپنی قوم اور وطن کو آزاد دیکھنا چاہتا تھا، لیکن مجھ میں ایک ایسی شخصیت بھی تھی جو صرف ریاضی کے بندھے ٹکے اصولوں سے میرے فیصلوں اور خیالات کو جانچتی تھی، منطقی معیاروں پر انھیں پرکھتی تھی اور حقائق اور تجربہ کی کسوٹی پر کسے بغیر کسی فیصلہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی، یہ میری عقل سلیم تھی، یہ باغی تھی، میری امیدوں کو توڑنے اور میرے خوابوں کا گھروندا گرانے میں ہر وقت مصروف عمل۔ اس وقت اگر کوئی سہارا تھا تو وہ "فرار" تھا اور اسی کے سہارے میں قلب و روح کی دنیا میں کسی قدر توازن برقرار رکھ سکتا تھا۔ لیکن ایک دن خود میرے قلم سے نکلے ہوئے چند لفظوں نے مجھ سے یہ سہارا بھی چھین لیا۔ "سچائی سے گریز کرنے سے کیا فائدہ ؟"

انھیں دنوں ہمارے اسکول میں تاریخ طبیعی پڑھانے کے لئے ایک استاد ـــــ ایک فلسفی ـــــ کا تقرر ہوا، فلسفۂ یوروپ اور فرانسیسی ادب کا وہ ایک اچھا عالم تھا، اور اس نے ترکی ادب کے عہدِ جدید کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا، وہ ایک بوڑھا شخص تھا، وہ طبیب بھی تھا جو علم طب پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "علم طب میں کوئی اثباتی سچائی نہیں ہے سوائے Epsom نمک کے۔" وہ یونانی تھا لیکن اس کے باوجود وہ ترکوں کا دوست تھا، یا کم از کم ہم یہی سمجھتے تھے کہ وہ ترکوں کا دوست ہے۔

ترکی کے میڈیکل اسکول سے فارغ ہو کر ڈاکٹر یورگی فوجی ڈاکٹر کی حیثیت سے مشرقی علاقے میں وارد ہوا تھا، اس نے برسوں اس علاقہ کا سفر کیا تھا اور بہت سی جگہیں دیکھی تھیں، وہ گوشہ نشینی کی زندگی پسند کرتا تھا اور تنہا رہتا تھا، وہ اپنے فرصت کے اوقات مطالعہ میں گذارتا تھا، ہوسکتا ہے کہ ایک طویل عرصہ تک مسلسل مطالعہ کی وجہ سے وہ ایک بڑا عالم ایک فلسفی بن گیا۔

اسکول میں ڈاکٹر یورگی ہمارے ان مضامین کو پڑھا کرتا تھا جو ادب کے استاد کے لئے ہم کلاس کے کام کے طور پر لکھا کرتے تھے، یہ زمانہ میرے شدید داخلی بحران کا زمانہ تھا، ہمارے

استاد جن موضوعات پر مضامین لکھاتے تھے ان سے قطع نظر میرے مضامین میں میرے داخلی انتشار و ہیجان کی تلخی شدت کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی تھی، ڈاکٹر یوگی نے یہ محسوس کیا کہ میرے ہیجانی دلائل سے فلسفہ کی بو آتی ہے، جب وہ کلاس میں آتا تو وہ میرے مضامین کا ذکر کرتے میں توجہ سے اس کی باتیں سنتا اس کے ہر لفظ میں میرے لئے ایک نیا افق، ایک نئی دنیا ہو

یہ ضروری نہیں ہے کہ میں اپنے ذہنی ہیجان اور روحانی بحران کا تفصیل سے ذکر کروں اتنا کہنا کافی ہے کہ اس کی وجہ سے میں نے آخر کار خودکشی کی کوشش کی، پھر بے خوابی کا مرض لاحق ہوا جو برسوں چلتا رہا، یہاں تک کہ میں تقریباً ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا، مجھے کوئی جسمانی مرض نہیں تھا اور نہ کسی قسم کی اور تکلیف تھی، میری تکلیف کا سبب میرے خیالات تھے، میں سوچا کرتا تھا کہ اگر میں اس چیز تک پہنچ سکا جسے اس وقت میں "حقیقت کبریٰ" سے تعبیر کرتا تھا تو میرا دکھ درد ختم ہوجائے گا۔ لیکن میں اُسے کہاں پاؤں گا؟ ایک با جب میں ایک انقلابی نظم لکھ رہا تھا، ایک مصرع میرے قلم سے صفحۂ قرطاس پر اترا۔ اس میں اشارہ تھا کہ میں اسے کہاں تلاش کروں :

" آج قوم کا وقار ہمارے ہاتھوں میں ہے "

یعنی "حقیقت کبریٰ" جس کی تلاش تھی زندگی کے آدرش کے سوا اور کچھ نہیں، اور سب سے اونچے آدرش قومیت اور حریت ہیں۔

انھیں آدرشوں کے لئے جدوجہد کرنے میں استنبول آیا، اس وقت وہاں ایک خفیہ جماعت[۱] تھی جسے میڈیکل اسکول کے طلبا نے قائم کیا تھا۔ میں نے طلبا کے ساتھ کام شروع کر دیا کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر یوگی بھی استنبول آئے، ایک دن عبداللہ ہاشم نے جو میرے ہم رہ چکے تھے، ڈاکٹر سے ملاقات کی تجویز رکھی، ہم اس سے ملے، اس نے استنبول کی تحریکوں کا ذکر کیا۔ اس نے کہا " ترکی کے نوجوان سیاسی انقلاب کے خواہاں ہیں۔ وہ دستوری

---

[۱] ایک انقلابی جماعت جسے ۱۸۸۹ء میں عبداللہ جودت۔ اسحٰق سکوتی، ابراہیم تیمو نے قائم کیا تھا اور جو بعد میں اتحاد و ترقی پارٹی کی شکل میں یہ ظاہر ہوئی۔ ضیا گوکلپ ۱۸۹۶ء میں استنبول آیا۔

حکومت کا قیام چاہتے ہیں، یہ تحریک مبارک اور قابل ستائش ہے، لیکن انقلاب نقالی سے نہیں حاصل ہو سکتا، ترکی میں جو انقلاب ہو اسے ترکوں کی سماجی زندگی اور قومی روح سے ہم آہنگ ہونا چاہیے، دستور ایسا ہو جو ترک قوم کی روح کی آواز ہو اور قومی ڈھانچہ سے مطابقت رکھتا ہو، ورنہ انقلاب سے ملک کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچے گا، ایک اچھے اور معقول دستور کی تشکیل کے لئے تم لوگوں کو سب سے پہلے ترک عوام کی نفسیات و عمرانیات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ تم انقلاب پسندوں سے واقف ہو، کیا انھوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے؟ کیا ان کے پروگرام کی اساس اس پر ہے؟ مختصراً یہ کہ کیا وہ اس جنگ کے لئے جسے وہ شروع کر رہے ہیں علمی طور پر مسلح ہیں؟

ہم ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکے، حقیقت یہ ہے کہ یہ سوالات اس لئے نہیں کئے گئے تھے کہ ان کا جواب دیا جائے، بلکہ ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ اس نے اپنے دو سابق طالب علموں کو یہ آخری سبق دیا تھا، یہ اس کی فلسفیانہ وصیت تھی۔

جس طرح میں نے باپ کی وصیت یاد رکھی تھی اسی طرح میں نے استاد کی وصیت کو کبھی نہیں بھلایا، اس دن سے میں نے نفسیات اور عمرانیات کے بنیادی اصولوں کا مطالعہ شروع کر دیا تاکہ میں ترک قوم کو سمجھ سکوں۔

مرشد کی وصیت

۱۹۰۶ء میں میں نے دس مہینے تسکشلا جیل میں گذارے، اس کے بعد میں مہتر خانے لایا گیا اور پھر پولیس جیل میں منتقل ہوا جہاں میری ملاقات نعیم بے نامی ایک انقلابی سے ہوئی، یہ بوڑھا باغی استنبول کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور سیاسی اسباب کی بنا پر قید کر لیا گیا تھا جتنے دنوں میرا قیام وہاں رہا میں اس روشن خیال بوڑھے کی باتیں بڑے غور سے سنتا تھا، یہ شخص کچھ آدرش رکھتا تھا، پُر امید تھا اور دوسروں کو حوصلہ بخش سکتا تھا، جس دن میں رہا ہوا

اور اس سے رخصت ہونے لگا، وہ مجھے ایک گوشہ میں لے گیا اور کہا "جیسا کہ پیٹر اعظم نے اپنی قوم کے لئے وصیت چھوڑی تھی، میں بھی اپنی قوم کے نوجوانوں کے لئے ایک پیغام رکھتا ہوں، اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی میری وصیت پوری کی تو قبر میں میں چین کی نیند سو سکوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن میرا ملک آزاد ہوگا، حالانکہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ یہ آزادی کس طرح حاصل ہوگی، شاید اس وقت جب موجودہ حکمراں نہ ہوگا، اس حکمراں کا جانشین عوام کو خوش کرنے کے لئے دستور کو بحال کرے گا، میں بوڑھا ہوں اور مجھے امید نہیں کہ میں وہ دن دیکھ سکوں گا، لیکن مجھے یقین ہے کہ آزادی کا یہ سورج تمہارے سروں پر ضرور چمکے گا۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ شروع میں جو دستوری حکومت قائم ہوگی، خواہ یہ کسی طرح قائم کی جائے، صحیح معنوں میں دستوری حکومت نہیں ہوگی، دستوری حکومتوں کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ کچھ لوگ اسے چاہیں اور یہ قائم ہوجائے حقیقی دستوری حکومت وہی ہوتی ہے جسے عوام سمجھیں لیکن آج ہمارے عوام گہری نیند سو رہے ہیں۔ کیا ایک ایسی قوم جو خواب غفلت میں پڑی ہو آزادی کی قدر و قیمت سمجھ سکتی ہے؟ اس لئے پہلی دستوری حکومت زیادہ دنوں نہیں قائم رہے گی، ایک بار پھر پارلیمنٹ کے دروازے بند کردئے جائیں گے، اگر ہم ان واقعات کو سامنے رکھیں جو یورپ میں رونما ہوئے ہیں اور اپنے ملک کے حالات کا جائزہ لیں تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں اور کس طرح یہ سب ہوگا

"میرے تصور میں اس کی شکل یوں ابھرتی ہے: چونکہ قوم پر کوئی اخلاقی دباؤ نہیں ہوگا اس لئے پارلیمنٹ کے ممبروں میں "مال غنیمت" کے لئے مقابلہ شروع ہوجائے گا، اخبارات اخفائے کے لئے رشوت لیں گے، انتہاپسند صحت مند روایات کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے، اس صورت حال سے فطری طور پر دستوری حکومت کے حامی آزردہ ہوں گے، دوسری طرف کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو پین اسلامزم کے نام پر تنظیمیں قائم کریں گے اور عالم گیر اسلامی برادری کے تصور کی اشاعت شروع کردیں گے، انگریز اس قسم کی جماعتوں اور ان کے پروپیگنڈے سے خائف ہوکر سلطان پر دباؤ ڈالیں گے کہ پارلیمنٹ ختم کردی جائے، سلطان چونکہ پہلے ہی سے محسوس کررہا ہوگا کہ جمہوری خیالات کی وجہ سے اس کا اثر کم ہو رہا ہے، اس دباؤ کا اثر قبول کرلے گا

اور وہ ایک اخبار والوں کو روپیہ دے کر دستوری حکومت کے خلاف اندھا دھند پروپیگنڈا کرائے گا اور پھر کسی صبح کو ہم مقدس شاہی فرمان دیکھیں گے کہ پارلیمنٹ اس وقت تک کے لئے معطل کردی گئی ہے جب تک کہ حالات سازگار نہ ہو جائیں۔ پہلی دستوری حکومت کا یہی حشر ہوگا، میں یہ سب کچھ اس وقت دیکھ رہا ہوں، اگر تم بھی میرے جیسے تجربات سے گذرے ہوتے تو تم بھی نظر تصور سے یہ دیکھ سکتے تھے۔

"اور اس کے باوجود تمھیں اس صورت حال اور دستوری نظام کے اتنی جلد ختم ہو جانے سے دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے، صحیح معنوں میں یہ دستوری حکومت ہی نہیں تھی۔"

"سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ پریس کی آزادی برقرار رہے۔ اور یہی میری وصیت ہے۔ میں نے کہا کہ قوم گہری نیند سو رہی ہے، عوام اسی وقت بیدار ہوں گے جب انھیں اپنے مقصد اور اپنی منزل کا شعور ہوگا۔ لیکن اگر پریس آزاد نہ ہوگا تو پھر کس طرح ان کے شعور کو بیدار کیا جائے گا؟"

"اس لئے سب سے پہلے ہمارے مفکروں کو ان مقاصد کا علم ہونا چاہیئے آج انھیں اس کا کوئی واضح اور قطعی شعور نہیں ہے۔ وہ خطرہ جس سے میں بہت زیادہ خائف ہوں سوچنے والے دماغوں کا فقدان ہے۔ اگر ملک میں ایسے لوگوں کا وجود نہیں تو پھر آزاد پریس سے کیا فائدہ؟ یہی وہ تشویش اور الجھن ہے جس کی وجہ سے میں نوجوانوں کے لئے ایک پیغام چھوڑنا چاہتا ہوں، ابھی ملک کے آزاد ہونے میں دس سال باقی ہیں، نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ اس عرصہ میں شب و روز مطالعہ کریں، سوچیں اور اس تلاش میں مصروف رہیں کہ قوم کی نجات کہاں اور کس چیز میں ہے، وہ کون سے آدرش اور عقیدے ہیں جو عوام کے دل و دماغ میں اتارنے ہیں؟ کون سے آدرش نیند کے ماتوں کو جگائیں گے، ایک خاص منزل کی طرف لے جائیں گے؟ کون سے اصول ہیں جو انھیں سویلیزیشن کی سطح پر لائیں گے؟ تمھیں ان بنیادی اصولوں کو دریافت کرنا ہے تاکہ تمھارے پاس ایک واضح اسکیم ہو اور تم صحیح خطوط پر قوم کی رہنمائی کر سکو، ورنہ جب آزادی کا سورج طلوع ہوگا

تو تمھاری آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی اور تمھیں راستہ نہیں دکھائی دے گا۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ کیا کہنا ہے، کیا کرنا ہے، اس لئے اپنا راستہ متعین اور ہموار کرنے کے لئے، جیسے ہی پریس کو آزادی نصیب ہو، تمھیں کسی اخبار یا جریدہ کی ادارت سنبھال لینی چاہیئے، تمھیں چاہیئے کہ اپنے اصولوں کی اشاعت کے لیئے ان تھک کوشش کرو تاکہ عوام کے سامنے نئی راہیں کھلیں، نئے افق روشن ہوں اور انھیں اپنی منزل صاف نظر آئے، میں نے یہ جو کہا ہے کہ ان تھک کوشش کرو تو اس وجہ سے کہ شروع میں یہ آزادی زیادہ دنوں تک نہیں قائم رہے گی، اس لئے اس مدت میں تم جتنا لکھ سکتے ہو لکھو، تم ہر ناسور پر عمل جراحی کرو، عوام کی ہر شکایت، ہر تکلیف کے اسباب بیان کرو اور یہ سب مسلسل کرو تاکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو، وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور موقع بار بار نہیں آتا، ایسے وقت میں تمھاری رفتار آہستہ اور محتاط نہیں ہونی چاہیئے، اس لئے کہ جو کچھ تم سوچتے ہو اگر اس کے لکھنے میں تم نے جھجک سے کام لیا تو پھر یہ کبھی نہیں لکھا جائے گا۔

" لیکن تمھیں یہ نہ سوچنا چاہیئے کہ جو کچھ تم لکھو گے وہ پڑھا ہی جائے گا اور اس سے کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور نکلے گا۔ نہیں، بالکل نہیں، جوش، جد وجہد اور تاراج کے اس زمانے میں، ہو سکتا ہے کہ تمھاری تحریریں بالکل نہ پڑھی جائیں، یا اگر پڑھی جائیں تو سمجھی نہ جائیں، بہر حال یہ ضروری نہیں ہے کہ تمھارا پیغام فوراً پڑھا اور سمجھا جائے، جس چیز کی ہمیں اشد ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ وہ خیالات چھپ جائیں جو ہمارے قومی حوصلوں کے آئینہ دار ہوں، وہ خیال جو زیور طبع سے آراستہ ہوتا ہے کبھی ضائع نہیں جاتا، ایک بار یہ چھپ کر پھیل جائے تو پھر تشویش اور تردد کی کوئی بات نہیں، استبداد کا دور لوٹ آئے اور اگر اس کا دل چاہے تو پہلے سے ہزار گنا زیادہ طاقت کے ساتھ آئے، پریس کی پابندیاں پہلے سے زیادہ سخت ہوں، آزادی کے دور کے اخبارات اور جرائد سخت مضر اور ممنوع قرار دے دیئے جائیں، ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں، برخلاف اس کے استبداد کا پنجہ جتنا مضبوط ہوگا، اتنا ہی سخت اس کے خلاف رد عمل ہوگا اور بیداری اتنی ہی تیزی سے پھیلے گی، تحریریں جو ایک بار مضر اور ممنوع

قرار دے دی جاتی ہیں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں، جس طرح آج ہم معتز اور ممنوع تحریروں کو جان پر کھیل کر پڑھتے ہیں، بالکل اسی طرح کل کے استبداد کے دور میں تمہاری تحریریں پڑھی جائیں گی، لوگ اضطراری طور پر انہیں ڈھونڈ نکالیں گے اور پھر ہاتھوں ہاتھ ان کی اشاعت ہوگی، اگر ان تحریروں میں بیان کئے گئے آدرش صحیح اور اصول مفید ہیں تو پھر یہ تحریریں یقیناً عوام کے شعور کو بیدار اور ان کی اس بات پر آمادہ کریں گی کہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کریں، جب عوام بیدار ہوتے ہیں تبھی وہ اپنی جد وجہد کے ذریعہ آزادی حاصل کرتے ہیں اور یہ آزادی ایسی ہوتی ہے جسے وہ اپنے وجود کے لئے ناگزیر تصور کرتے ہیں۔

"اس طرح جو دستوری حکومت قائم ہوگی وہ کھری اور اصلی ہوگی اور اس کے ذریعہ عوام اور پریس کو حقیقی اور پائدار آزادی نصیب ہوگی۔ یہی وہ خیالات ہیں جنھیں میں آخری خواہش کے طور پر اپنی قوم تک پہنچانا چاہتا ہوں"۔

وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کی باتیں کتنی صحیح تھیں! عارضی صلح[1] کے بعد استبداد کا دور ایک بار پھر شروع ہوا اور پارلیمنٹ ختم کر دی گئی، بہت سے مصنف، صحافی اور مفکر جلاوطن کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے اور پریس کا گلا گھونٹ دیا گیا مگر یہ عظیم خیالات کے مقابلہ میں عوام کے لئے زیادہ محرک ہوتی ہیں، ترکی کے عوام اس صورت حال سے چین لینے اور اپنی آبرو اور آزادی کی حفاظت کے لئے تیار ہو گئے۔ ایک ہیرو[2]، ایک جی نی اس (Genius) پیدا ہوا جس نے قومی فتوحات کا دروازہ کھول دیا۔ اگر یہ غیر معمولی واقعات ظہور پذیر نہ ہوتے تو اس بوڑھے انقلابی کی پیش گوئیاں پوری نہ ہوتیں۔

جب اس نے اپنی تقریر ختم کی تو اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اس کی دکھائی ہوئی راہ پر چلتا رہوں گا۔ میں نے اسے اپنا مرشد بنا لیا کہ وہ ایسی راہ کا سالک تھا جو راستی کی راہ تھی اور ایسی منزل کی طرف جاتی تھی جس کی راہ و رسم سے وہ خود واقف تھا

---

[1] پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے فوراً بعد اتحادیوں نے ترکی سے عارضی صلح کی تھی۔

[2] ہیرو سے مراد مصطفےٰ کمال ہیں جن کی تحریک میں ضیا مالٹا سے واپس ہونے پر شریک ہوئے، مالٹا میں وہ انگریزوں کے سیاسی قیدی تھے۔

اور جس کی ایک جھلک اس نے مجھے دکھائی تھی۔

یہ وصیتیں جدید ترکی کے اُس مفکر کی داستانِ زندگی کا ایک باب ہے جسے دنیا ضیاء گوکلپ کے نام سے جانتی ہے لیکن جس کا اصلی نام محمد ضیاء تھا اور جو اناطولیہ کے مشرقی حصہ کے ایک مشہور قصبہ دیار بکر میں ۱۸۷۵ یا ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ آج کی صحبت میں مختصر طور پر اس کی سوانح حیات تبائی جائے گی، آئندہ کسی اشاعت میں اس کے افکار پر روشنی ڈالی جائے گی۔

ضیاء گوکلپ ترک تھا یا کرد، یہ ایک نزاعی مسئلہ رہا ہے، خود اس نے کبھی اس کی وضاحت نہیں کی اس کا خیال تھا کہ تعلیم اور شعور و احساس سے نہ کہ نسلی خصوصیات سے قومیت کا تعین ہوتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ جب وہ پہلے پہل استنبول آیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ ترک ہے، بہرحال حقیقت حال کچھ بھی ہو اس کی پرورش ترک ماحول میں ہوئی، اس کے والد توفیق آفندی عثمانی حکومت کے ایک ذمہ دار افسر تھے، توفیق آفندی کا انتقال ہوا تو وہ ثانوی اسکول کا طالب علم تھا لیکن اس کے چچا حبیب آفندی نے جو علوم شرقیہ پر اچھی نظر رکھتے تھے اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ حبیب نے ضیاء کو فارسی اور عربی پڑھائی اور مسلم فلاسفہ مثلاً غزالی، ابن سینا، فارابی، ابن رشد اور مشہور صوفی عالم ابن عربی، جلال الدین رومی وغیرہ کی تصنیفوں سے روشناس کرایا۔ ضیاء نے اپنی طبیعت کی افتاد کی وجہ سے غزالی کی خود نوشت سوانح المنقذ من الضلال سے بہت اثر لیا، اس میں غزالی نے اپنی روحانی بے چینی اور اس داخلی انتشار کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ تلاش حق تھی، دوسری طرف ترکی کی تاریخ کا یہ دور مشرق اور مغرب کی کش مکش کا دور تھا، سلطان عبدالحمید کا استبداد اگرچہ اپنے عروج پر تھا اور مذہب کے نام پر تجدید و اصلاح کی ہر آواز

دبا دی جاتی تھی، پھر بھی ترک نوجوان مغربی ادبیات اور سیاسی افکار سے انسپریشن لیتے تھے، اس وقت دیار بکر میں کئی ذہنی رہنما جمع ہو گئے تھے، یہ وہ لوگ تھے جنھیں سلطان نے ان کے سیاسی خیالات کی وجہ سے قسطنطنیہ سے جلاوطن کر کے اناطولیہ کے اس اکھڑ علاقے میں نظر بند کر دیا تھا، ضیا نے اس حلقہ سے اپنا تعلق قائم کیا اور اصلاح و تجدید کے حامی مفکرین کی تحریروں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ۱۸۹۰ء کے بعد دیار بکر میں عبداللہ جودت نامی ایک شخص آیا جو خدا کے وجود کا قائل نہیں تھا اور اس کا الحاد کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں تھی، وہ انقلاب کا شیدائی تھا، ہے کل، بخنر، اسپنسر اور ربیاں کے خیالات کا اس پر بہت اثر تھا، جس زمانہ میں وہ قسطنطنیہ میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا، اس نے اس خفیہ انقلابی جماعت کے قیام میں نمایاں حصہ لیا تھا جو بعد میں جماعت اتحاد و ترقی کے نام سے مشہور ہوئی اور جس کی رہنمائی میں ۰۹-۱۹۰۸ء کا انقلاب برپا ہوا۔ ضیا نے باوجود اپنے چچا کے منع کرنے کے کہ اس خطرناک اور آزاد خیال شخص سے وہ بالکل نہ ملے، جودت سے تعلقات بڑھائے جس نے اسے سیاسی و سماجی مسائل سے دلچسپی لینے کے لئے اکسایا اور اس خفیہ جماعت سے بھی روشناس کرایا جو قسطنطنیہ میں قائم ہوئی تھی۔ غالباً اسی ڈاکٹر نے اس کی توجہ فرانسیسی عمرانیات کی طرف بھی منعطف کی۔

اس زمانہ میں اس نے کئی انقلابی نظمیں لکھیں جس میں حب الوطنی کا وفور اور آزادی کا جوش ہے، یہ نظمیں روایتی بحروں میں لکھی گئی ہیں اور ان میں عربی اور فارسی الفاظ و تراکیب کی بھرمار ہے، ان میں عوام کو انقلاب اور بغاوت کی دعوت دی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان میں جوانی کا جوش اور جودت جیسے انقلابیوں کا اثر صاف نمایاں ہے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب وہ اپنے روحانی کرب میں مبتلا تھا، اس کا خیال تھا کہ وہ اسکول کی تعلیم ختم کر کے اعلیٰ تعلیم کے لئے قسطنطنیہ جائے گا جو سیاسی اور تہذیبی سرگرمیوں کا

مرگئے ہے، لیکن اس کے چچا نے اس کی مخالفت کی، وہ چاہتے تھے کہ اپنی لڑکی سے اس کی شادی کردیں اور وہ اپنے آبائی وطن میں رہ کر خانگی زندگی گذارے۔ ایک طرف اس کا روحانی و ذہنی بحران اور دوسری طرف چچا کے خیالات اور منصوبے، ان چیزوں نے اسے زندگی سے بیزار کردیا اور اس نے تلخ مایوسیوں کے عالم میں ایک دن خودکشی کی کوشش کی۔ اس نے اپنے سر پر گولی چلائی لیکن وہ مرا نہیں، عبداللہ جودت اور ایک روسی ڈاکٹر نے آپریشن کیا، زخم تو اچھا ہوگیا لیکن گولی اس کی کھوپڑی سے نہیں نکل سکی اور اس کے سر کا ایک حصہ بن کر رہ گئی۔ یہ واقعہ اس کی ایک نظم کا موضوع بن گیا جس میں اس نے بیان کیا ہے کہ کس طرح ہیرو خودکشی کرتا ہے لیکن اس کی محبوبہ اس کو اس سے باز رکھتی ہے اور اونچے آدرشوں کی جھلک دکھا کر اس میں زندہ رہنے کی آرزو پیدا کرتی ہے۔

ضیا، کے بھائی نے اس نازک موڑ پر اس کی مدد کی، وہ ارزنجان کے فوجی کالج کا طالب علم تھا اور چھٹیاں گذارنے گھر آیا ہوا تھا، اس نے دیکھا کہ ضیا، کے دل میں قسطنطنیہ پہنچنے کی شدید خواہش ہے لیکن حالات نے اسے بے بس کر رکھا ہے، چنانچہ جب وہ واپس ہونے لگا تو خاندان کے کسی فرد کو بتلائے بغیر ضیا، کو اپنے ساتھ لیا اور چپکے سے گھر سے دونوں نکل گئے۔

ضیا، ۱۸۹۶ء میں قسطنطنیہ آیا! اس وقت وہ پیسے پیسے کا محتاج تھا، اب اس کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ وہ اپنے اعلیٰ تعلیم کے شوق کو کس طرح پورا کرے، لیکن اسے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا، اس لئے مجبور ہو کر اس نے جانوروں کے علاج کے کالج میں داخلہ لے لیا کہ یہی ایسا ادارہ تھا جہاں اس کی مفت تعلیم اور قیام وطعام کا انتظام ہوسکتا تھا، اس کالج میں اس نے نیچرل سائنس اور اناٹومی کے لکچرز میں دلچسپی سے حصہ لیا، لیکن وہ مطالعہ سے زیادہ سیاسی کاموں میں منہمک رہتا تھا، وہ اُس خفیہ جماعت کا ممبر ہوگیا جس کا ذکر اس نے اپنے دوست عبداللہ جودت سے سنا تھا۔

قسطنطنیہ میں ضیا، اپنے یونانی استاد سے ملا اور جیل میں اس شخص سے ملاقات

ہوئی جسے اس نے مرشد اور حبس کے پیغام کو مرشد کی وصیت سے تعبیر کیا ہے۔ وہ جب جیل سے رہا ہوا تو جلد ہی اُسے قسطنطنیہ چھوڑ دینے اور دیار بکر میں نظر بندی کی زندگی گذارنے کا حکم ہوا، اس طرح اس کا اعلیٰ تعلیم کا منصوبہ پورا نہیں ہوا، اس کے بعد پھر وہ کبھی یونیورسٹی ڈگری نہ لے سکا۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی لیاقت کے سبب وہ بعد میں قسطنطنیہ کی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا۔ دیار بکر میں جب وہ نظر بند ہو کر وارد ہوا تو اس کے چچا کا انتقال ہو چکا تھا، اس نے اپنے چچا کی چھوڑی ہوئی وصیت کے مطابق ان کی لڑکی جوریہ سے شادی کرلی، جوریہ سے اس کے چار بچے ہوئے، اس کی ایک لڑکی کے شوہر علی نزہت نے بعد میں اس کی بیوگرافی لکھی جو ہر لحاظ سے مستند سمجھی جاتی ہے۔

دیار بکر میں اس نے ۹ برس سکون اور خاموشی سے گزارے۔ اس کی بیوی کو باپ کی جائداد کا جو حصہ ملا تھا اس سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ آرام سے گذر بسر ہو سکے اور وہ اپنا سارا وقت مطالعہ میں صرف کر سکے، اسی زمانے میں اس نے فرانسیسی فلسفہ، نفسیات اور عمرانیات کا گہرا مطالعہ کیا لیکن اس عرصہ میں اس کی کوئی تحریر نہیں چھپی اس لئے کہ سلطان عبد الحمید نے سنسر کا جو نظام قائم کیا تھا وہ ترقی پسند خیالات کی اشاعت کی کسی قیمت پر اجازت نہیں دیتا تھا۔ لیکن اس نظام کے دن اب پورے ہو چکے تھے، چنانچہ ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں نے سلطان کو مجبور کیا کہ وہ دستور کا احیا کرے اور پارلیمنٹ جو معطل پڑی ہوئی تھی اپنا کام شروع کرے، ضیا نے اس انقلاب کا جوش اور امید کے ساتھ استقبال اور پبلک جلسوں میں نئے نظام سے اپنی ہمدردی اور حمایت کا اعلان کیا۔ دیار بکر میں اتحاد و ترقی کی جو شاخ تھی اس کا وہ روح رواں بن گیا اور اپنی تقریروں کی وجہ سے دیار بکر میں ایک ممتاز شخص سمجھا جانے لگا۔ وہ دیار بکر کے اخباروں پیام اور دجلہ کی ادارت میں شامل ہو گیا، اور ان میں اُس کے مضامین اور نظمیں شائع ہونے لگیں۔ ۱۹۰۹ء میں وہ چند دنوں کے لئے قسطنطنیہ گیا اور جب واپس ہوا تو اس کے ہاتھ میں دیار بکر کے ابتدائی اسکولوں کی انسپکٹری کے عہدہ کا پروانہ تقرر تھا۔ اسی سال موسم خزاں میں تحریک اتحاد و ترقی کا ایک قومی اجتماع سالونیکا میں ہوا، اس

اجتماع میں وہ دیار بکر کے نمائندے کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔ پھر وہ اپنی دانشمندی اور قابلیت کی وجہ سے اتحاد و ترقی کی سنٹرل کونسل (مرکز عمومی) کا رکن منتخب ہوا اور جب تک یہ جماعت زندہ رہی[1] اسی حیثیت سے وہ اس کے مقاصد کی خدمت کرتا رہا۔ ترکی میں جب تک ینگ ترکوں کی حکومت رہی مرکز عمومی ہی سب سے بڑی سیاسی طاقت تھی، اور حکومت کی پالیسی اسی کے مشورہ سے طے ہوتی تھی، یہاں تک کہ اس کے بعض رکن وزیروں سے زیادہ با اثر اور صاحب اختیار تھے۔

سالونیکا میں ضیاء کو ایک وسیع ماحول ملا، وہاں کے تہذیبی اور سیاسی حلقے اور ادارے مغربی تہذیب اور خیالات کے گہوارے تھے، دیار بکر کی قصباتی گھٹی گھٹی فضا کے مقابلہ میں یہاں رواداری، وسیع الخیالی اور بے تعصبی کا چرچا تھا، اپنے ذہنی سفر کی اس منزل میں وہ عثمانی قومیت (ottomanism) کے تصور کا حامی تھا۔ عثمانی قومیت کا زور اسلام پر اتنا نہیں تھا جتنا اس تصور پر کہ عثمانی سلطنت کے تمام شہری بلا امتیاز نسل و مذہب مساوی حیثیت رکھتے ہیں اور کوئی مذہبی طبقہ یا نسلی گروہ دوسرے سے کسی صورت میں فوقیت نہیں رکھتا۔ اس وقت کے اکثر دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں کا یہی خیال تھا اور وہ اسی میں سلطنت عثمانیہ کی بقا سمجھتے تھے، لیکن قومی رجحانات اور تنگ نظر نیشنلزم سے پیدا ہونے والے اختلافات بھی موجود تھے، سالونیکا کی سیاسی زندگی میں یہ رجحانات پوری قوت سے ظاہر ہوتے رہتے تھے اور جنگ بلقان سے کچھ پہلے تو اتنے قوی ہو گئے تھے کہ یہ شہر دنیا کا بہت خطرناک مقام بن گیا تھا، اس صورت حال نے ضیاء کے دل و دماغ کو بہت متاثر کیا، اس دور میں اس نے جو کچھ لکھا اس میں ترک قومیت کے پہلے آثار صاف دکھائی دیتے ہیں۔

سالونیکا کے مغربی ماحول میں ضیاء کی دلچسپی یوروپ کے فلسفے اور عمرانی نظریات سے روز بروز بڑھتی گئی، اور ایک مخصوص حلقہ میں اس نے جدید فرانسیسی مفکروں مثلاً فوئلے،

---

[1] ۱۹۱۸ء کی عارضی صلح کے بعد انجمن اتحاد و ترقی ختم کر دی گئی۔

ادرنے اور لیبان پر لکچر دینا شروع کیا، اس کے ایک دوست علی حیدر نے لکھا ہے کہ ابھی وہ فرانسیسی ماہر عمرانیات ایمل درخائیم (۱۹۱۷-۱۸۵۸ء) کی تصنیفات کے مطالعہ سے فارغ نہیں ہوا تھا۔ یہی وہ مصنف ہے جو بعد میں عمرانیات کے میدان میں اس کا رہبر اور معلم بنا۔

اسی شہر میں وہ پہلے پہل ایک اسکول میں فلسفہ اور عمرانیات کا استاد مقرر ہوا۔ یہ انجمن اتحاد و ترقی کا قائم کیا ہوا ثانوی اسکول تھا۔ ترکی کے کسی اسکول میں فلسفہ اور عمرانیات کا درس ایک نئی بات تھی، اسکول کے نصاب میں فلسفہ اور عمرانیات کی شمولیت شاید ضیا ہی کی وجہ سے کی گئی تھی، اتحاد و ترقی کے صدر دفتر میں جس شعبہ کا تعلق نوجوانوں کی تعلیم و تربیت سے تھا اس کا نگراں بھی اسے مقرر کیا گیا، اس کے لکچروں میں سامعین کی تعداد کافی ہوتی تھی، دھیرے دھیرے نئی نسل کے ترکوں پر اس کا اثر بہت بڑھ گیا اور پارٹی کے سربراہوں نے اسے تحریک کا ایک اہم ذہنی رہنما قرار دیا۔ سالونیکا میں اس کی تحقیقات مضامین کی صورت میں شائع ہوئیں، اور اس کی نظمیں زندگی اور ترقی کے ولولوں کے ساتھ گائی اور پڑھی جانے لگیں، اب وہ ترکی کا قومی اور نامور مصنف تھا، اسی زمانہ میں وہ محمد ضیا کے بجائے ضیا گوکلپ کے نام سے علمی و ادبی حلقوں میں متعارف ہوا۔ گوک (gok) کے معنی ہیں آسمان اور الپ (alp) کے معنی ہیں ہیرو، گوکلپ عثمانی سلاطین کے شجرۂ نسب میں ایک قدیم نام کے طور پر ملتا ہے اس نے اپنا قلمی نام اسی کو تجویز کیا۔

اس وقت سالونیکا سے جو اچھے ادبی رسالے شائع ہوتے تھے ان میں "گنج قلملر" (نئے قلم) بھی تھا، اس کا ایڈیٹر علی جانب تھا اور عمر سیف الدین کی مدد سے اسے پابندی کے ساتھ نکالتا تھا، یہ رسالہ اس نظریے کا مؤید اور حامی تھا کہ عثمانی زبان سے وہ اجنبی عناصر نکال دیئے جائیں جنھیں ترک عوام نہیں سمجھتے۔ خیال تھا کہ تہذیبی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ترکوں کی اپنی قومی زبان ہو۔ گوکلپ بھی جس نے آسان ترکی میں کئی نظمیں

لکھی تھیں اس نقطۂ نظر کا حامی تھا، لیکن وہ صرف اس لسانی اصلاح ہی کا قائل نہیں تھا بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں قومی احیا رچاہتا تھا، رفتہ رفتہ اس نے عثمانی قومیت کو خیرباد کہا اور اس کے بجائے ترک قومیت کے گیت گانے لگا۔

اس کا ایک مضمون ہے "ینی حیات وینی قیمتلر" (نئی زندگی اور نئی قدریں) یہ مضمون شاید ۱۹۱۰ء کا ہے۔ اس میں عثمانی قومیت اور ترک قومیت دونوں آدرش ملتے ہیں، لیکن ۱۹۱۱ء میں اس نے جو نظم توران کے عنوان سے لکھی اور جس کے متعلق اس کا خیال ہے کہ اس میں اس کی ساری تعلیمات کا نچوڑ ہے، اس میں ترک قومیت کا پرجوش اظہار ملتا ہے۔

۱۹۱۲ء میں جب بلقان کی جنگ شروع ہوئی تو اتحاد و ترقی کا صدر دفتر قسطنطنیہ منتقل ہو گیا۔ اس کے ساتھ گوکلپ بھی قسطنطنیہ چلا آیا۔ اس کی زندگی کا یہ دور معلم اور مصنف کی حیثیت سے بڑا تخلیقی دور تھا، اب وہ درخائیم کے اثر میں پورے طور پر آچکا تھا اور سماجی اور تہذیبی مسائل سے متعلق ایک نظم کے ساتھ اپنی تحقیقات کا آغاز کر چکا تھا۔ دوسری طرف سلطنت عثمانیہ کا ستارہ گردش میں آچکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ عثمانی قومیت کا نعرہ بہت کمزور ہو چلا تھا۔ مسلمانوں کا آرتھوڈوکس طبقہ اب بھی یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ جنگ بلقان کے نتیجہ کے طور پر یوروپی مقبوضات کے نکل جانے کے بعد شاید کسی نہ کسی شکل میں عثمانی سلطنت باقی رہے لیکن ۱۹۱۲ء میں البانیہ اور ۱۹۱۶ء میں حجاز کی بغاوت نے اس امید پر بھی پانی پھیر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ عثمانی قومیت داستان پارینہ بن گئی اور قومی اور دینی تورانی تصورات میں ترکوں کے پڑھے لکھے طبقہ کی دلچسپی بہت بڑھ گئی، ان تصورات کو پھیلانے اور مقبول بنانے والوں میں ضیا بھی تھا۔

قسطنطنیہ میں وہ ہر قسم کے ادبی اور علمی حلقہ کا روح رواں رہا۔ یہاں وہ یونیورسٹی میں درس بھی دیتا تھا اور اس حیثیت سے اس نے طلبا اور اپنے جونیر ساتھیوں کی

ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا، ان میں سے بہت سوں نے بعد میں ترکی کی علمی ادبی اور قومی زندگی میں نمایاں حصہ لیا اور ترک قوم کی آبرو بن گئے۔

پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست ہوئی، اور یاس و محرومی کی ہمت شکن فضا پیدا ہوگئی، ضیا نے اب تک جو کچھ کیا تھا، سب بیکار ثابت ہوتا ہوا معلوم ہوا، بہت سے رہنما ملک چھوڑ کر بھاگ گئے، لیکن باوجود عزیزوں اور دوستوں کے کہنے اور لکھنے کے وہ قسطنطنیہ ہی میں جما رہا، یہاں تک کہ ۱۹۱۹ء کے شروع میں انگریزوں کے اشارے پر ترکی کی نئی حکومت نے اسے گرفتار کر لیا اور وہ مالٹا بھیجد یا گیا جو اس وقت بین الاقوامی قید خانہ بن گیا تھا۔ ادھر تھوڑے ہی دنوں میں مصطفےٰ کمال نے کایا پلٹ دی اور جب اناطولیہ سے کمال نے یونانیوں کو نکال دیا اور انگورہ کی حکومت مستحکم ہوگئی تو گوکلپ اور دوسرے ترک قیدی رہا کر دیے گئے۔ شروع میں کمال نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی اس لئے کہ اتحاد و ترقی کے رہنماؤں سے وہ بہت ناراض تھے، ان کا خیال تھا اور بڑی حد تک صحیح خیال تھا کہ یہی رہنما ترکی کی ذلت اور ہزیمت کے ذمہ دار ہیں، لیکن جلد ہی اس کی قدر کی گئی اور اس کی خدمات کو سراہا گیا۔ وہ غازی مصطفےٰ کمال کے نظریوں کا حامی بن گیا۔ اور ترک قومیت کی ذہنی رہنمائی کی باگ ڈور سنبھال لی لیکن اس سب کے باوجود غازی سے اس کے تعلقات قریبی اور گہرے نہ ہو سکے۔

اِدھر برسوں سے گوکلپ کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے علاج کے لئے قسطنطنیہ آیا لیکن یہاں کے ڈاکٹر بھی اس کی کھوئی ہوئی صحت کا سراغ نہ لگا سکے۔ اپنی موت سے چند روز پہلے اسے مصطفےٰ کمال کا تار ملا کہ وہ علاج کے لئے یورپ چلا جائے اور خرچ کی پروا نہ کرے، وہ سب ادا ہو جائے گا، گوکلپ نے جواب میں لکھا کہ اس کے بعد اس کے بال بچوں کا خیال رکھا جائے اور اس کی کتاب "ترکوں کی تمدنی تاریخ" شائع کر دی جائے اس سے زیادہ وہ اور کسی چیز کا طلبگار نہیں ہے اور پھر ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ۴۸ یا ۴۹ سال کی عمر میں قسطنطنیہ میں اس کا انتقال ہو گیا، اس کی موت ایک قومی سانحہ تھا اس کا جنازہ بڑے تزک و احتشام سے نکالا گیا اور لاکھوں آدمیوں نے سوگ منایا۔ ترک پارلیمنٹ نے اس کی بیوہ اور لڑکیوں کے لئے پنشن مقرر کر دی اس لئے کہ اس نے خود ان کے لئے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔

مرزا غالب — ایک تعارف

جناب محمد ذاکر، استاد جامعہ کالج

ہو گا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

(۱)

اردو کے مشہور شاعر اور نثر نگار مرزا اسد اللہ بیگ خاں غالب ۱۷۹۷ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ وہ ایرانی النسل تھے اور اس پر ان کو بہت فخر تھا کہ اُن کا سلسلہ خاندانِ سلجوق سے ملتا ہے جس نے گیارہویں صدی عیسوی کے بعد وسط ایشیا کے ایک بڑے علاقے پر تقریباً تین سو سال تک حکومت کی تھی۔ خود ان کے قول کے مطابق ان کے دادا سمرقند سے ہندوستان آئے اور شاہ عالم اول بہادر شاہ اول (متوفی ۱۷۱۲ء) کی فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے والد (مرزا عبداللہ بیگ خاں) پہلے نواب آصف الدولہ والیٔ اودھ پھر نظام دکن اور آخر میں والیٔ الور کے ملازم ہوئے اور وہیں ۱۸۰۲ء میں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ چچا جنھوں نے ان کی سرپرستی کی پہلے مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد (آگرہ) کے صوبہ دار تھے مگر لارڈ لیک کی فوجوں کے خلاف ہتھیار ڈالنے پر انگریزوں نے خوش ہو کر اپنی طرف سے رسالدار بنا دیا اور ۱۸۰۶ء میں ان کے انتقال کے بعد متعلقین کی پنشن مقرر کر دی۔ اسی پنشن کے سلسلہ میں گورنر جنرل کی کاؤنسل میں اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لئے مرزا غالب کو ۱۸۲۶ء میں کلکتہ بھی جانا پڑا۔ پنشن کا یہ مقدمہ (چند وجوہ کی بنا پر) الجھتا گیا اور طول پکڑ گیا۔ قریباً

سولہ سال تک (۱۸۴۲ء تک) یہ چلتا رہا اور مرزا کو مسلسل ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس زمانے میں انھوں نے انگریز حاکموں کے قصیدے بھی لکھے اور ملکہ وکٹوریہ کو بھی ایک درخواست گورنر جنرل کے ذریعہ بھیجی مگر نتیجہ سوائے ناکامی کے اور کچھ نہ نکلا۔ اس مدت میں ان کو قرض لے لے کر گزارہ کرنا پڑا اور اُن پر ڈگریاں ہوئیں۔ قیام کلکتہ کا ان کے ذہن پر بہت اثر پڑا اور بلاشبہ یہ سفر ان کی زندگی میں اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مرزا کا لڑکپن کا زمانہ ننھیال (آگرہ) ہی میں بسر ہوا۔ وہیں مکتبوں میں تعلیم حاصل کی اور اپنے قول کے مطابق ایک نو مسلم ایرانی (ملا عبد الصمد) سے فارسی میں دستگاہ بہم پہنچائی نوجوانی میں رنگ رلیاں بھی منائیں اور خوب کھل کھیلے۔ تیرہ سال کی عمر میں دلّی کے مشہور خاندان میں شادی ہوئی اور وہ عموماً دلّی ہی میں رہنے لگے۔ ان کے خسر رئیس تھے اور شاعر بھی ان کو تصوف سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ ان کے ہاں شعر و سخن اور مذہب و تصوف کا چرچا رہتا تھا۔ دلّی کے عمائد اور فضلاء سے مرزا کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ کچھ سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے اور خود اپنی صلاحیت اور اصلاح پسند طبیعت کی وجہ سے مرزا نے اپنی اصلاح کی۔ عیش و عشرت اور لہو ولعب میں جو خود ان کے قول کے بموجب فسق و فجور تک پہنچ گئے تھے آہستہ آہستہ کمی ہو گئی مگر بدنامی سے وہ محفوظ نہ رہ سکے کیونکہ جُوا کھیلنے کے جُرم میں وہ ماخوذ ہوئے۔ ایک مرتبہ (۱۸۴۱ء) تو صرف جرمانہ دے کر چھٹکارا پایا مگر دوسری مرتبہ (۱۸۴۷ء) ان کو کچھ عرصے حوالات میں بھی رہنا پڑا۔

۱۸۵۰ء میں وہ قلعۂ معلّی سے باقاعدہ وابستہ ہوئے اور فارسی زبان میں خاندان تیموری کی تاریخ لکھنے کا کام ان کے سپرد ہوا۔ بعد میں یہ تاریخ آدم سے شروع کرنے کا حکم ہوا یہ کام ادھورا ہی رہا اور آدم سے ہمایوں بادشاہ تک ہی کا ذکر لکھا جا سکا۔ ۱۸۵۴ء میں قلعہ معلّی کے شہزادے اور بہادر شاہ ظفر ان سے اپنے کام پر اصلاح لینے لگے۔ غالباً اسی سال واجد علی شاہ نواب اودھ کی طرف سے بھی اُن کا وظیفہ مقرر ہوا۔ مگر یہ صورتِ حال زیادہ عرصے قائم نہیں رہی کیونکہ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کے انتقال، واجد علی شاہ کی معزولی اور

۱۸۵۷ء میں غدر اور بہادر شاہ ظفر کی رنگون میں نظر بندی کی وجہ سے مرزا کی آمدنی کے ذرائع بند ہو گئے اور انھوں نے گھر کا مال اسباب بیچ بیچ کر گزارہ کیا۔ نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور ان کے شاگرد ہو چکے تھے، وہی گاہ گاہ ان کی مدد کرتے رہے اور ۱۸۵۹ء میں انھوں نے باقاعدہ ماہانہ تنخواہ بھی مقرر کر دی۔ ۱۸۶۰ء میں وہ نواب صاحب کی دعوت پر رام پور بھی گئے اور بعد میں اسی سال انگریزوں سے ان کو پنشن کا کل روپیہ جو ۱۸۵۷ء سے نہیں ملا تھا، مل گیا۔ اور اسی دوران میں ان کا دربار و خلعت بھی جاری ہو گیا۔ ۱۸۶۵ء میں نواب مذکور کی وفات پر دوبارہ رام پور گئے۔ واپسی پر سفر میں کافی صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ ان کی صحت آہستہ آہستہ جواب دے رہی تھی۔ امراض کی شدت بڑھتی جاتی تھی ۱۸۶۹ء میں دماغ پر فالج گرا اور اسی میں ان کا انتقال ہوا۔

مرزا کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ فارسی دانی کے علاوہ علم عروض، نجوم اور تصوف میں بھی ان کا مطالعہ محدود نہیں تھا۔

(۲)

اس سے پہلے کہ ہم مرزا کی شاعری اور نثر نگاری پر غور کریں مناسب معلوم ہوتا ہے اگر ان کی سوانح کے ساتھ ان کے اخلاق و عادات اور خیالات کا ذکر کرتے چلیں۔ تمام سوانح نگار متفق ہیں کہ وہ دوستوں کے دوست تھے۔ ان کے دوست اور شاگرد ہر مذہب اور ہندوستان کے مختلف حصوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے خط کا جواب دینا وہ فرض سمجھتے تھے۔ شاگردوں کو اولاد کی جگہ سمجھتے تھے۔ ان کی آمدنی بہت کم تھی مگر ان کا ہاتھ ہمیشہ اونچا رہا۔ غریبوں اور محتاجوں کی اپنی بساط سے زیادہ مدد کرتے۔ حالی نے مرثیہ میں لکھا ہے ؎

نذرِ سائل تھی جان تک لیکن　　　درخورِ ہمت، اقتدار نہ تھا

ان کا حافظہ اچھا تھا۔ اکثر رات کو "عالم سرخوشی" میں فکر شعر کرتے اور صبح محض یادداشت سے سارے شعر لکھ لیتے۔ اپنے علم، زبان پر قدرت، بات میں بات پیدا کرنے کی لیاقت اور

فطری ظرافت کی وجہ سے ان کی تقریر بھی بہت لطف آمیز ہوتی۔ ان کے مزاج میں خودداری تھی ؎

خاکساروں سے خاکساری تھی سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا

امرا، اور عمائد شہر سے برابر والوں کی طرح ملنا، کلکتہ جاتے ہوئے (۱۸۲۷ء میں) لکھنؤ میں معتمد الدولہ آغا میر وزیر اعظم سلطنتِ اودھ سے صرف اسی بات پر ملاقات سے انکار کر دینا کہ آغا میر مرزا کے استقبال میں کھڑے ہونے کو تیار نہ تھے، اور انگریزوں کے وظیفہ خوار ہونے کے باوجود دلّی کالج کی ملازمت صرف اس وجہ سے قبول نہ کرنا (۱۸۴۲ء) کہ دروازے تک ان کا استقبال کرنے کو کوئی نہ آیا۔ ان کی خودداری پر دلالت کرتے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ خودداری اور تہذیبِ نفس کی اعلیٰ ترین منزل وہ ہے جہاں انسان دوسرے کی خودداری کا پاس بھی اسی طرح کرے جس طرح اپنی خودداری کا۔ ان کے ایک دوست غدر کی وجہ سے بگڑ گئے تھے۔ چھینٹ کا فرغل پہنے مرزا سے ملنے آئے۔ مرزا نے ان کو ہمیشہ بیش قیمت کپڑوں میں دیکھا تھا۔ دل بھر آیا۔ پوچھا "یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔" انھوں نے کہا "یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے اگر آپ کو پسند ہے تو حاضر ہے۔" مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیسا پہن کر جائیں گے؟" پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چُغہ اتار کر انھیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی سے وہ چُغہ ان کی نذر کیا۔ یہ تھا دوستوں کا ادب اور ان کی خودداری اور تہذیبِ نفس کا حال۔

زمانہ مرزا کا سازگار نہ تھا کیونکہ ان کو ان کے حوصلہ کے مطابق کبھی صلہ نہیں ملا۔ شاگردوں کا وہ ہر طرح خیال رکھتے۔ ان کی مصیبت اور پریشانی سن کر وہ بے چین

ہو جاتے۔ دردمندی، دل سوزی اور انسان دوستی کے جذبات ان کے خطوں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ کس شدت سے ایک خط میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

"قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسّی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار میرے اور معاملاتِ کلام و کمال سے قطعِ نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔"

حالی نے ٹھیک ہی تو لکھا ہے ؎

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا   معنئ لفظِ آدمیت تھا

(۳)

مرزا غالب کی نجی زندگی کے حال کے بعد اگر اس دور کی عام سیاسی و سماجی حالت کا ذکر کرتے چلیں تو نامناسب نہ ہوگا۔ اس سے ان کے ذہن کو سمجھنے میں اور مدد ملے گی۔ ہندوستانی تاریخ کے طالب علم مغل حکومت کے زوال کے آثار شاہجہاں کے وارث اور جانشینوں کی باہمی لڑائیوں میں دیکھتے ہیں۔ ہر چند اورنگ زیب عالمگیر نے تخت کے دوسرے دعوے داروں پر فتح پائی مگر دکن میں اس کی روز افزوں مصروفیات نے سلطنت کے استحکام کا موقع نہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد سے ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے افراتفری کا دور شروع ہو گیا۔ بیرونی حملہ آوروں اور اندرونی خلفشار کی وجہ سے سلطنت مغلیہ یقیناً طوفان زدہ جہاز کی مثال بنتی جا رہی تھی۔ مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی (تخت نشینی [illegible]) نابینا کیا جانا ۱۷۸۸ء،

انتقال ۱۸۰۶ء] تک آتے آتے مغل حکومت مغل حکومت نہ رہی تھی اس کے صوبے آزاد ہو گئے تھے۔ دلی کی رونق اُجڑ چکی تھی، اس کی دولت لُٹ چکی تھی، اس کے بادشاہ کو نابینا کر دیا گیا تھا اور وہ اپنے محدود اقتدار کے لئے بھی دوسروں کا محتاج تھا۔ اگلے پچاس سال میں یعنی ۱۸۵۷ء تک آتے آتے یہ بات سب پر ظاہر ہوتی جاتی تھی کہ اب شمع بے نور ہو کر بجھا چاہتی ہے۔ اور بالآخر یہی ہوا۔ ایک بساط اُلٹ گئی اور دوسری بساط بچھائی گئی۔

سماجی تہذیب سیاسی تاریخ کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ اس کے بننے اور بگڑنے میں نسبتاً زیادہ وقت لگتا ہے۔ ہر چند مغل حکومت کا شیرازہ بکھر رہا تھا مگر وہ تہذیب جس نے مغلوں کے دورِ حکومت اور ان کی سرپرستی میں واضح شکل پائی اور ہندو مسلم گنگا جمنی تہذیب کا نام پایا اپنی جگہ مستحکم تھی اور تہذیبی ادارے استواری سے اپنا کام کر رہے تھے۔ اسی وجہ سے اس دَور کے ادب و شعر میں، جو بلاشبہ تہذیب کے آئینہ دار ہیں، سیاسی انحطاط کے رنگ کے باوجود توانائی ملتی ہے۔ شمالی ہندوستان میں مغل حکومت کے زوال اور خاتمہ (۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک) اور اردو شاعری کے سنہرے دَور —— سودا اور میر سے آتش، مومن، ذوق اور غالب تک —— کا ایک ہی زمانہ ہے۔ یہ زمانہ عبارت ہے ایک تہذیب کے آہوں اور آنسوؤں میں ڈوبنے سے اور دوسری کے ہزار تبسم و شادمانی کے ساتھ طلوع ہونے سے۔ مرزا غالب نے جب آنکھ کھولی مغلوں کی شام کی تاریکی بڑھتی جاتی تھی۔ شمع بجھ رہی تھی اور خورشید کی بشارت دی جا رہی تھی۔ پرانے عقیدے بے جان ہو رہے تھے مگر نئے دیوتاؤں نے جنم نہیں لیا تھا۔ قوموں کی تاریخ میں ایسے ہی تصادم یا ایسے ہی عبوری دَور میں ایک شخصیت پیدا ہو جاتی ہے جو بقول شخصے "بیک وقت رونقِ یادگارِ محفل بھی ہوتی ہے اور نقیبِ سحر بھی" جس کے پرانے پن میں نیاپن آشکار ہوتا ہے۔ جس کی نظر میں ماضی کی بہاروں کی خواب آور کیفیت کی سرشاری بھی ہوتی ہے اور مہرِ نیم روز کی تمازت کی طرح جھلسا دینے والے حال کی گرمی اور خشکی بھی۔ جو بڑھتی ہوئی ظلمتوں میں شراروں کی

لپک اور کرنوں کی چمک کا پتہ دیتی ہے۔ مرزا غالب کے کلام میں یا یوسی اور بے دلی کے جذبات کے ساتھ امید اور زندہ دلی کے جذبات کی آمیزش کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ایسے ہی ذوق کی پیداوار تھے۔ ایسا ذہن جو ایک طرف خاندانی اور آبائی پیشہ ــــ یعنی سپہگری ــــ پر ناز کرے، جو اپنے بزرگوں کے شکستہ تیروں کو اپنے قلم سے اور اپنے قلم کو علم سے تعبیر کرے اور اس کے ساتھ ہی اپنے مشاہدہ پر اپنی رائے قائم کرکے بے باکانہ اس کا اظہار بھی کر دے یقیناً قدامت اور جدت کی آمیزش اور جرأت کا پتہ دیتا ہے۔ اُن کا ذہن روایات کا اسیر ہو جانا نہیں چاہتا تھا۔ متعدد شعر اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ فرسودہ خیالات اور حد بندیوں پر رک نہیں جاتے۔ ان کے نزدیک جزوِ ایمان وہ ہے جو ملتوں کے مٹنے کے بعد باقی رہ جاتا ہے ؎

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

بزرگوں کی قائم کردہ ہر راہ صراطِ مستقیم نہیں ہے۔ خضر کی بزرگی مُسلّم مگر

؎ لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

؎ در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم
کعبہ دیدم نقشِ پائے رہروان نامیدمش

اجتہاد ــــ ذہنی اور عملی ــــ ان کی افتادِ طبع کی خصوصیت ہے۔ وہ شاعر اور ادیب تھے اسی لئے ان کا اجتہادِ عملی ادبی کارناموں میں نظر آتا ہے۔ اجتہاد، روشِ عام سے ہٹ کر چلنا ــــ یہی وہ جذبہ ہے جس کی وجہ سے قدم قدم پر ساتھ والوں سے دشمنی مول لینی پڑتی ہے یہی وہ کٹھن منزل ہے جہاں دار و رسن کی آزمائش ہوتی ہے اور جہاں سے ہر ایسی شخصیت کو گزرنا پڑتا ہے جو مقررہ ضابطوں کی تنگ نائے سے نکلنا چاہتی ہے۔ ادیب اور شاعر کے لئے یہی وہ مقام ہے جہاں پرانے الفاظ، رموز اور علامات اس کے خیالات کا ساتھ دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ ان کو نئے معنی پہنانے پر مجبور ہوتا ہے اور نئے

رمز اور علامتیں تلاش کرتا ہے۔ اسی کوشش میں اس پر کبھی کبھی دقت پسندی کا الزام بھی لگتا ہے۔ ناچار دوسروں کو خاموش کرنے کے لئے وہ کہہ اٹھتا ہے ؎

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور اپنے آپ کو عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ سمجھ لیتا ہے اور کبھی درد بھرے لہجہ میں اپنی خودی کا بھرپور احساس لئے شکایت کرتا ہے ؎

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے　　لوحِ زمیں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

یہی وہ منزل ہوتی ہے جس کا اندازہ کچھ اس سے ہوتا ہے کہ اس کا سوزِ غمہائے نہانی آتشِ دوزخ کی گرمی سے بڑھ جاتا ہے۔ جوہرِ اندیشہ کی وجہ سے وحشت کا خیال آتے ہی صحرا جل اٹھتا ہے عالمِ تقریر کا مدعا عنقا بن جاتا ہے اور آگہی کے دامِ شنیدن کی گرفت میں آنے سے انکار کر دیتا ہے پرِ عنقا پر رنگِ رفتہ سے تصویریں کھینچی معلوم ہوتی ہیں شاعر اپنے آپ کو عدم سے پرے ایسی منزل پر سمجھتا ہے جہاں اس کی آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل جاتا ہے کبھی کبھی وہ خامشی اختیار کر لیتا ہے اور اس میں خوش ہوتا ہے کہ یہ خامشی اخفائے حال کی ضامن بنتی ہے۔ اس کو اپنے مضامین غیب سے آتے معلوم ہوتے ہیں اور صریرِ خامہ نوائے سروش بن جاتا ہے۔ (دل کا) آبگینہ تندیٔ صہبا یعنی گرمیٔ اندیشہ سے پگھلنے لگتا ہے اور الفاظ گنجینۂ معنی کا طلسم بن جاتے ہیں۔ غالب کے کلام میں ان کی شخصیت کی طرح جدت پسندی آشکارا ہے۔ ان کے کلام کا موضوع دیگر عظیم شاعروں اور غزل گویوں کی طرح انسانی جذبات ہیں جن کی امتیازی صفت ان کی کثرت اور تنوع ہے۔ انسان طرفہ مجموعہ ہے عناصرِ متضاد کا۔ غالباً یہی تضاد اس کے جذبات کے تنوع کی علت ہے۔ اس کے جذبات شعلہ و شبنم کے حسین و رنگین صحیفے ہیں جن کی آفرینش سے آسودگی یا پھر شکست تک رنگارنگ فضائیں و مترنم تصویریں بنتی اور بگڑتی نظر آتی ہیں۔ ایک کی آسودگی یا شکست صد ہزار کی آفرینش کا سامان اپنے جلو میں لئے ہوتی ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غالب انسان کو اس کی تمام ارضی خو بو کے ساتھ سب مخلوق سے برتر سمجھتے ہیں۔ وہ اس کو آسمانی مخلوق نہیں سمجھتے۔ نہ ہی اس حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ وہ انسان ہیں اور انسان ہونا مضمر ہے انسان بننے کی مسلسل کوشش میں۔ مایوسی اور ناکامی میں ہوش و حواس قائم رکھنے میں۔ نظر کی ہمہ گیری میں۔ وہ آنکھوں میں آنسوؤں کے باوجود اپنے آپ پر — زندگی پر — ہنس سکتے ہیں ؎

سوزش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

ان کی ہنسی سے شعور و آگہی کی اس منزل کا پتہ چلتا ہے جس سے انسانیت عبارت ہے۔ انسانیت ہی ان کے ہاں سب سے بڑی قدر ہے۔ انسانیت عبارت ہے تہذیب سے حالتِ موجودہ سے ہمیشہ آگے آگے رہنے سے، مخصوص جذبات و کیفیات کے بہاؤ میں خس و خاشاک کی طرح بہ جانے سے نہیں بلکہ متحرک لہر کی پیشوائی کرنے والے حباب سے، غارت و تباہ ہو جانے کے احساس سے مغلوب ہو جانے سے نہیں بلکہ اس میں حسرتِ تعمیر کے بنائے رکھنے سے۔ غالب سخت سے سخت واقعہ سے بے چین ہو اٹھتے ہیں مگر تاب نہ لا سکتے ہیں۔ وہ قلزمِ خون کی شناوری کرنے پر قادر ہیں، آنکھیں موند کر مستی و بے خودی و بے حسی سے نہیں بلکہ کمالِ ہوشمندی و ہوشیاری سے۔ وہ اپنے آپ کو موجِ خوں کے سپرد نہیں کر دیتے بلکہ طوفانِ حوادث کو مکتب سمجھتے ہیں۔

؎ اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

راہ میں وہ رہنما کے نہیں بلکہ سینہ سپری کے قائل ہیں ؎

؎ بوادیٔ کہ در آں خضر را عصا خفتہ است
بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتہ است

ان کی نظر ہمہ گیر ہے۔ وہ کہتے ہیں بہار اگر ہے بھی تو حنائے پائے خزاں ہے اور کثافت دراصل لطافت کا ایک رخ ہی تو ہے۔ ہر نفی اثبات پر دلالت کرتی ہے۔ ان کی نظر اثبات کو ڈھونڈ لیتی ہے۔ ناصح کی شدت کے مقابلہ میں یہ احساس کہ ہمارا بھی تو اپنے گریباں پر زور چلتا ہے اثبات یا تعمیری رنگ ہی کا تو پتہ دیتا ہے ؎

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

ان اشعار میں شکست نہیں بلکہ تعمیری پہلو ابھرتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تھکن اور آرام کا نہیں بلکہ سینہ سپری کا پتہ دیتا ہے یہ ایسے انسان کا تصور سامنے لاتا ہے جو واقعی ماتم خانہ کی شمع برق سے روشن کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اور اسی کی وہ تلقین بھی کرتا ہے یہی وہ صالح، توانا اور تہذیب کا جذبہ ہے جو انسان کو مایوسیوں کی آغوش سے نکال کر امید سے بلکہ خود انسانیت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ سازِ ہستی کا ایک دن فنا ہو جانا مسلّم مگر نغمہ ہائے غم کو غنیمت سمجھنے کی تلقین کرنا انسانیت کی پہچان ہے۔

(۴)

یوں تو غالب نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر سب سے زیادہ ان کا دل غزل میں ــــ جو یقیناً داخلی صنفِ سخن ہے ــــ لگتا تھا۔ شمالی ہندوستان میں غالب سے پہلے اردو غزل اپنی تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ غالب نے پرانے مضامین کو جدت سے پیش کرکے تازہ کر دیا۔ اچھوتے مضامین پیش کئے غزل کو وسعت بخشی اور زبان کو آگے بڑھایا۔ ان کے خیال میں حسنِ فروغِ شمعِ سخن کے لئے پہلے دلِ گداختہ کا پیدا کرنا ضروری ہے اور یہ دلِ گداختگی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ان کے خیال میں حُسن کا معیار سادگی میں پُرکاری [اور بے خودی میں ہشیاری] ہے۔ ان کے ابتدائی کلام کے کچھ حصہ کو چھوڑ کر ــــ جب وہ دقت پسندی اور مشکل گوئی کی طرف مائل تھے۔ یہی سادگی اور پُرکاری ان کے حسنِ بیان کی خصوصیت ہے۔

(۱) رشک کے فرسودہ تصور میں تازگی کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) ؎ تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا　اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

(۲) ؎ دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

(۳) ؎ گذرا اسدؔ مسرتِ پیغام یار سے　قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

(۴) ؎ قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

(۵) ؎ چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

(۶) ؎ جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو　اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

(۷) نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو　یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

(۲) غمِ محبت کے ساتھ غمِ روزگار کا ذکر

؎ تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں　تیرے علاوہ اور بھی ہم پر ستم ہوئے

؎ کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب　دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

؎ قید میں بھی ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد　ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریٔ زنجیر بھی تھا

؎ غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

؎ تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

(۳) 'غم' کیا ہے؟ استعارہ ملاحظہ ہو:

؎ رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا　جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

(۴) محبوب کا تغافل یا تجاہلِ عارفانہ اور اس کی ستم ظریفی اور شوخی

؎ بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک　ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

؎ میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی — سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

؎ ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی — آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

؎ جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا — کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

(۵) دوستوں کی غم خواری

؎ کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

؎ کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر — اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

؎ ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

(۶) نگاہِ محبوب

؎ بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

؎ وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

؎ لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

(۷) محبوب کی پارسائی

؎ نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا
بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

(۸) قیس و مجنوں کا ذکر

؎ ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسد — مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

؎ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

؎ شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

(۹) شوخیِ کلام

؎ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

؎ چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

؎ آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

؎ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

؎ کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

؎ دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

؎ ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

؎ ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے اگر حوریں بھی واں ہو گئیں

؎ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

؎ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

؎ کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(۱۰) محبوب کا سراپا اور خرامِ ناز

؎ جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

؎ ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں — زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا ـــ ۵
تیوری چڑھی ہوئی ہے جو اندر نقاب کے — ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں ـــ ۵
دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا — موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی ـــ ۵
جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں ـــ ۵
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق — لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر ـــ ۵
چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی ـــ ۵

(۵)

مرزا غالب نے باقاعدہ اردو نثر نہیں لکھی۔ ایک ادبی مبحث، یہ تین مختصر رسالوں کے علاوہ کچھ تقریظیں اور دیباچے اور خطوط ان کی یادگار ہیں۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ان کے دوست اور شاگرد ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ مرزا ان سے باقاعدہ خط و کتابت کرتے۔ مرزا کے ان خطوط کی تاریخی اعتبار کے علاوہ ادبی اعتبار سے بھی بہت اہمیت ہے۔ ان کے زمانے تک شمالی ہندوستان میں اردو نثر میں کچھ داستانیں موجود تھیں یا قرآنِ کریم کے ترجمے اور مذہبی رسالے۔ کلکتہ کے قیام میں فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات نے کہاں تک ان کے اسلوبِ نگارش کو متاثر کیا اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جو کچھ خطوط نویسی اردو میں غالب سے پہلے ہوتی تھی اس میں رنگین اور مقفیٰ عبارت کا خیال رکھا جاتا۔ غالب کے ہاں بھی یہ ڈھنگ بالکل ناپید نہیں مگر غالب نے خطوط نگاری میں نئی طرز کو رواج دیا۔ یہ طرز عبارت بھی القاب آداب کی سادگی سے اور بناوٹ اور تصنع سے پاک ہے۔ وہ بڑے بڑے القاب و آداب کی بجائے خط کو "میاں"، "برخوردار"، "بندہ پرور"، "مہاراج"، "بھائی صاحب" وغیرہ سے شروع کرتے ہیں۔ کبھی کبھی پرانی طرز کے آداب بھی لکھتے ہیں۔ خط میں مقفیٰ عبارت زیادہ تر وہاں استعمال کرتے ہیں جہاں مزاح پیدا کرنا ہو۔ وہ خط کو مکالمہ بنا دیتے ہیں اور کبھی کبھی مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے غائب تصور کر لیتے ہیں۔ مگر ان ظاہری

خوبیوں کے علاوہ جس چیز نے ان کے خطوط کو ہر دلعزیز بنایا ہے وہ ہے ان کی رنگا رنگ شخصیت کی چھاپ، ان کی شوخی اور ظرافت۔ اُن کی رند مشربی، آزادہ روی اور خودداری۔ ان کی شاعری کی طرح یہاں بھی ان کی فطری خوش مزاجی کارفرما نظر آتی ہے اور یہی خوش مزاجی ان کے صاحب طرز ہونے کی ضامن ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کے ہاں بات میں بات پیدا کرنا، اسلوب کا بانکپن یا خوش مزاجی برائے سخن سازی نہیں ہے بلکہ ان کی شخصیت کا ایک پرتو ہے۔ ان کے خط پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اہتمام سے خلوت میں خط نہ لکھتے ہوں بلکہ ایسی جگہ جہاں آنے جانے والوں سے وہ علیک سلیک بھی کرتے جاتے ہوں اور خط بھی لکھتے جاتے ہوں۔

مرزا علاؤالدین خاں کو اپنی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ استعارہ سے کام لیا ہے:

"سنو عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لمن الملک الیوم اور پھر آپ جواب دیتا ہے۔ للّٰہ الواحد القہار۔ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانہ سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار۔ مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں۔ سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں

میں چھوٹ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ۔ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا، بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔"

مرزا علاؤ الدین خاں ہی کو برسات کے حال میں لکھتے ہیں خط کشیدہ جملے سے دل کا حال معلوم ہوتا ہے:

"میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محلسرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھے گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں...... دیوان خانے کا حال محلسرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے......"

میر مہدی کو لکھتے ہیں:

"اہاہا میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو۔ یہ رامپور ہے۔ دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا......"

دردمندی اور بے چارگی کی کیفیت کا بیان ملاحظہ ہو۔ خط تفتہ کے نام ہے:

"صاحب تمہارا خط آیا......... بس اب تم سکندر آباد میں رہے کہیں اور کیوں جاؤ گے۔ بنک گھر کا روپیہ اٹھا چکے ہو اب کہاں سے کھاؤ گے۔ میاں نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے نہ تمہارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ برابر چلا جاتا ہے جو ہوتا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے۔ کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا

جائے ...... مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید۔ نہ رنجور ہوں نہ تندرست۔ نہ خوش ہوں نہ ناخوش۔ نہ مُردہ ہوں نہ زندہ۔ جیے جاتا ہوں۔ باتیں کیے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت۔ جو تقریر ہے برسبیلِ حکایت ہے۔ بارے جہاں رہو جس طرح ہو ہر ہفتہ میں ایک بار خط لکھا کرو ......"

بے ساختگی اور خلوص ملاحظہ ہو۔ خط تفتہ کے نام ہے:

"کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی۔ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا ...... یہ کیا سبب دس دس بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو۔ نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو ......"

غلام ربانی تاباںؔ

ہندوستان کے محبوب رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کی اچانک موت سے متاثر ہوکر جناب غلام ربانی تاباںؔ نے چند شعر کہے ہیں جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

پھول رنجیدہ ، صبا غمگیں، چمن افسردہ ہے
آج تاباںؔ انجمن کی انجمن افسردہ ہے

ایک دیوانہ تھا وہ بھی اپنے رستے چل دیا
سوگ میں ڈوبا ہے صحرا اور بن افسردہ ہے

جس کے دم سے وادیِ گنگ و جمن تھی پُر بہار
اس کے غم میں وادیِ گنگ و جمن افسردہ ہے

دفعتاً دیر و حرم پر ایک حسرت چھا گئی
شیخ کی آنکھوں میں نم ہے، برہمن افسردہ ہے

صدرِ محفل اٹھ کے اس محفل کو سونا کر گیا
غم برستا ہے فضاؤں سے، وطن افسردہ ہے

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

جناب وحید احمد مسعود

آپ فاروقی النسب تھے۔ بمقام نانوتہ سنہ ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۳ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۷ھ (۱۸۹۷ء) میں بمقام مکہ معظمہ وصال ہوا۔ سنہ ۱۲۲۸ھ (۱۸۲۸ء) میں بعمر سولہ سال مولانا مملوک علی نانوتوی کی وساطت سے شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ شیخ محمد قلندر و شیخ الٰہی بخش کاندھلوی کی صحبت میں بھی رہے اور شیخ نصیر الدین حنفی دہلوی سے سلسلہ نقشبندیہ کی خلافت حاصل کی۔ مولانا روم کی مثنوی سے ذوق رکھتے تھے۔ اسی کی تعلیم کے لئے حضرت میانجی نور محمد جھنجھانویؒ کی خدمت میں پہنچے اور صابریہ خاندان میں ان سے بیعت کر کے اسی خاندان کے ہو رہے اور خلافت پائی۔ اب بادیہ پیمائی کا شوق ہوا اور عرصہ تک جنگلوں کی سیر کی۔ حج کرنے کے لئے سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں گئے اور سنہ ۱۲۶۲ھ میں واپس آئے۔ شاہ محمد اسحٰقؒ کا انتقال ہو جانے پر ان کی وصیت کے مطابق ولی اللٰہی تحریک کی قیادت ان کے سپرد (۱۸۴۶ء) ہوئی۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں انہوں نے اپنے خلفاء اور ولی اللٰہی جماعت کے ساتھ انگریزوں کے خلاف شاملی میں مورچہ بنا کر سخت مقابلہ کیا۔ مگر انگریزوں کا غلبہ ہو جانے کے بعد ان سب کے وارنٹ نکلے۔ مولانا قاسم دیوبند میں روپوش ہو گئے، مولوی رشید احمد صاحب گرفتار ہوئے۔ حاجی صاحب خود مولوی محمد یعقوب اور عبد الغنی کی معیت میں ہمراہ سندھ خفیہ طور پر مکہ معظمہ کو ہجرت کر گئے۔ امن ہو جانے پر مولوی رشید احمد صاحب نے عام اعلان معافی کے بعد رہائی پا کر اور مولانا قاسم سے مل کر حسب ہدایت حاجی صاحب اپنی تحریک کی پھر تجدید کی، بعد کو ان سب نے مکہ معظمہ میں مجتمع ہو کر بہ تقلید شاہ ولی اللہ تبلیغ کے لئے ایک مدرسہ کے اجراء کی تجویز طے کی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۶۷ء میں سید عابد حسین نے

دارالعلوم کی دیوبند میں بنا ڈالی، اس کا مہتمم مولانا قاسم (متوفی ۱۸۷۹ء) کو اور نائب مولوی رشید احمد (متوفی ۱۹۰۵ء) کو بنایا۔ معاونین میں مولانا مہتاب علی اور ان کے بھائی ذوالفقار علی کے اسماء گرامی سر فہرست ہیں۔ ابتداء میں چار طالب علم مہیا ہوئے تھے جن میں سب سے پہلے طالب علم ذوالفقار علی صاحب کے صاحبزادے تھے۔ جو بعد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کہلائے۔ حاجی صاحب حجاز سے ان سب امور کے متعلق اپنے خلفاء کو ہدایت کرتے رہتے تھے۔ اپنی کتاب ضیاء القلوب میں وصایا کے تحت لکھا ہے کہ :- "جو شخص اس فقیر سے محبت و عقیدت رکھتا ہے۔ وہ مولوی رشید احمد اور مولوی محمد قاسم کو، جو علوم ظاہری و باطنی کے تمام کمالات کے جامع ہیں، فقیر کے بجائے بلکہ مجھ سے بلند تر درجہ پر سمجھے۔ اگرچہ بظاہر معاملہ برعکس ہوگیا ہے کہ وہ میری جگہ اور میں ان کی جگہ ہو گیا۔ ان کی صحبت کو غنیمت سمجھیں کہ ان جیسے حضرات اس زمانہ میں نایاب ہیں اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہوتے رہیں۔" حاجی صاحب کی تصانیف قابل دید اور سبق آموز ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) ضیاء القلوب۔ اذکار۔ اشغال اور مراقبوں کی تفصیل ہے۔

(۲) فیصلہ ہفت مسئلہ۔ متنازعہ مسائل کے متعلق ہے اور تحریر کیا ہے کہ مناظرہ مقصود نہیں۔

(۳) ارشاد مرشد۔ ہر وقت اور ہر موقع کے وظائف ہیں۔

(۴) مثنوی تحفۃ العشاق۔ بی بی تحفہ کا قصہ منظوم ہے۔

(۵) رسالۂ وحدت الوجود

(۶) غذائے روح۔ منظوم نصائح ہیں۔

(۷) گلزار معرفت۔ نعتیہ کلام ہے۔

(۸) رسالہ درد غمناک۔

(۹) جہاد اکبر منظوم

(۱۰) نالۂ امداد غریب (منظوم مناجاتیں ہیں)۔

معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۶ء کے بعد وہابیوں نے موقع پاکر اپنے عقائد کی علانیہ تبلیغ شروع کردی تھی۔ اختلافی مسائل پر حاجی صاحب سے استفسار کیا گیا تھا تو اس لیے کہ خواص کا وقت اور عوام کا دین بچے اور رفع فساد ہو" فیصلہ ہفت مسئلہ" لکھ کر بھیج دیا تھا۔ اس میں مولود شریف۔ عرس۔ سماع۔ ندائے غیر اللہ۔ جماعت ثانیہ۔ امکان نظیر۔ اور امکان کذب پر مدلل بحث کی ہے اور نہایت تدبر کے ساتھ ہر پہلو کو اجاگر کر کے معترضین کا منہ بند کیا ہے۔ ۱۲۹۹ھ ۱۸۷۹ء میں رسالہ وحدت الوجود لکھنے اور شائع کرنے کی یوں ضرورت پڑی کہ مولوی عبدالعزیز نے لکھا تھا کہ "مولوی قاسم مرحوم اہل وجود کو ملحد و زندیق کہتے تھے۔ اور ان کے مرید و شاگرد مولوی محمد احسن صاحب بھی ایسا ہی کہتے ہیں اور آپ کے اقوال ضیاء القلوب کو ماؤل سمجھتے ہیں اور اس کے متعلق اپنی تاویل کے سامنے کسی اور کی نہیں مانتے۔ اور مولوی رشید احمد صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب بھی اسی مسلک پر ہیں۔ اگرچہ ان کو آپ سے اجازت ہے اور مشرب چشت رکھتے ہیں۔ اور مشایخ چشت کے خلاف وہ بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہیں" جواب میں فرماتے ہیں کہ "مسئلہ وحدت الوجود حق و صحیح ہے۔ مجھ سے محبت و عقیدت رکھنے والے اور خواجگان چشت کے پیرو اس کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وحدت الوجود کے متعلق یہ ہے کہ دین راہ رفتنی است و گفتنی نیست۔ یہ ہادی بھی ہے اور مضل بھی۔ جو مقام نفس سے مرتبۂ قلب میں نہیں پہنچے ہیں ان کو قیل و قال کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کو سکوت ہی مناسب ہے"۔ اسی طرح ضیاء القلوب کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ ہمارے سلسلہ کے دستور ہیں۔ ان کو غلط نہیں کہا جا سکتا یہ جواب تیغ دو دم ہے۔ ایک طرف مستفسر کا منہ بند کرتا ہے اور دوسری طرف معترضین کی قلعی کھولتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاجی صاحب اور ان کے خلفاء میں ان عقائد کے متعلق اختلاف واقع ہو گیا تھا۔ اس حقیقت کو دیکھ کر اگر اہل طریقت یہ دریافت کریں کہ ایسی حالت میں حاجی صاحب نے ان خلفاء سے سند کیوں واپس نہیں لی۔ تو اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اتحاد بین المسلمین کی خاطر

حضرت امام حسین نے اسلام کا اتباع کیا۔ یہ سوال کہ خلفاء کو اختلاف کی جرأت
جس کی وجہ سے بیعت ہی رد ہو جاتی ہے تو یہ ایک لمبی داستان ہے جس کا لب لباب

انوں اور ملک کی ابتری دیکھ کر شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۲ء تا ۱۷۶۲ء)
است خداداد سے ایک اسکیم ہندوستان کی سیاسی۔ مذہبی۔ اخلاقی۔ معاشرتی،
ی بہتری کے لئے بنائی تھی۔ اس کی تبلیغ ان کی حیات میں ہوئی جس کی وجہ سے
ف ہو گئی اور بیداری و حرکت کے آثار شروع ہو گئے۔ ان کے بعد ان کے
ے شاہ عبد العزیز (متوفی ۱۸۲۴ء) نے نہایت قابلیت سے اس کو چلایا۔
، اصلاح رسومات اور فن سپہ گری کے اجراء کا کام حضرت سید احمد بریلوی
جی اور شاہ اسمٰعیل کے سپرد کیا تھا۔ ان کی نگرانی میں ان صاحبان نے فرائض کو
دا کیا اور غیر ملکی اثرات کو خارج کرنے کے لئے جہاد کی طیاری شروع کی لیکن
ب کے انتقال سے پہلے اور بعد ان حضرات سے دو فرو گذاشتیں وجود میں
ں ۱۸۲۴ء میں حجاز پہنچ کر انھوں نے نجدی عقائد قبول کر لئے۔ شاہ اسمٰعیل
ر مقلد ہونے کا اعلان فرماتے تھے مگر مولانا عبد الحیٔ شاہ ولی اللہ کے عقائد پر
اور نجدیوں کے خیالات کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان دونوں میں سے ایک یقیناً
ر تھا۔ دوسری یہ تھی کہ انگریزوں کے جھانسے میں آکر انھوں نے غیر ملکیوں کی
ے اپنے جہاد کا رخ ملکی سکھوں کی طرف پھیر دیا۔ بدیں وجہ کہ کمزور دشمن کو پہلے
یائے اور یہ نہ سمجھے کہ انگریز اپنے دشمنوں کو لڑا کر اپنا اثر قائم کرنا چاہتا ہے
یں بغرض جہاد جبکہ نوشہرہ کی طرف کوچ کیا تھا۔ اثنائے راہ میں کسی مسلمان نے
یعفر تھا یتیسری گذارش کی تھی کہ اتنی دور سکھوں سے جہاد کرنا بعید از عقل ہے
۔ گھر کے گھر میں ہی انگریزوں سے نبٹ لیجئے تو ارشاد کیا تھا کہ "ملک گیری

لانا مودودی فرماتے ہیں کہ انھوں نے نفس تصوف کو خارج نہیں کیا۔ یہ سب سے بڑی غلطی تھی۔

ہمارا مقصود نہیں۔ انگریز دشمن سہی مگر فرائض مذہبی کی ادائیگی میں مانع نہیں ہے اور مسلمانوں پر ظلم نہیں کرتا ہے[1]۔ لیکن یہ سکھ بہت زیاد نقصان کرتے ہیں"۔ واقعہ یہ تھا کہ مسلمان انگریز دشمنی ہی کی وجہ سے ساتھ دے رہا تھا۔ اگر یہ خبر ہوتی کہ یہ نجدی عقائد رکھتے ہیں تو ان کا ساتھ چھوڑ دیتا۔ بمقام پنجتار مولوی شاہ اسمٰعیل نے اپنے وعظ میں افغانی علماء کو عدم وجوب تقلید کی دعوت دی تھی تو وہ سب بدل ہو گئے تھے۔ جس پر سید صاحب نے شاہ صاحب کو تنبیہہ فرمائی کہ یہ وقت تفرقہ ڈالنے کا نہیں ہے۔ اس کے بعد یہاں سے مدد کے لئے مولوی محب علی مجاہدین کا قافلہ لے کر گئے تھے۔ انھیں عقائد کا انھیں بھی نجدی سمجھ کر درآبیوں نے راستہ میں مزاحمت کی اور نہیں جانے دیا۔ واپس آکر مولوی صاحب نے اس جہاد کی لغویت کا اعلان کیا تو لوگوں نے مدد بھیجنا بند کردی تھی۔ پھر بڑی مشکل سے شاہ محمد اسحٰق رح (متوفی ۱۸۴۶ء) نے سمجھا بجھا کر مدد کے سلسلہ کو جاری کروایا تھا تاکہ اصل مقصد میں کامیابی ہو۔ یہ جہاد ولی اللّٰہی تحریک کا جز تھا مگر فراست کی کمی کی وجہ سے مقصد میں ناکامی ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۳۱ء میں سید احمد صاحب کی شہادت یا غیبوبیت کے بعد ان میں دو جماعتیں ہو گئیں۔ دیوبند والوں نے تقلید شخصی کو جائز رکھا اور فروعی امور میں اپنا علیحدہ فرقہ نہیں بنایا۔ مگر امرتسر والوں نے اپنی جماعت اہلِ حدیث علیحدہ بنالی۔ حضرت سید احمد کی وفات کے متعلق بھی دو خیال وجود میں آگئے۔ مولانا ولایت علی صادق پوری کی جماعت اور اہل سرحد کا خیال تھا کہ غائب ہو گئے ہیں اور سکھوں سے جہاد کے لئے پھر نمودار ہوں گے دوسرے کہتے تھے کہ شہادت فرما گئے۔ دیوبند والے غالباً مذبذبین میں سے تھے۔ مولوی رشید احمد غیبوبیت کو "اکمن" سمجھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز رح کے بعد اس تحریک کے امام ان کے نواسے شاہ محمد اسحٰق بنائے گئے تھے۔ انھوں نے اس تحریک کو چلانے میں پوری قوت صرف کردی۔ ان کا خیال تھا کہ جہاد انگریزوں سے کرنا چاہیئے اور اس غرض کے لئے بلاتفریق

---

[1] آج کل بھی یہی تصور موجود ہے اور یہ خاصہ ہے احساس کمتری کا۔

مذہب وملت، اتحاد کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔

انبیاء میں حاجی امداد اللہ صاحب اس لئے کہ ان کے دادا پیر حضرت عبدالرحیم فاطمیؒ نے سید احمد صاحب کے ساتھ جہاد میں شرکت کی تھی اور شہید ہوئے تھے سید احمد صاحب اور ان کی جماعت کے ہم خیال وطرفدار تھے، مگر اپنے استاد شاہ محمد اسحاقؒ سے اس تحریک کی حقیقت سمجھ کر شاہ صاحب کے پیرو ہو گئے تھے اور ان کی تقلید میں انگریزوں سے جہاد کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان دونوں نے عیسویت پر عقیدہ رکھنے والی جماعت کو ہر چند ہموار کرنے کی کوشش کی کہ بجائے سکھوں کے انگریزوں سے جہاد کیا جائے مگر مولوی ولایت علی کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔ اس طرح اصل تحریک میں بھی تفرقہ پڑ گیا اور دو گروہ بن گئے۔ اب شاہ صاحب مولوی مملوک علی صاحب کو اپنا جانشین مقرر کرکے ۱۸۴۱ء میں ممالک اسلامی میں اپنی تحریک کی اشاعت کرنے کی غرض سے مکہ شریف کو ہجرت کر گئے۔ اسی دوران میں مشورہ کرنے کی غرض سے حاجی صاحب بھی پہلی مرتبہ حجاز گئے تھے۔ جب مولوی مملوک علی صاحب خاطر خواہ کام نہ کر سکے تو ۱۸۴۶ء میں اپنے انتقال سے پہلے یہ خدمت حاجی صاحب کے سپرد کی اور وہی ولی اللّٰہی تحریک کے امام بنا دئے گئے۔

اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی زمام حکومت لارڈ ایمرسٹ کے ہاتھ میں تھی۔ اور لارڈ میٹکاف دہلی کے ریزیڈنٹ تھے۔ انھوں نے اکبر شاہ اور شاہی خاندان کو اپنی خاک پا بنا رکھا تھا۔ اور عیسائی علماء منظر عام پر مسلمانوں اور اسلام کی برملا توہین کیا کرتے تھے۔ لارڈ النبرا صاحب گورنر جنرل ہوئے تو انھوں نے مسلمانوں کی مخالفت پر اہل ہنود کو آمادہ کر دیا۔ اس کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے ریاستوں اور جاگیرداروں کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اندریں حالات مسلمانوں کی ابتری انتہا پر پہنچ گئی۔ جب ۱۸۵۷ء میں غدر پڑا تو حاجی امداد اللہ صاحب نے شاملی میں مورچہ قائم کرکے انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دئے بعد غدر حاجی صاحب اور ان کے رفقاء کے وارنٹ نکلے۔ اور تحریک بند ہو گئی۔ جب ظلم و

تعدی کے بعد انگریزوں نے عام معافی کا اعلان کیا تو مولوی رشید احمد صاحب کو قید سے رہائی ملی۔ اب حج کر کے آکر کے انھوں نے ولی اللہی تحریک کی پھر تجدید کی اور مقدمات سے فارغ ہو کر وہابیوں نے بھی اپنے عقائد کی تبلیغ شروع کر دی۔ حاجی صاحب مکہ معظمہ سے ہدایت فرماتے رہتے تھے اور مولوی قاسم اور مولوی رشید احمد برابر تعمیل کرتے تھے۔ غدر کے دس برس بعد ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم کی بنیاد دیوبند میں رکھی گئی۔ ظاہر ہے کہ غدر کے بعد انگریز کی قوت بڑھ گئی تھی۔ مولوی قاسم کو گوناگوں دشواریوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ تحریک اور مدرسہ کی توسیع ان کا مقصد تھی۔ بربنائے اصول انگریزوں کی مخالفت کرنا تھی اس لئے مدرسے کے لئے انگریز سے مدد لینے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اور اپنی قوت بڑھانے کی یہی صورت تھی کہ وہابیت میں جوش کر لیا جائے۔

سرسید اور مولانا قاسم دونوں مولوی مملوک علی کے شاگرد رہ چکے تھے۔ سرسید کو بھی قومی و ملکی بہبودی کا خیال پیدا ہوا۔ سرسید نے بلا تخصیص قوم و ملت مرادآباد میں فارسی مدرسہ کا اجراء ۱۸۵۹ء میں کیا۔ وہابی پارٹی کو انگریز کے مظالم سے بچانے کی کوشش میں انھوں نے اپنے آپ کو نیم وہابی مشہور کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ خود حنفی اور سلسلہ مجددیہ میں مرید تھے۔ پھر ۱۸۶۴ء میں انھوں نے غازی پور میں انگریزی مدرسہ کھولا۔ سرسید مسلمانوں کی بہبودی کی کوشش انگریز کے زیرِ سایہ کرنا چاہتے تھے اور بانیانِ دارالعلوم دیوبند انگریزوں کی موافقت سے گریز کرتے تھے۔ تعلقات دیرینہ کی بنا پر مولوی قاسم سے سرسید نے متحد ہونے کی کوشش کی، دونوں کی خط و کتابت تصفیۃ العقائد کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اصولی اختلاف رکھنے کی وجہ سے مولانا قاسم اتحاد پر راضی نہیں ہوئے۔ جس طرح بربنائے عقیدت مولوی ولایت علی نے شاہ محمد اسحٰق کی درخواست اتحاد کو مسترد کر دیا تھا اسی طرح اپنے نظریئے کے اصول پر مولانا قاسم نے سرسید کی درخواست اتحاد کو نامنظور فرما دیا۔ اس انکار و تردید کو عقیدہ کی پختگی اور اصول کی پابندی کی وجہ سے خوبی و استقلال سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر دوسری نوعیت سے فراست کا نقدان بھی خیال کیا

جاسکتا ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر اللہ کی مرضی اور بندے کی مرضی میں امتیاز و فرق کا فیصلہ
ہو جاتا ہے ۔ آگے چل کر قیام بنارس میں سرسید کو تجربہ ہوا کہ تعلیم یافتہ اہل ہنود مسلمانوں سے
بربنائے تعصب دشمنی پر آمادہ ہیں تو انھوں نے ان سے دوستی کے خیال کو ترک کر دیا پھر
انھوں نے مسلمانوں کے لئے انگریزی کا اسکول علی گڑھ میں جاری کیا جو دو برس بعد ۱۸۷۶ء
میں ترقی کر کے ایم اے او کالج کی شکل اختیار کر گیا ۔ اس طرح دیوبند کے دارالعلوم اور علی گڑھ
کے مسلم کالج میں ایک قسم کی رقابت سی ہو گئی ۔ اور انگریز کو تیدر کا سا بانٹ کرنے کا بہترین
موقع مل گیا ۔ بعد میں اہل ہنود نے کانگرس کی بنا ڈالی تو سرسید نے اس کے مقابلہ میں مسلم
ایجوکیشنل کانفرنس کی ایجاد کی ۔ اہل دیوبند اس کانفرنس کے مقابلہ میں معنوی طور پر کانگرس
کے موئید بن گئے ۔ اہل دیوبند نے اس موقع پر وہابی پارٹی سے ساز باز کر لیا ۔ اور اتحاد
کی خاطر ان کے معتقدات کے بھی روادار ہو گئے ۔ ان کے اس عمل کو حالات کے ماتحت حق
بجانب قرار دیا جا سکتا ہے مگر حاجی صاحب ان حالات سے دور مکہ معظمہ میں تشریف فرما
تھے لہذا وہ اپنے عقائد پر قائم رہے اور ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ۔ جب اس
اتحاد اور تبدیلی عقائد کے متعلق ۱۸۷۰ء کے بعد ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے مخالفت کو
اصل تحریک میں رخنہ کے اندیشے کی وجہ سے مناسب نہیں سمجھا لیکن رسالہ وحدت الوجود
میں حسن تدبیر اور اخلاقی جرأت سے صاف اشارہ کر دیا کہ جو مقام نفس سے مرتبۂ قلب
میں نہیں پہنچے ہیں ۔ انہیں سکوت اختیار کرنا چاہیئے ۔ اس سے پہلے فیصلہ ہفت مسئلہ
میں وہابی عقائد کی تردید بھی کر چکے تھے اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلفا، حاجی صاحب سے
آزاد ہو گئے اور ان کے وصال تک تعلقات نراجی رہے اسی لئے حاجی صاحب کا بعد میں
ذکر کم ہے ۔ اب کہا جا سکتا ہے کہ ولی اللہی تحریک کے بارور نہ ہونے کے وجوہات اس قسم
کے ہیں ۔ اس تحریک کے سرپرست و قائد توازن قائم نہ رکھ سکے اور مادیت کی جانب
زیادہ جھک گئے ۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا منشا و مقصد یہ تھا کہ روحانیت و مادیت میں توازن
قائم رکھا جائے ۔ بغیر اس کے ان کی تحریک یک طرفہ سیاست بن جاتی ہے یا ترک دنیا کا

باعث ہو جاتی ہے۔ مگر یہ توازن بغیر فراست و وسیع القلبی کے اور بغیر زیر وزبر کا لحاظ کئے ہوئے محض پابندئ اصول سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ وسیع النظری یہ تھی کہ وہابیوں سے اتحاد کر لیا اور تنگ نظری یہ تھی کہ سرسید سے تعلق نہیں رکھا اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پر کانگریس کو ترجیح دی۔ اب عقل کام نہیں کرتی کہ ان دونوں اصولوں کو وسیع النظری سمجھا جائے یا تنگ نظری۔ انھیں چاہیئے تھا کہ شاہ ولی اللہ رحؒ کی طرح راہ اوسط اختیار کرنے یا تعلیم صابری کے مطابق نجدی پارٹی، سرسید، انگریز اور ہندو کو ان کی جگہ رکھ کر ساتھ لے کر چلتے لیکن بایں ہمہ ان خلفاء کے کارنامے اپنی نظیر نہیں رکھتے اور تاریخ عالم میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اب ان سے ان کے صابری ہونے کی وجہ سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے صابری تعلیم کو اپنی جدوجہد میں کس قدر ملحوظ رکھا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ان کے یہاں صابری تعلیم برائے بیعت اور ضمنی ہو کر رہ گئی اور اسے پس پشت ڈال دیا لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی نیت پاک تھی۔ یہ عابد وزاہد تھے۔ اعلیٰ پایہ کے مولوی تھے۔ سیاست میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور مسلمانوں کو ذلت وخواری سے بچانے کے لئے انھوں نے صداقت کے ساتھ تن من دھن کی بازی لگا دی تھی جس کی شہادت آج زبانِ حال سے دارالعلوم دیوبند دے رہا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

امام حسینؑ کا پیغام

محترمہ صالحہ عابد حسین

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کی یاد ساری دنیا میں منائی جاتی ہے۔ ہر مذہب و ملت ہر ملک و قوم کے لوگ اپنے اپنے انداز میں اس مظلوم شہید کو یاد کرتے اور اس کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں جس نے حق کی راہ میں جان دے کر اپنا نام انسانیت کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں ثبت کر دیا۔

مگر کیوں دنیا اس واقعہ سے اتنی متاثر ہے کہ بھلائے نہیں بھولتی؟ کیوں مظلومی اور حق پرستی کی تاریخ میں ان کا کارنامہ لاثانی سمجھا جاتا ہے؟ بظاہر ایسے واقعات دنیا میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ محمد مصطفےٰؐ کی جانشینی کے دو دعوے دار ہیں جن میں سے ایک جس کے پاس طاقت و اقتدار نہ تھا دوسرے فریق کے ہاتھوں مارا جاتا ہے اور دوسرا تختِ خلافت پر قابض ہو جاتا ہے لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ مقتول و شہید حیاتِ جاوید پاتا ہے اور فاتح کا نام نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ شہادت حسین کی ہوتی ہے خاتمہ یزید کا۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے   اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

لیکن یہ راز اس واقعہ کی نوعیت میں نہیں اس مقصد میں پنہاں ہے جس کے لئے یہ لڑائی لڑی گئی تھی اور اس انداز میں ہے جس طرح لڑی گئی تھی۔ اور فوج کے سردار حسینؑ کی شخصیت کی مضبوطی سیرت کی بلندی اور عمل و ارادے کی قوت میں یہ راز چھپا ہوا ہے۔

حسین کی یہ لڑائی کسی ذاتی مخالفت، انتقام یا ذاتی مفاد کی خاطر نہیں تھی بلکہ اخلاق، شرافت اور مساوات کے اصولوں کو بچانے اور عمل کی آزادی کو سنوارنے کی خاطر حسینؑ نے نہ صرف اپنی جان کی بازی لگائی بلکہ اپنی جان سے زیادہ پیاروں کو بھی اس راہ میں قربان کیا اور

حق کی حمایت میں ہر دکھ، ہر غم، دل کی پوری آمادگی، روح کی پوری طمانیت کے ساتھ جھیلا۔

ان کی زندگی اور موت دونوں نے انسان کو سکھایا کہ ظلم و ناانصافی کے سامنے سر جھکانا اور باطل کی قوتوں سے ہار ماننا شرفِ انسانی کے خلاف اور اس راہ میں جان دینا انسانیت کی معراج ہے عشقِ الٰہی میں سرشار، سچا جاں باز مجاہد تن تنہا باطل کی قوتوں سے ٹکرا کر ان کو کچل سکتا ہے۔

چڑھتی ہے جب عشق کی سان پہ تیغ خودی ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

اور حسینؑ اور یزید کی لڑائی تھی کس بات پر؟ کیا اس پر کہ یزید عرب کی حکومت پر قابض ہو گیا تھا اور حسین چاہتے تھے کہ حکومت ان کے پاس آجائے؟ کیا وہ حکومت و اقتدار کے بھوکے تھے؟ تاریخ شاہد ہے کہ حسینؑ اور ان کے بزرگوں نے کبھی اس کی خاطر جنگ نہیں کی۔ ہاں جب کبھی ان کو سچائی کے روشن چہرے پر کالک لگتی نظر آئی، جب ایمان کی اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی سلامتی خطرے میں دیکھی تو حق کو قائم کرنے کی خاطر جان کی بازی ضرور لگائی گئی ہے۔ حسینؑ نے بھی اپنے نانا محمد مصطفیٰؐ اور بابا علی مرتضیٰؑ سے یہی ورثہ پایا تھا۔ اگر یزید صرف شام و عرب کی حکومت پر قبضہ کرنے پر اکتفا کرتا اور خلیفۂ رسول یعنی محمد مصطفیٰؐ کا جانشین ہونے کا دعویٰ نہ کرتا تو حسین اس سے جنگ نہ کرتے۔ مگر وہاں تو ایک ایسے شخص نے جس کا ظاہر اور باطن سیاہ، جس کا ہر قول و فعل اسلام کی تعلیم کے سراسر منافی تھا، خلیفۂ رسول ہونے کا دعویٰ کیا جس کا مطلب تھا کہ اس کا ہر قول، ہر فعل سراسر اسلام کے مطابق سمجھا جائے اور اسے مسلمانوں کا ہادی اور رہبر مان لیا جائے پھر اتنا ہی نہیں کہ وہ عام لوگوں سے اپنی بیعت لے کر خاموش ہو جاتا بلکہ اس نے چاہا کہ وہ نواسۂ رسولؐ حسینؑ سے بھی اپنے ہاتھ پر بیعت لے یعنی ان سے یہ منوا لے کہ یزید کا ہر حکم، ہر فعل، ہر کام اسلام کے مطابق ہے۔ یہ بڑی گہری اور ہولناک سازش تھی جس کا مقصد اسلام کی تعلیم کو مٹا، اس کی روح کو فنا اور اس کے چہرے کو مسخ کر دینا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت بھی اور آئندہ بھی دنیا کہتی کہ جب حسینؑ نے جن کے گھر سے اسلام نکلا تھا جو اسلام کی روح کو جاننے والے

اور سچے مومن و مسلمان تھے یزید کو (معاذ اللہ) اپنا رہنما و خلیفہ مان لیا تو اس کا ہر فعل جائز ہے۔

اب حسینؑ کے سامنے دو راستے تھے۔ یزید کی بیعت کر کے چپ چاپ اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کریں اور اسلام کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ یا یزید کی بیعت سے انکار کر کے بڑی طاقت سے ٹکر لیں اور اس راہ میں جو کچھ بھی پیش آئے پامردی سے اس کا مقابلہ کریں۔ ظاہر ہے کہ محمدؐ کا نواسہ، علیؑ کا بیٹا، فاطمہؑ کا لختِ جگر صرف دوسرا راستہ اختیار کر سکتا تھا۔

یہ دیکھ کر کہ حسینؑ بیعت پر تیار نہیں یزیدی طاقتیں حسینؑ کو مٹانے پر تُل گئیں کہ باطل کی قوتوں نے ہمیشہ اپنی کثرت و طاقت کے نشہ میں یہ سمجھا ہے کہ وہ حق کو کچل اور مٹا سکتی ہیں۔ یزید اور اس کے ساتھی سمجھتے تھے کہ جب تک حسینؑ زندہ ہیں وہ اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

حسینؑ بہت دن سے ہوا کا رخ دیکھ رہے تھے اور اپنا راستہ متعین کر چکے تھے حاکم مدینہ سے بیعت کا انکار کرنے کے بعد آپ نے مدینہ چھوڑ دیا اور مکہ تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں بھی یزیدی موجود تھے کہ عین حج کے موقع پر حسینؑ کو مار ڈالیں اور کسی بے گناہ پر الزام رکھ دیں۔ لیکن حسینؑ اس طرح جان دینا چاہتے تھے کہ ان کا مقصد آفتاب کی طرح روشن ہو کر دنیا کے سامنے آجائے کہ یزید کیسا تھا اور کیا چاہتا تھا اور حسینؑ نے کیوں یزید کی بیعت سے انکار کیا تھا۔

چنانچہ امام حسینؑ نے حج کا ارادہ ترک کیا اور کوفہ کی سمت روانہ ہوئے جہاں سے آپ کے پاس خط پر خط آ رہے تھے کہ آیئے اور ہماری رہنمائی کیجیے۔ لیکن حسینؑ کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی یزیدی قوتوں کے آگے بزدل کوفی سرنگوں ہو گئے۔ راستے ہی میں یزید کی فوجوں نے حسینؑ کو گھیر لیا۔ اب حسینؑ نے سمجھ لیا کہ ان کی آخری منزل آگئی اور صحرائے کربلا میں آپ نے اپنے خیمے نصب کر دیئے۔

یزید کی فوجیں آ کر دور دور تک دریا کے کنارے اترتی رہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ

کم سے کم تیس ہزار کی فوج تھی جو حسینؑ سے مقابلہ کے لئے کربلا کے میدان میں جمع ہوئی تھی اور جس کے پاس وقت کے بہترین جنگ کے ہتھیار تھے، سامانِ رسد تھا، دریا پر قبضہ تھا دوسری طرف حسینؑ کی فوج کتنی تھی؟ کل بہتر آدمی۔ جن میں چند تجربہ کار بوڑھے تھے، چند جوان تھے کچھ نوعمر لڑکے تھے، اور ہاں ایک شیرخوار چھ مہینے کی جان علی اصغر بھی اس فوج کا ایک سپاہی تھا جس نے اپنی جان دے کر حسینؑ کی فتح کا جھنڈا اور زیادہ بلند کر دیا۔ اور حسین کے خاندان کی عورتیں بہنیں، بیٹیاں، بیویاں، بھاوجیں تھیں جنھوں نے حسین پر اپنے لال نچھاور کر کے اور ان کی شہادت کے مقصد کو دنیا کے سامنے پیش کر کے تاریخ کربلا میں بڑا اہم حصہ ادا کیا ہے۔

ماہِ محرم کا تیسرا دن تھا جب حسین کربلا کے میدان میں پہنچے تھے۔ نویں محرم تک حسین اور یزید کے افسروں میں بات چیت ہوتی رہی حسین نے ہر ممکن کوشش کی کہ خونریزی نہ ہو اور یزیدی فوجیں راہِ راست پر آجائیں۔ صلح کی مختلف شرطیں سامنے رکھیں لیکن وہاں تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ "یزید کی بیعت یا حسین کا سر"۔ بات چیت ہوتی رہی۔ یزیدی فوجیں آتی رہیں۔ سختیاں بڑھتی رہیں۔ باہر آنے جانے کے راستوں پر ناکہ بندی کر دی گئی۔ دریائے فرات پر پہرے بٹھا دیئے گئے۔ شاید فوجوں کی کثرت سے ڈر جائیں۔ شاید بھوک اور پیاس کی شدت حسین کو مجبور کر دے اور وہ یزید کی بیعت پر آمادہ ہو جائیں۔ مگر وہ کیا جانتے تھے کہ حسین کا ہاتھ راہِ حق میں جہاد کرتے کرتے شل ہو سکتا ہے مگر یزید جیسے دشمن انسان و انسانیت کی بیعت کے لئے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ حسین کا دل بچوں کی بھوک پیاس، کڑیل جوانوں کی موت سہار سکتا ہے مگر اسلام کی بربادی نہیں دیکھ سکتا۔ ان کا سر راہِ خدا میں کٹ سکتا ہے ظالم کے سامنے جھک نہیں سکتا......

چنانچہ ہر کوشش ناکام ہوئی اور دشمن اپنی بات پر اڑا رہا یا یزید کی بیعت

کیجیے یا لڑائی،

اور آخر دس محرم کی شب آ پہنچی جس کی صبح یہ معرکۂ حق و باطل برپا ہوا حسینؑ نے یہ رات عبادت الٰہی میں گذاری اور ان کے ساتھیوں نے حوصلہ صبر و استقلال کی دعائیں مانگنے اور ہزاروں سے لڑنے کی تیاری میں یہ شب بسر کی۔ عورتوں نے اپنے اپنے بیٹوں کو بھلانے میں رات بتائی کہ کل حسینؑ خدا کی راہ میں جہاد کریں گے ان کے ساتھ اس راستے میں جان دینا دنیا کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ اس رات یہ یادگار واقعہ بھی پیش آیا جو تاریخ میں بے مثال کہا جا سکتا ہے۔ یعنی جب حسینؑ نے اپنے ساتھیوں سے یہ اصرار کیا کہ وہ چاہیں تو ان کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں کہ کل حسین نے ان کا ساتھ دیا اس کا مارا جانا یقینی ہے تو حسین کے ساتھیوں میں سے ہر ایک کی زبان سے یہی صدا نکلی کہ اے حسین اگر ستر جانیں بھی ہوتیں تو حق کی حمایت اور آپ کی نصرت پر نچھاور کر دی جاتیں۔ آپ کے ساتھ حق کی راہ میں جان دینا ہزار زندگیوں سے بہتر ہے۔

اور یہ صرف انھوں نے زبان ہی سے نہیں کہا، کر کے دکھایا۔ صبح عاشور نمازیوں پر تیروں کی بوچھار کے ساتھ نمودار ہوئی۔ جیسے جیسے یہ ہولناک صبح دوپہر میں بدل رہی تھی حسین کے لشکر کے سپاہی کم ہوتے جا رہے تھے۔ دوستوں اور جاں نثاروں نے امام کی حمایت میں ہزاروں کے لشکر سے بے جگری سے لڑ کر جام شہادت پیا۔ چار جوان بھائیوں نے حسینؑ کی نصرت میں داد شجاعت دے کر شہادت پائی۔ نوجوان بھتیجوں اور بھانجوں نے جانیں گنوائیں۔ کڑیل جوان بیٹا باپ کی حمایت میں لڑتا ہوا سینے پر نیزے کی انی کھا کر سدھارا۔

اور اب دوپہر ڈھل رہی ہے حسین صحرا میں تن تنہا کھڑے ہیں۔ سامنے صحرائے کربلا میں پیاروں کی لاشیں یوں بکھری ہیں جیسے آسمان پر تارے چھٹکے ہوں۔ خیمہ میں صرف ایک بیمار و بے ہوش جوان بیٹا اور شیر خوار بچہ رہ گیا ہے۔ ایک ایک کر کے سب ساتھ چھوڑ چکے حسین کے دل پر ستر داغ ہیں۔ جسم زخموں سے چور اور لباس پیاروں کے

ہو سے سرخ ہے ۔ مگر لب پر آہ نہیں، دل میں شکوہ نہیں، عزم میں لغزش نہیں، امتحان کی آخری منزل آگئی ۔ ہر پیاری چیز راہِ خدا میں نچھاور کرچکے اب اس راستے میں آخری پونجی اپنا سر فدا کرنا باقی ہے ۔ اور حسینؑ تیار ہو رہے ہیں کہ گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کی فوج کے سامنے جائیں ۔ اور ایک بار آخری بار، پھر انہیں حق کا راستہ دکھانے کا فرض ادا کرکے انسانیت کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے کی کوشش میں جان دے دیں۔

مگر نہیں ابھی تو اس آخری منزل سے پہلے حسین کو ایک اور قربانی پیش کرنی ہے۔ اپنے صبر و رضا کی نادر مثال دنیا کو دکھانی ہے جس نے حسین کو حسین بنایا۔ وہ قربانی جس پر دنیا ہمیشہ آنسو بہاتی رہے گی ۔ اپنے چھ مہینے کے بچے علی اصغر کی قربانی۔

علی اصغر کی شہادت کا واقعہ جس کو سن کر پتھر کا کلیجہ پانی ہو جاتا ہے کس نے نہیں سنا؟ پیاس سے نیم جاں بچے کو حسین اس کی ماں کی گود سے یہ کہہ کر لائے کہ شاید دشمن ترس کھاکر پانی پلا دے ۔ آپ نے بچے کو ہاتھوں پر بلند کرکے فرمایا کہ یہ بچہ معصوم ہے۔ یہ تو بیعت کے معنی بھی نہیں جانتا، بھوک پیاس اور صدموں نے اس کی ماں کا دودھ خشک کر دیا ہے۔ اگر تم میں انسانیت کی ذرا سی رمق بھی باقی ہے تو اسے چند قطرے پانی پلا دو۔

لیکن حسین کے سوال کا جواب وہ تیر تھا جو بیک وقت باپ کا بازو بچہ کا گلا اور ماں کا کلیجہ چھید کر انسانیت کے ماتھے پر داغ لگا گیا۔ بچہ باپ کے ہاتھوں پر تڑپ کر ختم ہو گیا۔ مگر صابر و شاکر حسینؑ کے منہ سے اس وقت بھی نکلا تو یہ نکلا کہ "رضاً بقضائہ وتسلیماً لِاَمرہٖ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ یہ کہہ کر تلوار سے ایک ننھی سی قبر کھودی، بچہ کو سپردِ خاک کیا ۔ اور پھر عرب کے سب سے بڑے بہادر کا جری بیٹا ہزاروں کی فوج کے سامنے تلوار سنبھال کر ڈٹ گیا کہ ظلم و ناانصافی کی قوتوں کے سامنے ہارنے سے ان سے لڑ کر ختم ہو جانا ہی انسان کا فرض اور انسانیت کی معراج ہے! ورتاریخ

بتاتی ہے کہ اسی اکیلے مجاہد نے آخری دم تک مقابلہ کیا یہاں تک کہ تیروں، تلواروں نیزوں کے زخموں سے چور چور ہو کر گھوڑے کی پشت سے صحرائے کربلا کی گرم جھلستی ریت پر گر پڑا اور اپنا سر۔ وہ سر جس کو دنیا کی ساری طاقتیں، باطل کی ساری قوتیں مل کر بھی نہ جھکا سکی تھیں سجدے میں جھکا دیا۔ اور اسی حالت میں دشمنوں نے آپ کا سر مبارک تن سے جدا کر دیا۔

سر داد و نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

حق کی حفاظت کی خاطر ہر دکھ، ہر ستم جھیلنا، ہر پیاری سے پیاری شے اس راہ میں قربان کر دینا اور ظلم و ستم کی قوتوں کے سامنے ہرگز ہرگز سر نہ جھکانا، آخری سانس تک بدی اور ظلم کی قوتوں کا مقابلہ کرکے سچائی کا علم بلند کرنا۔ یہی حسین کا لافانی پیام ہے جو ہمیشہ ہمیشہ دنیا میں گونجتا رہے گا۔ حسینؑ نے دنیا کو سکھایا ہے کہ ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

اب کیا ہوگا!

جناب محمد خلیق صدیقی

(پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات سے متاثر ہو کر یہ نظم کہی گئی)

سرو خاموش، فضا تنگ، ہر اک پھول اداس
عالم اک دیدۂ حیراں ہے کہ اب کیا ہوگا

پائے افلاک نے اک پھول مسل ڈالا ہے
منفعل گردشِ دوراں ہے کہ اب کیا ہوگا

اب کہاں نور کو مل پائے گا پیراہن شمع
روشنی سر بگریباں ہے کہ اب کیا ہوگا

اب گلابوں میں بھی باقی نہ رہا ذوقِ نمو
کھل کے ہر پھول پشیماں ہے کہ اب کیا ہوگا

کون اب ہوگا "حریف مئے مرد افگنِ عشق"
ساقیِ میکدہ حیراں ہے کہ اب کیا ہوگا

دفعتاً آئی یہ آواز کہ اے قلب حزیں
یونہی آباد جہانِ گزراں رہتا ہے

خونِ دل ہی سے تو سینچتا ہے تمنا کا چمن
نخلِ امید اسی طرح جواں رہتا ہے

کہیں انساں، کہیں نغمہ، کہیں رنگینیِ گل
جلوۂ شوق بصد رنگ عیاں رہتا ہے

کہیں صدیوں میں کوئی برق چمک جاتی ہے
جس کی گرمی سے ہر اک قلب تپاں رہتا ہے

رہنما صرف دکھا دیتے ہیں راہ منزل
آگے خود قافلۂ شوق رواں رہتا ہے



طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی　　　مطبوعہ: یونین پرنٹنگ پریس دہلی

JAMIA
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

یہ کتاب اُس تاریخ کو جو سب سے آخیر میں ڈالی گئی ہے

واپس کرنی ہے، ورنہ پانچ پیسے روزانہ کے حساب سے

ہرجانہ ادا کرنا ہوگا

28.6.77		